# مجلہ عثمانیہ


محمد مصلح الدین صدیقی ام اے (آخری)

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو

نائب مدیر

میر حمایت علیخاں ام اے (آخری)

# مجلۂ عثمانیہ

جلد ۲۰ شمارہ ۱ و ۲

طلباء جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

محمد مصلح الدین صدیقی ام۔اے (آخری)

نائب مدیر حصۂ اردو

میر حمایت علی خاں ام۔اے (آخری)

# مجلس انتظامی

## سنہ ۱۳۵۷ف



## صدر

عالیجناب ڈاکٹر ولی محمد صاحب ایم۔ اے (پنجاب) بی۔ اے (کنٹب) پی ایچ۔ ڈی (گوٹن گن) آئی۔ ای۔ ایس معین معتمد جامعہ

## مشیر حصّہ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پرنسپل دار العلوم کالج

## مشیر حصّہ انگریزی

مسٹر ایم۔ ایس دور سکوامی بی۔ اے (آکسن) ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی (مدراس) صدر شعبہ انگریزی جامعہ عثمانیہ

## خازن اعزازی

مولوی لطیف احمد صاحب فاروقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی (عثمانیہ) ریڈر شعبہ فارسی

## معتمد اعزازی مجلس انتظامی

محمد مصلح الدین صدیقی صاحب ایم۔ اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصّہ اردو۔

## اراکین

مسٹر اے۔ کے چٹرجی مدیر حصّہ انگریزی ●● مسٹر افتخار احمد صدیقی صاحب بی ایس سی (آخری) نائب مدیر حصّہ انگریزی

میر حمایت علیخان صاحب ایم۔ اے (آخری) نائب مدیر حصّہ اردو

# اطلاع

تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔

خریداری اور دیگر امور کے لئے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔

چندہ کی تمام رقمیں خازن اعزازی مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کی جائیں۔

# چندہ

| | روپے |
|---|---|
| ۱۔ موجودہ طلبہ جامعہ عثمانیہ سے | للعہ |
| ۲۔ طلباء قدیم و اساتذہ جامعہ عثمانیہ سے | صہ ″ |
| ۳۔ عام خریداروں سے | لے ″ |
| فی شمارہ | عہ ″ |

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہوں گے اور بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی۔

۱۔ بذریعۂ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنے کلدار۔ ۱۲ار سکہ عثمانیہ۔

۲۔ بذریعۂ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کے وی۔پی کے اخراجات ۱۴ار کلدار ۱۶ر سکہ عثمانیہ۔

۳۔ بذریعۂ بک پوسٹ ۹ر آنے کلدار ۱۶ر سکہ عثمانیہ۔

# فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

## جلد ۲۰ شمارہ ۱ و ۲

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس مغل پورہ
حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# سخنے چند

جامعہ نے اپنی زندگی کی ۲۹ منزلیں طے کیں اور ۳۰ ویں منزل میں قدم رکھ چکی ہے جس گرامی نام سے اس جامعہ کو موسوم ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کی تاسیس میں جو جذبہ کارفرما تھا آج ان دونوں امور پر جتنی زیادہ توجہ کی ضرورت ہے شاید ہی کبھی تھی سُلطانُ العلوم حضرت اقدس و اعلیٰ نے قیام جامعہ کے منشور کو شرف منظوری بخشتے ہوئے ملک کے نونہالوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اور دکن کی سرزمین کو علم کی منور شعاعوں سے مالامال کرنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر اس سلطنت ابدمدت کے لئے ہونہار اور وفادار ان مملکت و ملت پیدا کرنے کی جس روح تاسیس کے ساتھ اس جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا آج وہ عثمانین سے متقاضی ہے کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے قدم اٹھائیں اور اپنے جمود کو دور کریں۔ صفوں میں تھوڑی سی بے ترتیبی بھی انہیں چند لمحوں میں وہ نقصان پہنچا سکتی ہے جو شاید سالہا سال کے اس تعمیری کام کی نفی کا باعث ہو۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام نے سرزمین دکن میں علوم و فنون کو زندہ کیا اور حیدرآبادی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا۔ دکن کے چپہ چپہ پر علم کی شمع جلا دی۔ جامعہ کے ماحول نے اس ذیلی براعظم کی جامعات کو شرمندہ کیا ہے اور یہاں کا طرز تعلیم دوسروں کے لئے باعث تقلید بنا ہے اور بنا رہے گا۔

ہمارا یہ سال پریشان کن سیاسی مسائل کی وجہ سے بحرانی رہا ہے اور ہم نے طالب علمی کے یہ چھ سات مہینے انتہائی انتشار کے عالم میں گذارے ہیں جس کی وجہ سے حصول تعلیم کے دوران میں ہمیں خاطر خواہ سکون نصیب نہیں ہوا۔ مملکت حیدرآباد کے مسائل نہ صرف قائدین قوم کے لئے باعث پریشانی رہے بلکہ طالب علموں پر بھی بڑی حد تک اثرانداز ہوئے اور یہ بے چینی کیوں نہ پیدا ہوتی جب کہ ہمارے وطن کی آزادی اور اس کی سیاسی وحدت کے خطرہ میں پڑ جانے کا

اندیشہ تھا۔ طالب علم اگر ایک طرف تعلیم کے حصول میں منہمک رہ کر نظری طور پر سیاسی مسائل کا مطالعہ کرتا ہے تو دوسری طرف جب ملک کی بقاء اور ہم وطنوں کے مفاد کا سوال ہوتا ہے تو وہ میدان عمل میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتا اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی پوری صلاحیتوں اور توانائیوں کے ساتھ تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ طالب علم کے جوش اور جذبے سے بیجا فائدہ اٹھانا سراسر سیاسی استحصال ہے۔

قاضی محمد حسین مرحوم سابق نائب معین امیر جامعہ نے بار بار اپنی تقریروں میں اس بات کا اعلان کیا تھا کہ

"اے حیدرآباد تجھے بلند ہونا ہے اور جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کے ہاتھوں بلند ہونا ہے"

حیدرآباد عظیم تر ہوگا اور ہر جہتی ترقی کرے گا تو زیادہ تر جامعہ عثمانیہ کے طیلسانین ہی کی جد و جہد اور سعی پیہم سے کرے گا۔ حیدرآباد کی وحدت اور اس کی آزادی کے بقاء کے ذمہ دار بڑی حد تک جامعہ کے سپوت ہیں اس لحاظ سے ہم پر بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ہمیں حصول تعلیم کے دوران میں ان ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے دیانتداری، خلوص، ہمدردی، نیک نیتی اور سب سے بڑھ کر خوف خدا کے ساتھ ہمیں کام کرنا ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ علم کا مقصد انسانیت اور شائستگی پیدا کرنا ہے جب ہمیں بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہے تو ہمیں چاہیئے کہ تنگ نظری، کوتاہ بینی، باہمی تعصب و نفرت اور سب سے بڑھ کر فرقہ واریت کے زہر کو اپنے دماغوں سے نکال دیں۔ اس وقت حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ملک میں ہمارا روایتی امن و اماں، ہم آہنگی، باہمی میل ملاپ، آپسی میل جول اور اتفاق و اتحاد برقرار رہے اور ہماری حیدرآبادی تہذیب جو سالہا سال کی یادگار ہے، قائم رہے۔ خدا کے فضل سے ابتک دوسرے اقطاع ہند کے مقابلہ میں حیدرآباد امن و اماں کا مرکز رہا ہے اور یہاں کا امن و اماں اور ہر جہتی ترقی دوسروں کے لئے قابل رشک ہے۔ حیدرآباد کی فضا جو چند دنوں سے کچھ مکدر نظر آرہی ہے وہ بیرونی اثرات کا طفیل ہے اور بیرونی اثرات جو یہاں کارفرما ہو رہے ہیں وہ ہمارے پاس کے بعض قائدین کی سیاست کے دیوالیہ کی وجہ سے ہیں جو اپنے ملک کے مسائل کو اپنے دماغ سے سوچنے کی بجائے بیرونی قائدین کے مشوروں کے محتاج رہتے ہیں۔ اگر ہم اپنی کامل آزادی اور ملک کی وحدت کے لئے متحدہ طور پر اور غیر فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے کام نہ کریں تو وہ انتہائی منحوس دن آن پہنچے گا کہ ہم غیروں کے غلام بن جائیں گے اور ملک اور اس کا امن و اماں، روایتی اتحاد اور اس کی تہذیب اور تمدن برباد ہو جائے گا۔ فرقہ واریت کے جنون میں وہی حشر بپا ہوگا جو دوسرے حصوں میں خون کی ہولی کی صورت میں ہوا ہے۔

# حیدرآباد آزاد ہے

ہم مملکت ہندوستان اور پاکستان کی آزادی پر نہایت مسرور اور مطمئن تھے کہ ڈیڑھ سو سالہ سیاسی جد وجہد، باہمی کشمکش اور رقابت کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا اور باعزت طور پر غلامی کے جوئے کو اپنے کاندھوں پر سے اتار پھینکا۔ مگر ہماری اس خوشی پر پنجاب اور دہلی کے بھیانک اور انسانیت سوز واقعات نے گہری مایوسی کا پردہ ڈال دیا۔ پھر یہی نہیں بلکہ ہند کے بعض قائدین کی "جوع الارض" اور جلد بازی نے پیچیدہ تر مسائل پیدا کر دیے اور دونوں مملکتوں کو پھر ایک ثالثی کے پاس رجوع ہونا پڑا۔ اگر "جوع الارض" کی پالیسی پر مملکت حیدرآباد کے ساتھ بھی عمل کیا گیا تو عوام کی خوں ریزی کے سوا اور کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اور ہرطرف نراجی کیفیت پیدا ہو جائیگی۔

مملکت حیدرآباد کی کامل آزادی میں خواہ مخواہ مداخلت ایک اور سیاسی گتھی بن جائے گی۔ دنیا کا وہ کونسا ملک ہے جس کی سرحدیں ایک دوسرے سے نہ ملتی ہوں اور وہ ہمسایہ ممالک سے دوستانہ تعلقات نہ رکھتے ہوں۔ یورپ کے بعض ممالک جو مملکت حیدرآباد کے مقابلہ میں بلحاظ رقبہ اور آبادی بہت چھوٹے ہیں، کامل آزاد اور مقتدر ہیں اور اپنی آزادی اور وحدت میں کسی غیر کی مداخلت گوارا نہیں کرتے کیا سوئٹزرلینڈ چیکوسلواکیہ اور آسٹریا جیسے ممالک اپنے ہمسایہ ملکوں سے گھرے رہنے کے باوجود آزاد ہیں؟ اور کیا ان کی آزادی بین الاقوامی طور پر مسلم نہیں ہے؟ جب برما اور سیلون کامل آزاد رہ سکتے ہیں تو کیا مملکت حیدرآباد آزاد نہیں رہ سکتی؟ حیدرآبادیوں کو یہ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ حیدرآباد جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے انڈیا یونین سے گھرا ہوا ہے اور وہ جب چاہے ہماری معاشی ناکہ بندی کر سکتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا اخلاقی اثر دوسری قوموں پر اور ہند کی بین الاقوامی حیثیت پر کیا مترتب ہوگا، ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ حیدرآباد اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پیداوار کی وجہ سے خود مکتفی ہے۔ سچ پوچھئے تو دونوں مملکتوں یعنی ہندوستان اور پاکستان کی ریاستوں اور علاقوں کو اپنے میں زبردستی شامل کرنے کی روش اور بلاوجہ وہاں کے عوام پر سیاسی دباؤ ڈال کر ان کو اپنا مخالف بنا لینے کے مترادف ہے۔ ریاستوں اور علاقوں کو ضم کرنے کی پالیسی سے بڑھ کر عوام کی بہبود، افلاس، بھوک، عریانی، بیروزگاری، صحت، تعلیم، سماج سدھار کے طریقے، معاشی پستی کہیں زیادہ اہم تر فوری حل طلب مسائل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مملکت حیدرآباد "قرون وسطیٰ کی یادگار ہے"۔ اگر شاہی امن وامان برقرار رکھنے ہندو مسلم روایتی اتحاد اور رنگا رنگ ترقیات اور اصلاحات کرتے رہنے کی وجہ سے ہمیں یہ خطاب عطا ہوا ہے تو ہمیں اس پر ناز ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ حیدرآبادی ابھی اتنا "مہذب" اتنا "جدید" اور "روشن خیال" نہیں ہوا ہے کہ بہار، دہلی، نواکھالی اور پنجاب کے خونین واقعات کو دہرائے اور اپنے ہنستے ہم وطنوں کا خون

بہاکر تمغہ بہادری پائے بلکہ وہ تہذیب کے اس معیار کا قائل ہے کہ

"اصل تہذیب احترام آدم است"

لیکن اگر صرف یہاں کے "آباد اجداد کی بہادری کے صلے میں پائی ہوئی جاگیروں کو ورثتاً پانے والے جاگیر داروں کی وجہ سے ہمیں رجعت پسند کا خطاب عطا ہوا ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ اسے قبول کرنا پڑتا ہے آج جب کہ سارے ملک کا امن و امان خطرہ میں ہے اور ہر لحظہ نئی سیاسی کروٹوں سے ہر معمولی فرد میں بیداری پیدا ہوتی جا رہی ہے' ہمارے بعض نواب اور جاگیردار واجد علی شاہ کے دور کی یاد دلاتے ہوئے خواب غفلت میں مدہوش ہیں' طوفان ان کے دروازوں سے آکر ٹکرا رہا ہے مگر وہ مطمئن ہیں کہ ان کے دروازے لوہے اور ان کے مکان مضبوط اینٹ پتھر کے بنے ہوئے ہیں' انھیں حیدرآبادی نوجوانوں کی جد و جہد' قائدین کی اپیلوں اور عوام کے ایثار کا کوئی احساس نہیں' مگر انھیں بھولنا نہ چاہیئے کہ یہ خواب غفلت انہیں موت کا پیغام دے گا اور اب بھی وہ نہ چونکیں تو پھر صور قیامت ہی انہیں جگا سکے گا۔

اعلیحضرت بندگان عالی کے فرمان مبارک آزادی نشان کے شرف صدور لانے کے بعد سے اب حیدرآبادی عوام نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر لیا ہے انھوں نے یہ بھی جان لیا ہے کہ آزادی کا حاصل کرنے سے زیادہ اس کو باقی رکھنا نہایت دشوار کام ہے۔ آزادی کی بعض نعمتوں سے اب تک ہم مستفید ہو رہے ہیں اور معاشی مرفہ الحالی اور فرقہ واری امن و سکون میں ہندوستان اور پاکستان کے باشندوں کے مقابلہ میں حیدرآبادیوں کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ آج عوام کی مقننہ ہے' عوام ہی کی حکومت اور وزرا ہیں۔ پھر کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ حیدرآباد ہندوستان یا پاکستان سے کسی معاملے میں پیچھے ہے؟ معاشی مرفہ الحالی اور فرقہ واری امن و سکون میں وہ ان دونوں مملکتوں سے بڑھا ہوا ہے لیکن ہمیں صرف موجودہ حالت پر ہی قناعت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ بقول حالی

ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں

کے مصداق ہمیں اپنی تجارت' صنعت و حرفت اور زراعت کو فروغ دینا ہے' معدنی وسائل دریافت کرنے ہیں' نئی نئی منصوبہ بندیوں کو روبہ عمل لانا ہے اور ان تمام کاموں کے لئے بہترین دماغوں کی تربیت کرنی ہے اور اس کی تکمیل اور اس ذمہ داری کی عہدہ برآئی عثمانیئن ہی کے ہاتھوں ہونی چاہیئے۔ ملک کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں اور سرزمین دکن کی آنکھیں ان پر ہی لگی ہوئی ہیں اور وہ منتظر ہیں کہ

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا

## عوامی حکومت

ہمیں جو مقصد حاصل کرنا تھا اور جس کے حصول کے لئے مختلف قسم کے تدابیر اختیار کی گئیں یعنی "نمائندہ عوامی حکومت کا قیام" وہ حاصل ہوگیا۔ اب عوام کے مسائل کو عوامی وزراء ہی کو حل کرنا ہے اور انھیں ثابت کر دکھانا ہے کہ وہ عوام کے صحیح خادم ہیں۔ ایک لمحہ امتحان اور سخت آزمائش کا ہے۔ آج ہماری عوامی حکومت کے سامنے بڑے ہی کٹھن اور تدبر طلب مسائل ہیں۔ ایک طرف تو ملک کے داخلی امن و اماں کو سنبھالنا ہے اور بیرون ملک سے آنے والے شرپسندوں سے سرحدات کی حفاظت کرنی ہے دوسری طرف ہندوستانی قائدین کی دھمکیوں اور "اعصابی جنگ" کے نفسیاتی اثرات سے خود کو اور عوام کو بچاتے ہوئے انڈیا یونین سے مستقل اور باعزت معاہدہ طے کرنا ہے اور تیسری طرف ملک کی خوش حالی اور ترقی کے ایسے کام انجام دینے ہیں جس سے بدطینت ناقدین کو نام دھرنے کا موقع نہ ملے۔

ہم ہزاکسلنسی میر لائق علی صدر اعظم دولت آصفیہ و امیر جامعہ اور عوامی وزراء کا خیر مقدم کرتے ہوئے مبارک باد دیتے ہیں کہ انھیں ملک و قوم کی خدمت کا موقع ملا ہے اس لئے ہم توقع رکھتے ہیں کہ بہت جلد عوام پر یہ واضح ہو جائے گا کہ وہ جس مقصد کے حصول یعنی "اچھی حکومت" کے لئے ایک عرصہ سے جد و جہد کر رہے تھے وہ وجود میں آچکی۔ احباب نوازی، داماد نوازی، اقربا پروری، اثرات، سفارش اور رشوت ستانی کا دور ختم ہو جائے گا اور ہر حیدرآبادی کو اس کی قابلیت، صلاحیت اور اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ترقی کرنے موقع ملے گا۔ ہمارے بعض محکمے ایسے ہیں جو جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کے حقوق کو اثرات اور احباب نوازی کے تحت پامال کرتے ہیں۔ حالانکہ مختلف عہدوں کے تقررات کے اعلان کے وقت اثر اور سفارش کو امیدوار کے لئے باعث نقصان کہا جاتا ہے لیکن عمل کے لحاظ سے ہمیں ان محکموں کے بارے میں مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ

برعکس نہند نام زنگی کافور

ہم عوامی حکومت سے قوی توقع رکھتے ہیں کہ اس قسم کی تمام شکایات رفع ہو جائیں گی اور جامعہ کے سپوتوں کے حقوق کی تکمیل کی جائے گی۔

## نظام تعلیم

قومی تعمیر کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ تعلیم کا ہے۔ کیونکہ انسان کو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں اور مخفی توانائیوں کا علم صرف تعلیم اور ماہرانہ تربیت ہی سے ہو سکتا ہے، لیکن ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت نہیں جو صرف حصول معاش کا ذریعہ ہو، علم ایک قوت ہے۔ جس سے ملک کی پستی، زبوں حالی غربت اور افلاس کے خلاف جنگ کی جا سکتی ہے۔ علم کا مقصد انسان میں سمجھ بوجھ پیدا کرنا اور اسے انسانی

ذمہ داریوں سے روشناس کراتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ملک کا امن و اماں تعلیم اور صرف تعلیم ہی سے وابستہ ہے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے رہ کر یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ ہم آزاد ہیں اور ہم پر ایک آزاد مملکت کے شہری کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ لیکن واقعی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرنا اور ان سے عہدہ برآ ہونا بہت ہی مشکل ہے، اس مشکل کی کنجی تعلیم میں پوشیدہ ہے۔ کیا ہمارا موجودہ نصاب اور طریقۂ تعلیم ہم میں ان گرانبار ذمہ داریوں کا احساس پیدا کراتا ہے؟ کیا ہم میں کردار کی وہ استواری، خیالات کی وہ بلندی اور اعلیٰ نصب العین کی جدوجہد کی وہ خواہش پیدا ہوتی ہے جو ایک آزاد ملک کے باشندوں کے شایان شان ہے؟ مدارس میں کیا پڑھایا جاتا ہے، یہ اہم ضرور ہے مگر کس طریقہ سے پڑھایا جاتا ہے یہ اس سے اہم تر مسئلہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارا ریاضی کا طالب علم مشکل سے مشکل سوالوں سے اپنا دماغ لڑا سکتا ہے کیونکہ اسے کلستقوں کی مشقیں کرنے کی عادت ہے، لیکن کیا اس میں یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ دوسروں نے جو یہ مسائل نکالے ہیں کن خطوط پر غور و فکر کرکے نکالے ہیں؟ ہمارے معاشیات کے طالب علم کو رسد اور طلب، محنت اور سرمایہ کے نظریات کا بخوبی علم ہے لیکن کیا وہ ان کو حیدرآباد کے معاشی وسائل پر منطبق کرنے اور یہاں کے مخصوص مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ اگر مدارس کی آٹھ دس سالہ اور جامعہ کی چار چھ سالہ طالب علمی کے دوران میں اس میں اتنی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہو سکتی تو یہ کس کا قصور ہے، کیا طالب علم کا؟ لیکن وہ تو مدرسے میں داخل ہوتے وقت ذہن کی سادہ تختی لے کر آتا ہے اس کی تمام تر ذمہ داری، نصاب، طریقۂ تعلیم اور اساتذہ پر ہے۔ اب یقیناً وہ وقت آچکا ہے کہ ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم موجودہ نظام تعلیم کی جگہ ایک ایسے نظام تعلیم کو جگہ دینے کی کوشش کریں جس سے ہر فرد کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں میں جلا پیدا ہو۔ اس نظام تعلیم میں تمام کاموں کے لئے کافی افراد فراہم کرنے کی گنجایش ہونی چاہیئے ان کاموں میں تجارت، صنعت و حرفت بھی شامل ہیں۔ علوم سائنس اور فنون لطیفہ بھی پیشہ ورانہ تعلیم کے ساتھ ساتھ لازمی ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان بھی ہو۔ آج امریکہ اور روس میں تعلیمی تجربوں پر کروڑہا روپیہ صرف کیا جا رہا ہے کیونکہ وہاں کے لوگوں کو اس کا احساس ہو چکا ہے کہ یہ سرمایہ فضول ضائع نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک اعلیٰ ترین تجارت میں لگایا گیا ہے۔ جس کا حاصل، بہترین دماغوں کی پیداوار اور بہترین کارکردگی رکھنے والے افراد ہیں جو نہ صرف ان پر صرف شدہ سرمایہ کو واپس کریں گے بلکہ اس کو دس گنا اور بیس گنا کرکے واپس کریں گے۔

اس کی ذمہ داری تنخواہوں کے پیمانوں پر (SCALES) پر بھی ہے ایک طیلسانی جب جامعہ سے ڈگری لے کر نکلتا ہے تو اس کو سب سے زیادہ راغب کرنے والے محکمے انتظامی محکمے نظر آتے ہیں اور اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے دماغ ان ہی محکموں کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اور وہ جنہیں ہر جگہ

بیکار فاضل ذہین" نظر آتا ہے منہ لٹکائے خراماں خراماں تعلیمات کی طرف چلے آتے ہیں لیکن تعلیمات کی ملازمت کے دوران میں بھی اس وقت تک ان کی کوششیں دوسرے محکموں کی طرف لگی رہتی ہیں جب تک کہ ان کی عمر تیس سال کی نہ ہو جائے۔ پھر ہم کیا توقع کر سکتے ہیں کہ ہمیں بہتر اساتذہ ملیں گے! جس طرح دوسرے محکموں میں تنخواہوں کے پیمانے بڑے ہیں اور جس طرح دوسرے محکمے اپنے ملازمین کو سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں اگر ویسی ہی تنخواہیں اور سہولتیں اساتذہ کو بھی مہیا کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کم از کم وہ افراد جنھیں تدریس کا شوق ہے تعلیمات کے علاوہ کسی اور محکمے کا رخ کریں۔

اس سلسلے میں حکومت کے موازنہ پر بہت زیادہ بار پڑنے کا سوال اٹھانا صحیح نہیں ہوگا اس لئے کہ اول تو ایک تعلیمیافتہ شخص خود ملک کا ایک سرمایہ ہے نیز قومی سرمایہ بڑھانے میں ایک جاہل شخص سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ دوسرے حکومت اپنی آمدنی بڑھانے کے دوسرے وسائل پر غور کر سکتی ہے۔ آخر یہ بڑے بڑے جاگیردار جو کثیر قومی سرمایہ کو معطل کئے ہوئے ہیں کیوں قومی تعمیر میں اپنا سرمایہ نہیں لگاتے اگر وہ خوشی سے یہ کام کرنے تیار نہیں ہیں تو حکومت کو جبراً ان سے یہ کام کروانا چاہئے۔ محصول آمدنی کے ذریعہ ان کی دولت کو قومی دولت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ہماری عوامی حکومت کو چاہیئے کہ ملک میں عام تعلیم کی اشاعت کے لئے محصول آمدنی اور محصول تعلیم کا قانون بھی نافذ کرے۔

ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ نے اپنی ایک انجمن بنائی ہے۔ اس انجمن کے مقاصد میں اگر تعلیم کے مسئلہ کو سب سے نمایاں اہمیت دی جائے تو مناسب ہے اور اپنے مسائل پر غور و خوض کرتے رہنے کے علاوہ جو تھوڑا بہت وقت بچے اس کو اگر اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے صرف کیا جائے کہ طریقہ تعلیم میں کس کس قسم کی تبدیلیاں موزوں ہو سکتی ہیں تو ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں ہی سے بڑے بڑے نتائج ظہور میں آ سکتے ہیں۔ زمانہ کے تقاضوں کے علاوہ، ملک کی ضروریات اور نفسیات انسانی کا لحاظ رکھ کر بنائے ہوئے نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔ جس میں اپنے وطن اور قوم کی محبت کا عنصر یا جذبۂ حب الوطنی اور قومیت کے جذبات ہوں۔

نظام تعلیم کے سلسلے میں ذریعہ تعلیم کی خاص اہمیت ہے ذریعہ تعلیم قومی اور ملکی زبان ہو نہ کہ پردیسی۔ جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اردو ہے، اس کے علاوہ اردو ہماری قومی اور مشترکہ زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ دکھنی تہذیب و تمدن اور ہندو مسلم اتحاد کی یادگار ہے، اسلئے جامعہ کے ملحقہ اداروں خصوصاً نظام کالج میں اردو کی کس مپرسی کو کوئی حیدرآبادی نہیں دیکھ سکتا۔ تعلیمی ادارے ہی ہیں جہاں نوجوانوں کے ذریعہ زبان، تہذیب اور تمدن کی تشکیل ہوتی ہے اس لئے عوامی حکومت سے

ہماری یہ خواہش ہے کہ سرکاری دفاتر کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں اُردُو زبان کو لازمی قرار دیں۔

## ہمارا حال

جامعہ کو قائم ہوئے ۲۹ سال ہو گئے لیکن اب تک جامعہ نے وہ ترقی نہیں کی اور اس کو وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جو اس کے شایان شان ہوسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ کے ابتدائی سالوں میں بہت سے سپوت پیدا ہوئے جو آج ہمیں زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں اور ان کی وجہ سے جامعہ کا وقار ہے۔ لیکن تقریباً دس گیارہ سال سے جامعہ نے ایک علم کی چاردیواری کے بجائے ایک عام دفتری حیثیت اختیار کرلی ہے اور اسکی ذمہ داری زیادہ تر طلبہ اور طلبہ کے بعد ارباب حل وعقد پر عائد ہوتی ہے۔ سچ پوچھا جائے تو طلبہ ہی اپنی مادر جامعہ کی ترقی اور اس کو فروغ دینے کے ضامن ہیں۔ برادران جامعہ کا تو یہ حال ہے کہ محض حصول اسناد کی خاطر تعلیم حاصل کریں اور کسی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ عام طور پر ہمارے پیش نظر زندگی کا کوئی بلند مقصد نہیں ہوتا۔ چند ٹکوں کی خاطر خود کو فروخت کردینا یہی زندگی کا تصور رہ گیا ہے۔ ہم میں حقیقی علم کے حصول کا شوق وجذبہ مفقود ہے کہا جاتا ہے کہ طلبہ میں علمی ذوق اس وجہ سے نہیں کہ اساتذہ کی جانب سے شوق نہیں دلایا جاتا لیکن علم سے ذوق وشوق رکھنا اپنی ذات سے وابستہ ہے، یہ پرائی چیز نہیں ہوتی، اپنی عام کمزوریوں کے باوجود ترقی کے مدارج طے کرنے کے خواب دیکھنا سراب کو بہتی ندی تصور کرنا ہے۔ اس جامعہ کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کو جو سہولتیں حاصل ہیں وہ اس ذیلی بر اعظم کی شاید ہی کسی جامعہ کو حاصل ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہر طرف سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ جامعہ پر حکومت کا روپیہ ضائع ہو رہا ہے کیونکہ یہاں سے اچھے دماغ اور اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے طلبہ پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور ایسے فارغ التحصیل طلبہ نظر آتے ہیں جو صرف کلرک کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے جامعہ اور جامعہ والوں کا سماج میں کوئی وقار اور مقام نظر نہیں آرہا ہے اور حیدرآباد کے اخبارات اور رسالے جامعہ پر حرف گیری کر رہے ہیں۔ غیروں کو ہمارے تنزل اور پستی کا احساس ہے، آہل ہمارے ہی ہاتھوں ہوا ہے اس میں کسی کا کچھ قصور نہیں ہے کیونکہ جامعہ میں علمی ماحول اور اعلیٰ کردار کا سماج ہمارے ہاتھوں ختم ہو رہا ہے، بلند نظری، وسعت خیال اور اعلیٰ مقصد حیات کی بجائے سطحیت اور کوتاہ بینی غالب ہوتی جارہی ہے۔ نظریۂ "علم برائے علم" پر عمل کرنے والوں کی اگر ناگزیر ضرورت ہوتی ہے تو زندگی کے میدان کارزار میں ان کے دماغ اور ٹھوس اور اعلیٰ کام کی افادیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔ "علم برائے زندگی" کے نظریہ پر کاربند ہوکر ہمیں جامعہ کے وقار اور اس کی شہرت میں چار چاند لگانا چاہیئے اور چاہیئے کہ اپنی طالب علمی کی زندگی کو اقبال کے الفاظ میں "خودی یقین اور عشق" کے جواہر سے مزین کریں تاکہ ملک و قوم اور انسانیت کی تعمیر حقیقی معنی میں ممکن ہو۔

ہی کے ہاتھوں ہو۔ ہمارے طالب علم کا مقام بہت بلند ہوتا ہے وہ اہل علم کے ساتھ ساتھ اہل قلم بھی ہوتا ہے اس لئے ہمیں ثابت کر دکھانا ہے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور ساتھ ہی ہمیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ :-

علم دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

(اقبال)

**سوشل کلب اور یونیورسٹی نیوز** | نواب علی یاور جنگ بہادر سابق معین امیر جامعہ نے طلبہ اور اساتذہ صاحبان میں گہرا ربط پیدا کرنے کے لئے ایک مفید تجویز پیش کی تھی کہ جامعہ میں سوشل کلب قایم کیا جائے۔ لیکن موصوف کا تعلق جامعہ سے منقطع ہونے کی وجہ سے یہ تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی اس کلب سے یہ فائدہ ہوگا کہ برادران جامعہ اور جامعہ کے ارباب حل و عقد اور اساتذہ صاحبان میں گہرا ربط پیدا ہونے کے علاوہ طلبہ کو اپنے اساتذہ صاحبان سے مختلف علمی' ادبی' سیاسی اور اپنے اپنے متعلقہ مضامین کے مسائل پر گفتگو کا موقع ملے گا اور اساتذہ صاحبان کو اپنے طلبہ کی صلاحیت اور قابلیت کا اندازہ ہوسکیگا اور وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتے رہیں گے۔ عالی جناب ڈاکٹر ولی محمد صاحب معین امیر جامعہ سے ہماری یہ استدعا ہے کہ مختلف مفادات کے پیش نظر سوشل کلب کا قیام عمل میں لائیں تو بہت مناسب ہوگا۔

جامعہ کی خبریں' اساتذہ صاحبان کی علمی' ادبی اور تحقیقی سرگرمیاں' برادران جامعہ کی علمی و ادبی مصروفیات اور جامعہ کی دیگر انتظامی و اصلاحی چیزوں کو منظر عام پر لانے کے لئے جامعہ کی جانب سے ایک ماہنامہ "یونیورسٹی نیوز" کے نام سے شائع کیا جائے تاکہ عوام میں جامعہ سے متعلق جو بدگمانی پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہو جائے کیونکہ ہماری جامعہ کو نئے "منشور" کے لحاظ سے بہت مفید اور اہم کام انجام دینے ہیں اس لئے تشہیر اور عوام کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے "یونیورسٹی نیوز کا شائع ہونا ضروری ہے۔ ہمیں قوی توقع ہے کہ عالی جناب معین امیر جامعہ اس تجویز کی افادیت کو ملحوظ رکھیں گے اور بہت جلد جامعہ کی جانب سے "یونیورسٹی نیوز" شائع ہوگا۔

**قاضی نمبر** | ہمارا ارادہ تھا کہ قاضی محمد حسین مرحوم کی یاد میں مجلہ عثمانیہ کا خصوصی نمبر شائع کریں لیکن ہمیں اپنے ارادہ میں ناکامی ہوی کیونکہ بار بار اصرار کرنے کے باوجود مضمون نگار اصحاب اور برادران جامعہ نے ہماری "گذارش" پر مطلق توجہ نہیں کی حالانکہ انعامات کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ ہم محترمی پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی' مشفقی پروفیسر ضیاء الدین صاحب انصاری اور جناب مولوی خواجہ محی الدین صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود ہم

سے تعاون کیا۔

قاضی صاحب مرحوم ہماری جامعہ کی ایک عرصہ تک مختلف حیثیتوں سے پرخلوص خدمت انجام دیتے رہے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ جامعہ کی خدمت ہی میں صرف ہوا' ان کے علمی و ادبی کارنامے جو ان کے نام و کام کو زندہ جاوید بنا دیں گے۔ برادران جامعہ اور اساتذہ صاحبان کے ساتھ ان کا جو برادرانہ سلوک، ایسی ہمدردی، حقیقی خلوص اور محبت رہا ہے وہ آج طلبہ کے دلوں میں باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس خلوص و محبت کو زندہ اور قاضی مرحوم کی یاد کو برقرار رکھنے کے لئے " قاضی پرائز " اور " قاضی فنڈ " قائم کیا جائے تاکہ مختلف امتحانوں میں امتیازات سے کامیاب ہونے والے " قاضی پرائز " سے مستفید ہوسکیں اور جامعہ کے ذی استطاعت اور نادار طلبہ کو " قاضی فنڈ " سے امداد مل سکے۔ ان دو مقاصد کی تکمیل کے لئے اساتذہ صاحبان اور ملک کے سربرآوردہ اصحاب سے چندے اور عطیئے وصول کئے جائیں محترمی ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کا ہمیں شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ موصوف ہی نے " قاضی پرائز " اور " قاضی فنڈ " سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا اور اس کام کو آغاز کرنے کے لئے آپ نے مبلغ (۱۰۱) روپے دینے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اب ملک کے سربرآوردہ اصحاب اساتذہ صاحبان اور ارباب جامعہ کا کام ہے کہ وہ اس اسکیم کو جلد روبہ عمل لائیں۔

**انعامی مضامین**

اعلان کیا گیا تھا کہ مجلہ کے بہترین مضامین وغیرہ وصول ہونے پر انعامات دئے جائیں گے چنانچہ حسب ذیل برادران جامعہ کو ہم پرخلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ ان کے معیاری مضامین انعامات کے مستحق قرار پائے۔

(۱) سید خلیل اللہ حسینی صاحب ام اے (آخری) اول

(۲) محمد شمس الدین صاحب بی ایس سی (ابتدائی) دوم

(۳) انور علی خاں صاحب سال اول سوم

**ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا**

مجلہ عثمانیہ جلد (۲۰) شمارہ (۱ و ۲) کے پڑھنے والے خود اندازہ کریں گے کہ اس کا معیار کیا ہے؟ اچھے معیاری مضامین کا فراہم کرنا " جوئے شیر لانے " سے کم نہیں۔ برادران جامعہ اور اساتذہ صاحبان سے متواتر اور بار بار اصرار کے باوجود مضامین وصول نہیں ہوتے اور ہر شخص اپنی گوناگوں مصروفیات کا ذکر کرتا ہے۔ کاش! برادران جامعہ اور اساتذہ صاحبان مضمون لکھنے کو بھی اپنی " گوناگوں مصروفیات

میں شامل کرتے تو مجلہ کی اشاعت جلد عمل میں آسکتی۔ وقت پر مضامین نہ ملنے نیز امداد و طباعت کی دقت اور کاغذ کی عدم دستیابی کی وجہ سے مجلہ کی اشاعت میں تعویق ناگزیر ہے اسی وجہ سے مجلہ کی دیر سے اشاعت کے متعلق ہر مدیر نے اپنا رونا رویا ہے۔ غرضکہ اسی قسم کے اسباب کی وجہ سے مجلہ کا یہ شمارہ بھی غیر معمولی تعویق سے شائع ہوا۔ امید کہ برادران جامعہ مختلف دقتوں کے مدنظر ہمیں معاف فرمائیں گے۔

میں محترمی استاذی پروفیسر ڈاکٹر زور صاحب مشیر حصہ اردو اور استاذی جناب لطیف احمد صاحب فاروقی خازن اعزازی مجلہ عثمانیہ کا دلی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشورے دیتے رہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

ک"

# آہ گاندھی جی!

ہندوستان کی آزادی کا علمبردار ---- بین الاقوامی مرتبہ کا قائد اور رہنما ---- ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر ---- انسانیت کے تعمیر کی ایک عالمگیر شخصیت ---- بلا لحاظ مذہب و ملت سب کا دوست ---- اہنسا اور فرقہ وارہم آہنگی کا مبلغ ---- رواداری باہمی محبت، آپسی یگانگت اور اخوت کا پیکر ---- ہندوستانی قوم کا باپ ---- امن اور عدم تشدد کا نقیب ----

افسوس صد ہزار افسوس ایک فرقہ پرست اور پاگل شخص کے تشدد کے ہاتھوں چل بسا۔ قوم کے بدترین اخلاق و کردار کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ وہ اپنے محسن اعظم کو قتل کر ڈالے۔ گاندھی جی کی موت انسانیت کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے اور تاریخ ہند کا ایک زبردست المیہ۔ گاندھی جی کی موت کا واقعہ جس طرح مذموم اور دردناک ہے اسی قدر تعجب انگیز بھی۔ اس عظیم ہستی کی موت نے سارے عالم میں رنج و ملال کی لہر دوڑا دی۔ ہمارے دور کی شاید ہی کوئی ایسی ہستی ہے جس کے رنج میں تمام مشاہیر عالم مغموم ہوئے ہوں۔ دنیا کی یہ بہت بڑی بدبختی ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں اس قسم کا ناپاک واقعہ ہوا۔ نسلیں آئیں گی اور چلی جائیں گی اور اس واقعہ پر آنسو بہاتی رہیں گی۔

گاندھی جی مر گئے لیکن ان کے انسانیت کے اصول اور ان کی تعلیمات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ہماری یہ دلی تمنا ہے کہ اس مقدس ہستی کی راکھ پر ایک ایسے نئے ہندوستان کی بنیاد رکھی جائے جو حقیقتاً ہندو مسلم اتحاد کا گہوارہ ہو، فرقہ وار ہم آہنگی کی بہشت ہو جس میں شانتی کی نہریں بہیں اور جہاں کا مسلک اتحاد اور یگانگت ہو۔ گاندھی جی کی روح اس ذیلی براعظم میں ان ہی چیزوں کو دیکھنے کی متلاشی رہے گی۔ ان کی تعلیمات، پیغام، انسانی اصول اور عدم تشدد کو عملی جامہ پہنانا ہی ان کی حقیقی یادگار قائم کرنا ہے اسی قسم کی یادگار گاندھی جی کی موت کی تلافی ہو سکتی ہے اور بس۔

## مولانا عبداللہ عمادی

مولانا عبداللہ عمادی کی موت نے اہل علم کے حلقوں میں ایک خلاء پیدا کر دی۔ آپ نے ۱۱؍شوال ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۶؍ستمبر ۱۹۴۷ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ عربی زبان وادب پر عبور اور انشاء پردازی اور ادبی قابلیت کے لحاظ سے مرحوم ہندوستان کے ادیبوں اور عالموں میں خاص شان کے مالک تھے۔ مرحوم حیدرآباد کے علمی مجلسوں کے جز تھے۔ بہترین مترجم ہونے کے علاوہ وہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے ناظر مذہبی بھی تھے دارالترجمہ میں مرحوم کی ضرورت ناگزیر تھی۔ افسوس! ان کی وفات سے حیدرآباد کے علمی حلقوں کا بہت بڑا نقصان ہوا اور ایک ادبی خزانہ چھین لیا گیا۔

خدا خلد بریں میں ان کو جا دے

## مولوی ڈاکٹر عبدالحق

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی اچانک وفات سے جامعہ میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ ۷؍بہمن ۱۳۵۸ف کا وہ منحوس دن تھا کہ جامعہ نے ایک لائق استاد اور طلبہ کے حقیقی ہمدرد کو کھو دیا۔ مرحوم جامعہ میں شعبہ عربی کے صدر، و شعبہ فنون کے پروفیسر تھے۔ آپ کی علمیت اور قابلیت نے طلبہ میں علمی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ آپ بہت ہی جانفشانی سے عربی پڑھاتے تھے۔ علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ مختلف کھیلوں خصوصاً ٹینس سے خاص دلچسپی تھی۔ مرحوم اپنی رائے اور خیال میں بالکل آزاد تھے، جب کبھی سناتے تو کھری کھری سناتے۔ بیباکی، آزاد خیالی اور خودداری مرحوم کی خاص

تعزیات متین۔
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

# مولوی محمد نذیر الدین

عجب اک سانحہ سا ہو گیا ——

مولوی محمد نذیر الدین کی وفات سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا بہت بڑا نقصان ہوا۔ مرحوم ہماری جامعہ کے ریاضی کے ام اے تھے۔ آپ نے اپنی ساری عمر ترجمہ و تالیف میں صرف کی۔ ریاضی کے متعلق تقریباً سترہ یا اٹھارہ کتابیں ترجمہ کیں جو آپ کے نام اور کام کو زندہ رکھیں گی۔ مرحوم اس دنیا سے چلے گئے لیکن آپ ریاضی کی علمی دنیا میں موجود ہیں۔ خلوص، محبت، ہمدردی اور وسیع النظری آپ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کا ثبوت تھے۔ مختصر یہ کہ

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

۱۳۷

# جواں مرگ میکش

مجلہ عثمانیہ کا سابق مدیر اور حیدرآباد کا نوجوان شاعر میکش چلا گیا اور حیدرآباد نے ایک اچھے شاعر کو کھو دیا۔ حیدرآباد میں اس نے زندگی کیسی گذاری، یہ حیدرآباد کے نوجوانوں ہی سے پوچھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بقول فانی

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

یہی اس کی زندگی تھی۔ افلاس نکبت اور بیروزگاری کے عالم میں اپنی قیمتی زندگی کو سپرد خاک کیا۔ میکش جامعہ عثمانیہ کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا جو جامعہ کی عظمت اور سربلندی کے لئے دم بھرتا تھا "گریہ و تبسم" "نوید" "کاغذ کی ناؤ" اور اس کے ریڈیائی ڈرامے اور دوسری نظم و نثر علمی کام، اس کی یاد زندہ رکھنے کے لئے بہت کافی ہیں یہ تمام باقی رہیں گی لیکن افسوس ❖ میخانہ سخن کا وہ میکش نہیں رہا۔

# ایک شہید طالب علم

مولوی حبیب احمد صاحب فاروقی مرحوم جامعہ عثمانیہ کے ایک ممتاز فارغ التحصیل اور محکمۂ تعلیمات کے ایک نیک نام کارگزار اور اعلیٰ کردار کے عہدہ دار تھے۔ ان کا مدرسہ اعزہ کی پرنسپلی کا دور بہت درخشاں رہا تھا۔ سخت افسوس ہے کہ انھوں نے ۱۵ جنوری کو کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں ایک حادثۂ اتفاقی سے اچانک انتقال کیا۔

مرحوم گریجویٹ ہونے سے پہلے ہی ٹکنکل کالج میں سائنس کے استاد ہو گئے تھے۔ دوران ملازمت میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ریاضی میں بی۔ اے کیا بی۔ ٹی ہوئے پھر ایم۔ ایڈ، میں درجۂ اول میں کامیاب ہونے والوں میں اول رہے "تجرباتی تعلیم" لکھی جو اردو زبان میں اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ "لاسلکی نشر" "نمک پارے" اور "بنگاری بابو" وغیرہ مختلف النوع رسالے لکھے۔ اردو اور انگریزی میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ نشرگاہ حیدرآباد سے ان کی متعدد دلچسپ تقریریں نشر ہوئی ہیں۔

محکمۂ تعلیمات سرکار عالی نے ان کو گذشتہ سال ڈپوٹیشن پر ایک بالکل نئے مضمون "پیشہ نمائی" Vocational guidance کے لئے کولمبیا یونیورسٹی بھیجا تھا۔ مرحوم نے اس مضمون میں ایم۔ اے کرلیا تھا اور چونکہ گذشتہ موسم گرما میں بھی انھوں نے بجائے آرام لینے کے کام کیا تھا وہ مدت معمولی سے پیشتر ہی اپنا کام ختم کرچکے تھے اور جلد وطن واپس ہو کر محکمہ اور ملک کی خدمت میں منہمک ہوجانا چاہتے تھے۔ سرکار عالی نے ان کی واپسی کے انتظامات کا تار اتفاق سے ۱۵ جنوری ہی کو یہاں سے روانہ کیا تھا۔ محکمۂ تعلیمات "پیشہ نمائی" کا ایک ادارہ کھولنے کے لئے ان کا منتظر تھا جو اپنی نوعیت کا ہندوستان میں پہلا ہوتا۔

مرحوم بہت متشرع اور دیندار انسان تھے۔ ریل میں جہاز میں اور نیویارک میں ان کی پابندی صوم وصلواۃ جاری رہی۔ وہ ایک حلیم الطبع، خلیق اور سنجیدہ دل ودماغ کے فرد تھے اس قیمتی ہستی کا بے وقت ارتحال نہ صرف ان کے خاندان کے لئے ایک جانکاہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے

بلکہ ملک اور قوم کا بھی ایک شدید خسارہ ۔
رکن الدین صاحب قریشی جو حیدر آباد سے مرحوم کے ساتھ ہی امریکہ گئے تھے اپنے ۱۸ر جنوری کے تعزیتی پیام میں لکھتے ہیں :-
" مرحوم ہم سب کے بزرگ تھے اور اپنے اچھے اخلاق اور پُرخلوص برتاؤ کی وجہ سے حددرجہ ہر دلعزیز تھے کولمبیا یونیورسٹی کے احباب اور اساتذہ اور نیز وہ تمام حضرات جن سے اُن کا تعارف ہوا تھا سخت رنج کر رہے ہیں۔ اس سانحے سے یہاں ہر ایک متاثر ہے اور دو دن رات مرحوم کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق کا ہی ذکر ہوتا رہا۔ کئی امریکی دوستوں نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے مرحوم کا ذکر آبدیدہ ہو کر کیا اور انتہائی رنج کا اظہار کیا "
قاضی محمد جان صاحب صدیقی دوسرے حیدرآباد اسکالر نے جو کولمبیا میں زیرتعلیم ہیں لکھا ہے کہ :-
" نہ صرف مجھے نہ صرف حیدرآبادی طلبہ کو بلکہ تمام ہندوستانی طلبہ اور بعض امریکن مصری ایرانی اور حبشی طلبہ کو بھی اس حادثہ کا حددرجہ ملال ہے۔ ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ ہم سے ایک بہترین ساتھی ایک پرخلوص رہبر ایک سچا ہمدرد دور ہو گیا۔ معلوم نہیں خالق مطلق نے اس میں کیا مصلحت دیکھی ہم سے اتنا انمول موتی کیوں چھین لیا گیا۔ حیدرآباد اس پر جتنا بھی افسوس کرے کم ہے "
کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر لنٹن نے اپنے تعزیتی پیام میں لکھا کہ " میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسٹر حبیب احمد فاروقی یہاں اساتذہ اور ہم درسوں کے انتہائی احترام اور اعتماد کے حامل تھے "
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔
بمصداق حدیث شریف من مات فی طلب العلم مات شہیداً ۔ مرحوم نے دور دراز کا سفر جستجوئے علم میں اختیار کیا اور شہادت کا درجہ پایا۔ خدا ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔



# ڈاکٹر قاضی معین الدین

ڈاکٹر قاضی معین الدین کئی سال تک نظام کالج کے وائس پرنسپل رہے اور گذشتہ سال میں آپ محبوب کالج کے پرنسپل بنا دئے گئے تھے لیکن اچانک حرکت قلب کے بند ہو جانے سے آپ

کا انتقال ہوا۔ افسوس صد ہزار افسوس۔

مرحوم جامعہ کے ام ایس سی تھے اور لندن یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی تھے۔ مرحوم بہت ہی مرنجان مرنج، خلیق اور منکسر المزاج تھے، طلبہ کے بہت ہمدرد اور سچے دوست تھے ان کی وفات سے طلبہ کا بہت نقصان ہوا۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کے پسماندگان اور غمگساروں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

محمد مصلح الدین صدیقی ام، اے (آخری)

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو



محمد مصلح الدین صدیقی ام اے (آنرز)

مہتمم مدیر و مدیر حصہ [illegible]

سابق نائب مدیر مجلہ عثمانیہ ۔ سابق معتمد [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پاکستان اور انڈیا کے قلمروی اتحادوں میں شریک ریاستوں کی حیثیت

**تمہید** | قواعد و احکام سے زیادہ ان قواعد و احکام پر عمل کرانے والوں کی ذہنیت یا کردار اس دنیا میں موثر نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں تین مہینوں کے قلیل ابتدائی اور عبوری دور کی بنا پر کسی کے متعلق کسی قطعی فیصلے کا صادر کر دیا جانا مناسب نہیں۔ جہاں تک اساسی احکام و قواعد کا تعلق ہے ہماری دونوں ہمسایہ قلمرؤں میں کامل یکسانی ہے لیکن اپنی اپنی شریک ریاستوں سے ان کے برتاؤ میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ بطور مثال صرف یہ امر کافی ہے کہ انڈیا میں شریک ریاستوں کو اپنا دستور بدلنے اور عہدہ دار دفتری وزرا، کی جگہ عوامی وزرا کی مدد سے جو حکمران کے سامنے نہیں بلکہ مقننہ کے سامنے جوابدہ ہوں نظم و نسق کے فرائض انجام دینے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ دفتری وزرا نے میسور کو "نمونے کی ریاست" کا نام دلا دیا تھا۔ اس میں تک سابقہ طرز حکومت تو کہاں اس میں تدریجی تبدیلی تک کو گوارا نہ کیا گیا بلکہ فوری تبدیلی ضروری قرار دی گئی اور یہ جبر و اکراہ کرائی گئی۔ اس کے برخلاف پاکستان نے اپنی شریک ریاستوں کے طرز حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں کرائی اور متعلقہ حکمرانوں کو اس اہم معاملے میں کامل آزادی دے رکھی ہے۔ یا یہ کہنا صحیح تر ہوگا کہ دستاویز شرکت کی زیادہ مکمل تعمیل اپنی پالیسی رکھی ہے۔

ان حالات میں محض قانونی موقف کی تحلیل کے سوا یہاں چارہ نہیں نظر آتا۔

**ملک کے سیاسی حصے** | براعظم ہند کے ۲۷ رمضان ۱۳۶۶ھ (۱۵ اگست ۱۹۴۷) کو چار ممتاز حصے رہے ہیں:-

۱۔ پرتگالی اور فرانسیسی مقبوضہ دیہات (یعنی گوا، پھلچری [پانڈیچری] وغیرہ)
۲۔ نیپال اور بھوٹان کی کم و بیش مسلمہ طور پر آزاد ریاستیں
۳۔ برطانوی ہند
۴۔ دیسی ریاستیں

اگرچہ ان سب پر جدید صورت حال کا بڑا اثر پڑتا ہے لیکن ہمیں یہاں صرف آخری دو یعنی برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں سے بحث ہے۔

اصل میں آزادی کی جد و جہد میں برطانوی ہند ہی کو کوئی کام انجام دینا تھا کہ وہاں سے غیر ملکی حکمرانوں کو نکال باہر کیا جائے۔ دیسی ریاستوں کو اس سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن چونکہ برطانوی ہند کو دیسی ریاستوں میں بھی سیاسی، معاشی بلکہ بہ ادعائے خود "بالادستی" کے اثرات حاصل تھے اس لئے برطانوی ہند کی ہر دستوری تبدیلی کا دیسی ریاستوں پر براہ راست اثر پڑتا تھا۔

## جدید دور کے سنگ میل

تحریک آزادی کا جدید دور دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور مزدور وزارت لندن میں برسر اقتدار آتے ہی تین وزراء کی ایک بااختیار جماعت ہندوستان روانہ کرتی ہے جسے برطانوی ہند کے سیاسی قائدین اور دیسی ریاستوں کے سرکاری نمائندوں سے گفت و شنید اور معاہدہ کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔

کئی مہینوں کی گفت و شنید کے بعد اس نے اپنی جو تجویزیں پیش کیں اگرچہ وہ نافذ نہ ہو سکیں لیکن اس دستاویز کا وہ حصہ جو دیسی ریاستوں سے متعلق تھا بعد کے منظورہ و نافذہ "قانون آزادیٔ ہند" میں باقی و برقرار رکھا گیا اس لئے وزارتی وفد کی اس متعلقہ تجویز کا ذکر ضروری ہے:-

" ریاستیں اور برطانوی ہند

"فقرہ (۱۴) ہماری سفارشیں پیش کرنے سے قبل ہم اس امر پر توجہ کرتے ہیں کہ دیسی ریاستوں کے برطانوی ہند سے تعلقات پر بحث کریں۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ برطانوی ہند جب آزادی حاصل کرلے چاہے دولت عامہ کے اندر یا باہر تو جو تعلق دیسی ریاستوں کے حکمرانوں اور تاج برطانیہ میں اب تک رہا ہے وہ آئندہ ممکن نہ ہوگا۔ بالادستی نہ تو تاج برطانیہ کے پاس باقی رکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی جدید حکومت (ہند) کو منتقل کی جاسکتی ہے۔ دیسی ریاستوں کے جن (نمائندوں) سے ہماری ملاقات ہوئی انھوں نے اس واقعے کو پوری طرح تسلیم کرلیا ہے۔ انھوں نے ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی یقین دلایا ہے کہ وہ ہندوستان کی جدید ارتقائی تبدیلی میں تعاون کرنے کے لئے تیار اور رضامند ہیں۔ ان کا تعاون کونسی معینہ شکل اختیار کرے گا وہ ایک ایسا معاملہ ہے جو جدید دستوری ڈھانچے کی تعمیر کے وقت باہمی گفت و شنید کے ذریعے سے طے ہونا چاہئے۔ اس کے معنے ہرگز یہ نہیں کہ وہ (شکل تعاون) سب ریاستوں کے لئے یکساں ہو۔ اسی لئے ہم نے فقرات ذیل میں ریاستوں کے متعلق اس تفصیل سے بحث نہیں کی ہے جیسی برطانوی ہند کے صوبوں کے متعلق کی ہے"

جب کچھ مد و جزر کے بعد وزارتی وفد کی تجویزیں (جو برطانوی ہند کی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے ملک کی آزادی کے متعلق تھیں) نافذ نہ کی جاسکیں اور آخری ویسرائے لارڈ ماونٹ باٹن نے آکر حیرت انگیز تیزی سے برطانوی ہند کی دو حصوں میں تقسیم کے اصول کو حکومت لندن، کانگریس اور مسلم لیگ تینوں سے

منظور کرالیا اور مستقبل کے دستور کا خاکہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے سنایا تو اس میں دیسی ریاستوں کے متعلق صرف یہ ایک جملہ تھا :-

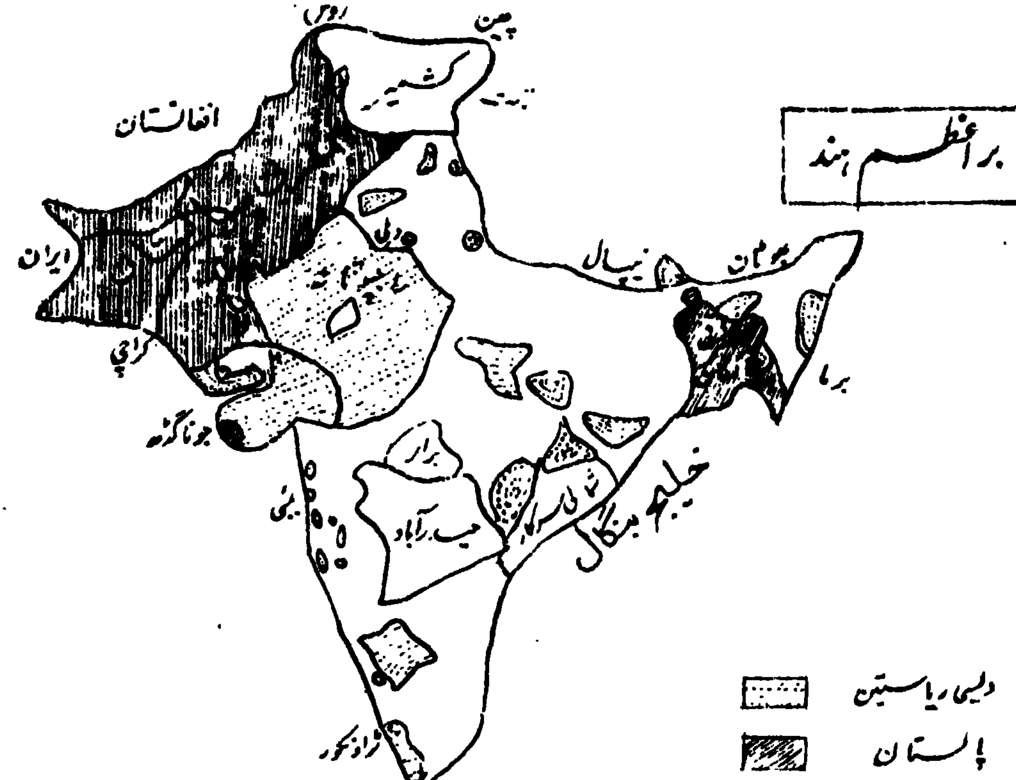
"ملک معظم کی حکومت یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اوپر جس فیصلے کا اعلان کیا گیا ہے وہ صرف برطانوی ہند سے متعلق ہے اور یہ کہ اس کی جو پالیسی دیسی ریاستوں کے متعلق وزارتی وفد کی یادداشت مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء میں درج ہے وہ بغیر کسی تبدیلی کے برقرار ہے۔"

**انگریزوں کا منشاء** برطانوی ہند کی تقسیم و آزادی اور دیسی ریاستوں پر سے اس کی بالادستی کے خاتمے کا جب پارلیمان میں یہ عہد آفریں اعلان ہوا تو قدامت پسند جماعت کے کٹر قائد مسٹر چرچل نے بھی یہ غیر متوقع بیان دیا تھا کہ :-

"اگرچہ میری پارٹی فرداً بھی نکات پر بحث کرنے کی پوری آزادی اپنے لئے محفوظ رکھتی ہے لیکن وہ کسی ایسے مجوزہ قانون کی مخالفت نہیں کرے گی۔ جو وزیر اعظم کے امروزہ بیان کی اساس پر ہندوستان کے مختلف حصوں کو قلمروی مرتبہ عطا کرنے کے لئے ہمارے سامنے پیش ہو۔"

انگریزوں خاص کر قدامت پسندوں کی طرف سے یہ فراخ دلی اور فیاضی بے وجہ نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک میں نے غور کیا یہ دلیل دل کو نہیں لگتی کہ ہندوستانی جذبۂ آزادی اور قوت تنظیم نے یہ سب حاصل کر لیا۔ جو لوگ ہٹلر سے نہیں ڈرے ان کے متعلق یہ قیاس اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے کہ وہ بے لڑے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح یہ گمان بھی کچھ زیادہ قابل قبول نہیں کہ بیرونی فضیحت سے ڈر کر یہ منظور کر لیا گیا۔ اگر مزدور پارٹی واقعی مصلحت پرست تھی تو بھی قدامت پسندوں نے کیوں یہ تجویز منظور کی میری اپنی ناچیز رائے یہ ہے کہ انگریزوں نے موجودہ قلمروؤں کا قیام نہیں چاہا تھا۔ "وزیر اعظم کے بیان کی اساس" پر جو نظم قائم ہونا چاہیئے تھا وہ یہ تھا کہ برطانوی ہند میں تو انڈیا اور پاکستان دو قلمرو بنیں اور دیسی ریاستوں میں کم از کم دس خود مختار وحدتیں وجود میں آئیں۔ حیدرآباد، میسور اور کشمیر الگ الگ وحدتیں بنیں تو مثلاً ٹراونکور اور کوچن مل کر ایک وسطی ہند کی ایک راجپوتانے کی ایک اڑیسہ کے مضافات کی چالیس ایک ریاستوں کی ایک 'مغربی ہند کے کوئی' سو ریاست نما قبوں کی ایک وغیرہ۔ براعظم ہند کے سیاسی نقشے پر نظر ڈالنے سے فوراً محسوس ہوگا کہ اس طرح ایک کی جگہ کوئی ایک درجن ہندوستان بنیں گے جن میں سے ہر ایک کمزور رہیگا اور ہر ایک انگریزوں کی مدد کا محتاج و متلاشی۔ سب سے بڑی وحدتوں پاکستان اور انڈیا کے متعلق سب جانتے ہیں کہ پاکستان کے دو ٹکڑے دو الگ مقاموں پر ہیں۔ لیکن خود قلمروے انڈیا بھی بیسیوں مقاموں پر دیسی ریاستوں کے درمیان میں آجانے کے باعث اتنی کٹ پھٹ جاتی کہ وہ پاکستان سے کم و بیش دگنی بڑی ہونے کے باوجود اس سے کئی گنا زیادہ کمزور ہو جاتی۔ متحدہ براعظم

ہندوستان دنیا کے پانچ بڑوں میں چھٹا بن جاتا۔اس کے برخلاف منقسمہ ہندوستان سے "بھورا خطرہ"




بحر ہند

گوری دنیا کے لئے کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا اور یہ درجن بھر ہندوستان آپس میں ہمیشہ لڑتے رہتے۔ غالباً یہ تھا وہ نقشہ جس کی مسٹر چرچل نے اجازت دی تھی۔

لیکن وم آخر نہ معلوم کس ترغیب یا تہدید نے اثر دکھایا کہ ویسرائے نے دیسی ریاستوں کو ہمسایہ قلمرو میں ضم ہونے پر مجبور کرنے میں رکاوٹ کی جگہ شریک کار بلکہ ذریعۂ عمل بننا منظور کرلیا اور ۲۷ رمضان (۱۵ اگست) سے پہلے ہی قلمروے انڈیا میں حیدرآباد کے سوا عملاً وہ سب ریاستیں شریک ہوگئیں جو اس کے حدود کے اندر تھیں اور اس کا رقبہ اب ایک مسلسل اتصال رکھنے والا ٹھوس وسیع اور طاقتور ملک بن گیا اور پاکستان اور انڈیا کا تناسب بجائے ایک اور دو کے ایک اور سات کا ہوگیا۔

## ریاستوں کی حیثیت قلمرو میں

قانون آزادی ہند جو برطانوی پارلیمان نے منظور کیا وہ انڈیا اور پاکستان دونوں کے لئے یکساں موثر ہے۔ اور ریاستوں کے

جو دستاویز شرکت مرتب ہوئی وہ بھی دونوں قلمروؤں میں یکساں ہے۔ ان کی وضاحت سے قبل یہ امر بیان
یا ضروری ہے کہ قلمرو سے انڈیا کے اندر تقریباً چھ سو ریاستیں ہیں۔ ان میں سے بعض ہزاروں مربع میل کی
، جیسے میسور، پستار وغیرہ۔ بعض رقبے مثلاً راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ بڑے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں بیسوں
سینکڑوں ننھی منی ریاستیں ہیں جن میں سے بعض محض پانچ پانچ سات سات مربع میل ہی کے رقبے ہیں۔ قلمرو سے
یا نے اسی لئے الف ب ج تین قسم کے دستاویز ہائے شرکت تیار کئے ہیں۔ درجۂ اول کی ریاستوں سے صرف
امات خارجہ، دفاع اور مواصلات مع متعلقات لے لئے گئے ہیں۔ درجۂ دوم میں عدالت بھی لے لی گئی ہے
۔ درجۂ سوم میں وظیفہ خواروں کی سی صورت ہے کہ عملاً پورا نظم و نسق قلمروی حکومت کے مامور کردہ کارندے
ام دیتے ہیں۔ اور ان کو برائے نام ہی ریاست کہا جاتا ہے! اسی طرح بعض رقبوں کی ریاستوں کے
کش شرکت کو کسی بھی شرط پر قبول ہی نہیں کیا گیا ہے۔ بظاہر ان کے مکمل الحاق و برخاستگی کا ارادہ ہے۔
ہم صرف درجۂ اول کی حیثیت کا مطالعہ کریں گے۔

## نون آزادیٔ ہند میں ریاستوں کی حیثیت

قانونِ آزادیٔ ہند بابت ۱۹۴۷ء کی دفعہ (۷) میں دیسی ریاستوں کا ذکر ہے اور ضمن (ب) اور "شرط"
ین کے متعلق ہیں جو یہ ہیں :—

"بالادستی (پارا منٹسی) کا خاتمہ

"دفعہ (۷)

"ذیلی دفعہ (۱)۔ مقررہ دن سے —

"ضمن (الف) ..................

"ضمن (ب)۔ ہز مجسٹی کا اقتدار بالا (سوزرینٹی) ہندی ریاستوں پر سے ختم ہوتا ہے اور اس کے
تھ ہی وہ تمام معاہدے اور تہ نامے جو ہز مجسٹی اور ہندی ریاستوں کے حکمرانوں میں طے ہوئے ہوں اور
نون ہذا کی منظوری کی تاریخ پر نافذ ہوں، اسی طرح وہ تمام وظائف بھی جو ہز مجسٹی تاریخ مذکور پر ہندی ریاستوں
متعلق انجام دئے جا سکتے ہوں اور وہ تمام واجبات جو تاریخ مذکور پر ہندی ریاستوں یا وہاں کے حکمرانوں کے متعلق ہز مجسٹی
ائد ہوں نیز وہ تمام اختیارات، حقوق، اقتدار یا اختیار سماعت جو تاریخ مذکور پر ہز مجسٹی ہندی ریاستوں میں یا ان کے
ق کسی معاہدے، سندِ عطا، عملدرآمد، روا رکھے جانے یا کسی اور بنا پر کام میں لا سکتے ہوں۔

"ضمن (ج) ..........

"البتہ اس ذیلی دفعہ کی ضمن (ب) و (ج) میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے باوجود ضمن ہائے مذکورہ میں

بیان شدہ کسی عہد نامے کے ان احکام کو جو چنگی، محصول عبور و مرور و مواصلات، ڈاک، تار یا اسی طرح کے معاملات کے متعلق ہوں جس قریبی حد تک ممکن ہو نافذ کیا جاتا رہے گا تاآنکہ احکام زیر بحث کو ایک طرف یا تو ہندی ریاست کا حکمران یا قبائلی علاقے کا سردار یا دوسری طرف قلمرو یا صوبہ یا اس کا کوئی اور متعلقہ حصہ منسوخ کرے یا کسی مابعد عہد نامے کے ذریعے سے دیگر انتظام عمل میں لایا جائے۔"

اس اہم دفعہ میں دو قسم کے احکام دئے گئے ہیں۔ ایک تو ریاستوں کی آزادی اور خود مختاری نیز سپرد کردہ اقتدارات و حقوق کی بازیابی اور دوسرے باوجود آزادی کے چنگی، ڈاک، تار اور مماثل معاملات کے متعلق سابقہ پابندیوں کی برقراری۔

ہمیں چونکہ قلمرو میں شرکت کرنے والی ریاستوں ہی سے یہاں بحث ہے اس لئے اس سلسلے میں دفعۂ ہذا کا اثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرکت کا معاہدہ کرنے والی ریاستوں کو بجائے کسی جزؤ آزاد مملکت کے مکمل خود مختار مملکت کی حیثیت سے فریق معاہدہ قرار دیں اور شرکت کے بعد دستاویز شرکت کے ذریعے سے سپرد کردہ امور کے علاوہ باقی ہر امر میں ریاست خود مختار رہے اور "مابقی اختیارات" اسی کو حاصل رہیں۔

لیکن عملاً ایسا نہیں ہوسکا۔ اول تو انگریزوں نے اپنی مصلحت سے ریاستوں کو سابقہ "حقوق" خود مختاری تو واپس کر دئے لیکن سابقہ "واقعی" خود مختاری پر واپس نہیں پہنچایا۔ یعنی اگر اب سے صدی، نصف صدی پہلے ان حقوق کے لئے جانے کے وقت ریاستیں فوجی ساز و سامان اور دفاع و خود اکتفائی کے دیگر لوازم میں برطانوی ہند کے معیار سے تقریباً برابر کی تھیں تو اب وہ بدلے ہوئے حالات میں قطعاً اس قابل نہ تھیں کہ چند مہینوں کی مدت میں اپنی فوج اور اس کے ساز و سامان کو برطانوی ہند کے معیار کے مماثل بنالیں۔ اور بنانا چاہتیں بھی تو برطانوی ہند اس کی اجازت نہ دیتا کہ وہ دبابے طیارے توپیں وغیرہ باہر سے خرید لائیں۔ اس طرح آزادی کی یہ کاغذی بحالی محض دکھاوا ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ ہم فرشتوں کی دنیا میں نہیں بلکہ انسانوں کی دنیا میں ہیں۔ اور انگریزوں کے جانے کے بعد ریاستوں کی کمزوری ہی ان کو مجبور کر دے گی کہ وہ مکرر ماتحتی کو قبول کریں۔

دوسرے انگریزوں نے کاغذ پر تو لکھ دیا کہ ان کو جو حقوق کسی عطا کے ذریعے سے یا محض زبردستی ہی سے حاصل ہوگئے تھے ان سے وہ دستبردار ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ ان حقوق و مفادات کو اپنی جانشین قلمرؤوں کے حق میں منتقل نہیں کرتے۔ لیکن یہ بھی محض ڈھکوسلا تھا۔ حقوق چاہے "منتقل" نہ کئے گئے ہوں لیکن جانشین قلمرؤوں کے قبضے میں رہنے دئے گئے۔ اور قبضے سے بہتر ملکیت کی دلیل کونسی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ بجز سکندرآباد، بنگلور، گلگت وغیرہ دو چار چھاؤنیوں کے انہوں نے کوئی چیز اصل مالک کو واپس نہ کی۔ شمالی سرکار اور برار کی مثال مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح سکے اور ڈاک کے کوئی حقوق ریاستوں کو نہ مل سکے۔

سب سے نمایاں تضاد قول و عمل میں یہ رہا کہ ریاستوں کو آزاد تو قرار دیا لیکن آزاد تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ میرے نزدیک تو یہ "آزادی" ایسی ہی تھی جیسے پاؤں کی بیڑیاں نکال کر پنجرے کے اندر "آزاد" چھوڑ دیا جائے۔ بہر حال پنجرے کے اندر کی آزادی کو بھی دستاویز شرکت نے جس طرح متاثر کیا اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

## دستاویز شرکت

دستاویز شرکت کوئی چار صفحوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ میں موضوع سے کسی قدر ہٹ جاؤں گا۔ لیکن اپنی اس حیرت کا آپ سے ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ اقتدار اعلیٰ کے متعلق اس میں جو ذکر ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے معنی خیز ہے۔ کانگریس کا یہ ادعا رہا ہے کہ ملک میں اقتدار اعلیٰ صرف رعایا کو حاصل ہوتا ہے اور انہیں کی اکثریت کی مرضی پر عمل ہونا چاہیئے لیکن دستاویز شرکت کی جسے کانگریسی قائدین ہی نے مرتب کیا تمہید اور دفعہ ۸۱ میں دہرائے ہوئے الفاظ قابل غور ہیں:۔

"میں حکمران ریاست فلاں میرے اس اقتدار اعلیٰ کو استعمال کرتے ہوئے جو مجھے ریاست مذکورہ میں اور اس پر حاصل ہے اپنی اس دستاویز شرکت کو نافذ کرتا ہوں" یا

"... اس دستاویز کی کوئی چیز میرے اس اقتدار اعلیٰ کے جاری رہنے کو متاثر نہ کریگی جو مجھے اس ریاست میں اور اس پر حاصل ہے ... " وغیرہ۔ اس کو اگر محض مصلحت پرستی اور دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو پھسلانا قرار دیا جائے تو پھر اقتدار اعلیٰ کے حامل کے مسئلے میں کانگریس پارٹی اور کانگریس حکومت میں اختلاف رائے و اختلاف عمل نظر آتا ہے۔ اور اس کے علمی اثرات دور رس ہیں۔

دستاویز شرکت میں (۹) دفعات اور ایک ضمیمہ ہے۔ ضمیمے میں ان امور کی تفصیل ہے جو شرکت کنندہ ریاست قلمروی حکومت کے سپرد کرنا منظور کرتی ہے۔

اس کی تمہید میں یہ بیان ہوا ہے کہ قانون آزادیٔ ہند کے تحت جو قلمرو قائم ہو رہی ہے اور جس کا دستور فی الحال "۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند" ہی ہے (اگرچہ اس میں بعض حذف و ترمیمات عمل میں لائی گئی ہیں) اس قلمرو میں ہندی ریاستوں کو شرکت کی اجازت ہونے کی بنا پر شرکت کی جا رہی ہے۔

اس میں دو نکتے قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ دو برابر کی خود مختار مملکتیں باہم اتحاد و انضمام کرنے کا معاہدہ نہیں کر رہی ہیں بلکہ ایک قلمرو کے اندر ایک ریاست خوردانہ انداز میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ اور دوسرے اس قلمرو کا مرکزی انتظام جس دستور اور قانون کے مطابق چل رہا ہے اسی کو ریاست کے شریک ہونے کے بعد کی وسیع تر قلمرو میں بھی برقرار رکھا جائے گا۔ ۱۹۳۵ء کے دستور کی بحالی کے اثرات کا آگے الگ ذکر ہوگا البتہ یہاں یہ اشارہ کر دیا جا سکتا ہے کہ ریاستیں کسی آزاد مملکت میں نہیں بلکہ برطانوی دولت عامہ کی ایک قلمرو میں شریک ہو رہی ہیں اور متعدد معاملات میں اب بھی قلمروی حکومتیں لندن کے زیر نگیں اور زیر اثر ہیں جس کی تفصیل یہاں شاید بے محل

ہوگی۔ یہاں صرف یہ یاد دلانا ہے کہ ریاستیں ماتحت در ماتحت بن جاتی ہیں۔

دستاویز شرکت کی دفعہ (۱) میں شرکت کے ارادے کا اظہار اور قلمرو کے مرکزی انتظامات یعنی گورنر جنرل، قلمرو کی مقننہ، وفاقی عدالت اور دیگر مرکزی محکموں اور عہدہ داروں کے اختیار کو تسلیم کرنے کا اعلان ہے۔

حل این مزید | دفعہ (۲) میں ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کو بھی تسلیم کرنے کا ذکر ہے اور دفعہ (۳) میں یہ کہا گیا ہے کہ دستاویز شرکت میں ریاست نے جو امور مرکز کے سپرد کئے ہیں ان کے متعلق قانون سازی صرف مرکزی مقننہ کرے گی ریاست کی منظوری بلکہ مشورت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت اور اس کے دستور کو صرف اسی حد تک ریاست میں دخل دینے کا مجاز کیا گیا ہے جس حد تک دستاویز شرکت میں ریاست اپنے حقوق و امتیازات کی سپردگی منظور کرے لیکن دفعہ (۴) میں مستقبل کے لئے بڑی گنجائش یہ کہہ کر رکھی گئی ہے کہ اگر آئندہ ریاست اور مرکز میں کوئی نیا راضی نامہ ہو جائے (اور ریاست کو نئے حقوق تو کیا ملیں گے) ریاست ہی کوئی مزید حقوق مرکز کو دینا منظور کر لے تو وہ راضی نامہ بھی دستاویز شرکت کا جزو سمجھا جائے گا۔ اور اگر تاریخ عالم کچھ رہبری کرتی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وفاق رفتہ رفتہ مکمل انضمام اور وحدانی حکومت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور دفعہ (۵) میں اس کی مکرر صراحت ہے کہ دستاویز شرکت کے احکام میں مرکزی حکومت ریاستی حکمران کی "منظوری" سے ہر وقت ترمیم بھی کر سکتی ہے۔

دباؤ کے طریقے | دفعہ (۶) بھی دور رس ہے۔ اس میں مرکز کو اختیار دیا گیا ہے کہ مرکزی فرائض مثلاً قلعوں چھاؤنیوں وغیرہ کے لئے جو اور جتنی زمین جب چاہے رقمی معاوضہ دے کر حاصل کرے اور بالکلیہ اپنے تصرف و انتظام میں رکھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی عمومیت میں حکومت انتخابات کے ذریعے سے برسر اقتدار آتی ہے۔ آج کانگرسی ہیں تو کل اشتراکی آسکتے ہیں پرسوں کوئی اور۔ چنانچہ کوئی جماعت ریاستوں کے اقتدارات گھٹانا چاہتی ہو تو وہ برسر اقتدار آنے کے بعد اولاً دفعۂ ہذا سے کام لے گی پھر دفعات (۴) و (۵) کے تحت حسب دلخواہ امور حکمرانوں سے "منظور" کرانے کے باوجود قانوناً جائز بنا سکے گی۔ ریاستوں کو اعتراض کا حق زمین کی قیمت اور معاوضے کے متعلق ہے خود زمین کے تعیّن کے متعلق نہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا گیا ہے کہ ایسا حصول عارضی ہوگا یا اختلاف کی صورت میں یکسوئی کے لئے ثالثی کا کوئی موقع ہوگا۔

حق علیحدگی | دفعہ (۷) بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قلمرو کی مرکزی مقننہ اگر آئندہ کوئی اور دستور مرتب کرے تو ریاست کے لئے اس کا قبول کرنا ضروری نہیں۔ اور یہ کہ ان متبدلہ حالات میں ریاست قلمرو سے کوئی اور معاہدہ آپس کے تعلقات کے لئے کر سکتی ہے۔ بظاہر اس دفعے کا اثر یہ ہے کہ اگر مرکزی مجلس دستور ساز کا تیار کردہ دستور ریاست کو پسند نہ آئے تو ریاست قلمرو سے کٹ کر الگ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں دو امر

قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو مجلس دستور ساز میں خود ریاست کے نمائندے آبادی کے تناسب سے شرکت کرکے جو دستور بنائیں وہ چاہے غلبۂ آراء سے اور ریاستی نمائندوں کی مخالفت کے باوجود ہی کیوں نہ بنا ہو ریاست کی نامنظوری کے حق (یا کم از کم اس کی اخلاقی اساس) کو گھٹا دیتا ہے۔ اور دوسرے تاریخ عالم بھی یہی بتاتی ہے کہ وہ وفاق سے علٰحدگی کا حق مرکز کی طاقت و قوت کے زمانہ میں صرف کاغذ پر رہتا ہے عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔ بہر حال جو بھی ہو ریاستوں کے لئے یہ بڑا اہم حق دیا گیا ہے۔ اور بہ ظاہر اس کا پس منظر یہ ہے کہ اگر قلمرو نے برطانوی دولت عامہ سے اپنے کو الگ کرلیا تو دیسی ریاستیں مکرر برطانیا سے رشتہ جوڑ سکیں۔ مگر یہ "دیدہ خواہد شد" کا مصداق ہے۔

<u>مابقی اقتدار</u> میرے نزدیک سب سے اہم دفعہ (۸) ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سپرد کردہ اُمور کے علاوہ مابقی اقتدار اعلیٰ ریاست ہی کو حاصل و برقرار رہیگا۔ لیکن اس کے الفاظ قابلِ غور ہیں "مجھے اس ریاست کے حکمران کی حیثیت سے جو اختیارات، اقتدار اور حقوق اب حاصل ہیں...." یہ لفظ "اب" کیا معنے رکھتا ہے؟ ریاستوں کو سلب شدہ اقتدارات ۱۵ اگسٹ کو ملنے والے تھے اور دستاویزِ الحاقِ شرکت پر اس سے پہلے ہی دستخط لے لئے گئے۔ کیا اس کے معنے یہ تو نہیں کہ جو اختیارات انگریزی دور میں چھن گئے تھے وہ اب بھی حاصل نہ ہوسکیں گے بلکہ غصب کی جگہ اب رضا و رغبت سے قلمرو یا مرکز کے حق میں منتقل شدہ سمجھے جائیں گے؟!

مثال کے طور پر سکّے کا ذکر مرکز کے سپردنی امور میں نہیں ہے۔ لیکن دفعۂ ہذا کے تحت ریاست کو اپنا علٰحدہ سکہ رائج کرنے کا حق نئے سرے سے حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ سکہ بنانے میں حکومت کو بڑا فائدہ ہوتا ہے جس زمانے میں تین چوتھائی چاندی کا روپیہ بنتا تھا اس وقت بھی حکومت کو فی روپیہ آٹھ آنے کی بچت ہوجاتی تھی۔ اب تو خالص نکل کے روپے بن رہے ہیں اور نوٹ کی اجرائی میں تو اور بھی زیادہ نفع ہے۔ مثلاً ہزار روپے والا نوٹ بنانے کا خرچ ایک آنہ ہوگا۔ اس کی ساکھ کے لئے دو سو روپے خزانے میں محفوظ رکھے جائیں گے۔ اس طرح آٹھ سو روپے کی حکومت کو بچت ہوگئی اور خود وہ دو سو روپے بھی بیکار نہیں رہیں گے بلکہ بنک میں رکھ کر سود حاصل کیا جاتا رہے گا۔ کیا مرکز اتنی منفعت بخش چیز کو چھوڑنے کے لئے آمادہ ہوجائے گا؟

<u>دوامی شرکت</u> آخری دفعہ یعنی (۹) میں اپنی اور اپنے وارثوں اور جانشینوں کی طرف سے دستاویز کی تکمیل و نفاذ کا ذکر ہے۔ گویا یہ شرکت دوامی ہے۔

ضمیمے میں ان چار امور کا ذکر ہے جن کے متعلق مرکزی مقننہ کو قانون بنانے اور انتظام کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ پہلے دفاع ہے۔ دوسرے خارجہ معاملات ہیں۔ تیسرے مواصلات ہیں اور چوتھے متعلقہ امور ہیں۔ لیکن ان

میں ہر ایک کی طویل تفصیل بھی ہے ۔

دفاع میں فوج کے علاوہ فوجی کارخانے اسلحہ گولی بارود اور ہر قسم کے بھک سے اڑنے والے مادّے بھی داخل ہیں ۔

خارجہ معاملات میں سفارت کے علاوہ بین الممالک معاہدات کا نفاذ بھی ہے چاہے وہ ان امور کے متعلق ہی کیوں نہ ہو جن کے لئے ریاست نے سپردگی منظور نہیں کی تھی ۔ اسی طرح تحویل ملزمین، پاسپورٹ، جلاوطنی، بیرون ہند حج و زیارت، غیر ملکیوں کو رعیت بنانا بھی اسی میں داخل ہیں ۔

مواصلات میں ڈاک تار ٹیلیفون نشرگاہیں لاسلکی پیام رسانی اور مماثل مواصلات داخل ہیں ۔ نیز ریل، جہاز، ان کے کرائے، وہاں کا اختیار سماعت، قرنطینے، بندرگاہیں، طیارے، طیارہ گاہیں، لائٹ ہاوز، مسافروں اور اسباب کا حمل ونقل وغیرہ بھی ۔

متعلقہ ضمنی امور میں مرکزی مقننہ کے انتخابات (جس میں ریاست کی نمائندگی متاثر ہوتی ہے) اور انتخابات کے سلسلے میں تحقیقات، دریافتیں، اعداد و شمار اور انتخابات میں پیدا ہونے والے نزاعات کے مقدمات کی سماعت وغیرہ داخل ہیں ۔

**متفرقات** یہ تو صریح طور پر سپرد کردہ امور ہیں لیکن عملاً ملک کی پوری زندگی متاثر ہوجاتی ہے کیونکہ زندگی کے جملہ شعبے ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک موٹی چیز کو لیجئے۔ تجارت کو ریاستوں نے مرکز کے سپرد نہیں کیا ہے لیکن آج کونسی ریاست ہے جو مرکز کی اجازت کے بغیر بیرون ہند روپیہ بھیج سکے یا پونڈ ڈالر خرید سکے یا ایسا سامان درآمد برآمد کرسکے جو نگرانی یا کنٹرول میں ہے ؟

۱۹۳۵ء کے دستور حکومت ہند کو ضروری ترمیموں کے بعد اب بھی نافذ رکھا گیا ہے ۔ اس کے تحت ریاستوں پر پچھلے سے اور بھی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں یا کردینے کا سامان ہے مثلاً عدالتی مرافعہ، بنکوں کی مرکزی نگرانی وغیرہ ۔ لیکن ان کی تفصیل اس لئے غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس قانون کی عمر چند ماہ سے زیادہ نظر نہیں آتی ۔ زیر ترتیب دستور میں دیکھنا چاہیئے کہ کیا احکام دئے جاتے ہیں ۔

غرض یہ وہ چند امور ہیں جو سرسری مطالعے میں محسوس ہوتے ہیں ۔ عملدرآمد اور نظائر کا ابھی وقت نہیں آیا ہے ۔

# منسلکہ
# دستاویز شرکت

[ریاست] ... کی دستاویز شرکت ۔

ہرگاہ قانون آزادئ ہند بابت ۱۹۴۷ء میں اس کا انتظام ہے کہ آگسٹ ۱۹۴۷ء کے پندرھویں دن سے ایک خود مختار قلمرو موسوم بہ انڈیا قائم کی جائے، اور یہ کہ قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء ان مذفیات، اضافہ جات، مناسب تغیرات اور ترمیمات کے ساتھ جو گورنر جنرل بذریعۂ حکم معین کریں قلمروے انڈیا پہ قابل اطلاق ہو؛

اور ہرگاہ قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء میں جس میں گورنر جنرل کی طرف سے مذکورہ مناسب تغیر ہو، یہ انتظام ہے کہ کوئی ہندی ریاست قلمروے انڈیا میں ایک دستاویز شرکت کے ذریعے سے جسے وہاں کے حکمران نے نافذ کیا ہو، شریک ہو سکتی ہے: اب بنا برآں میں [ریاست] ... کا حکمران میرے اس اقتدار اعلیٰ کو استعمال کرتے ہوئے جو مجھے ریاست مذکورہ میں اور اس پر حاصل ہے بذریعہ ہذا اپنے اس دستاویز شرکت کو نافذ کرتا ہوں ۔ اور

(۱) میں بذریعۂ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ میں قلمروے انڈیا میں اس ارادے سے شریک ہو رہا ہوں کہ گورنر جنرل انڈیا، قلمروی مقننہ، وفاقی عدالت اور دیگر ہر قلمروی اقتدار جو قلمروی اغراض کے لئے قائم ہو میرے اس دستاویز شرکت کے باعث لیکن بہرحال اس کے مندرجات کے تابع اور صرف قلمروی اغراض کے لئے ریاست... کے (جس کا اب آئندہ "ریاست ہذا" کے نام سے حوالہ دیا گیا ہے) متعلق ایسے وظائف انجام دے جو ان کو آگسٹ ۱۹۴۷ء کے پندرھویں دن زیر نفاذ رہنے والے قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء کے (جس کا اب آئندہ "قانون مذکور" کے نام سے حوالہ دیا گیا ہے) ذریعے سے یا اس کے تحت حاصل ہوں۔

(۲) میں ذریعۂ ہذا اس یقین دہانی کا وجوب اپنے ذمے لیتا ہوں کہ قانون مذکورہ کو ریاست ہذا میں اس حد تک نفاذ عطا کیا جائے گا جس حد تک کہ وہ میرے اس دستاویز شرکت کے باعث قابل اطلاق ہو۔

(۳) دستاویز ہذا کے ضمیمے میں معین کردہ امور کے متعلق میں قبول کرتا ہوں کہ وہ ایسے امور

ا جن کے متعلق قلمروی مقننہ ریاست ہذا کے لئے قوانین بنا سکتی ہے۔

(۴) میں بذریعۂ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ میں قلمروے انڈیا میں اس اطمینان دہانی پر شرکت کر رہا ہوں
گر گورنر جنرل اور ریاست ہذا کے حکمران کے درمیان کوئی قرارنامہ طے ہو جس کے ذریعے سے قلمروی مقننہ کے
ں قانون کے ریاست ہذا میں نفاذ کے سلسلے میں کوئی وظائف ریاست ہذا کا حکمران انجام دے تو ایسے کسی
امے کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ دستاویز ہذا کا جز ہے اور اس کی تعبیر اور اس کا اثر حسبہٖ ہی ہوں گے۔

(۵) میرے اس دستاویز شرکت کے شرائط میں کوئی تبدیلی قانون مذکور یا قانون آزادیٔ ہند
بت ۱۹۴۷ء کی کسی ترمیم کے ذریعے سے نہیں ہوگی بجز اس کے کہ اس ترمیم کو میں ایک دستاویز کے ذریعے
ے جو دستاویز ہذا کا ضمیمہ ہوگا قبول کروں۔

(۶) دستاویز ہذا کی کوئی چیز قلمروی مقننہ کو یہ اختیار نہیں دیتی کہ وہ ریاست ہذا کے لئے کوئی ایسا
انون بنائے جس کے تحت کسی بھی غرض کے لئے جبری حصول اراضی مجاز گردانا جائے لیکن میں بذریعۂ ہذا
ہ لیتا ہوں کہ اگر قلمرو کو کسی قلمروی قانون کے (جس کا ریاست ہذا پر اطلاق ہوتا ہو) اغراض کے لئے
ضروری معلوم ہو کہ کوئی اراضی حاصل کرے تو میں ان کی درخواست پر اراضی ان کے خرچ پر حاصل کروں گا۔
یا اگر اراضی میری ہی ہو تو ان کو ایسے شرائط پر منتقل کروں گا جو طے ہوں یا ان پر راضی نامہ نہ ہو سکے تو
ان کا فیصلہ ایک ایسا حکم کرے جس کا تقرر انڈیا کا میر مجلس (وفاقی عدالت) کرے۔

(۷) دستاویز ہذا کی کسی چیز کے متعلق یہ تصور نہ کیا جائے گا کہ وہ مجھے کسی طرح بھی اس بات کا پابند
رتی ہے کہ انڈیا کے مستقبل کے کسی دستور کو قبول کروں یا وہ میری اس صوابدید کو مقید کرتی ہے کہ حکومت
نڈیا کے ساتھ مستقبل کے کسی ایسے دستور کے تحت (خصوصی) انتظامات کروں۔

(۸) دستاویز ہذا کی کوئی چیز میرے اس اقتدار اعلیٰ کے جاری رہنے کو جو مجھے ریاست ہذا میں اور
ں پر حاصل ہے، یا (بجز اس طور کے جس کا دستاویز ہذا کے یا اس کے تحت انتظام کیا گیا ہے) مجھے
یاست ہذا کے حکمران کی حیثیت سے جو اختیارات، اقتدار اور حقوق اب حاصل ہیں ان کے استعمال کو، یا
سی قانون کے جواز کو جو اس وقت ریاست ہذا میں نافذ ہے، متاثر نہ کرے گی۔

(۹) میں بذریعۂ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ میں یہ دستاویز ریاست ہذا کی طرف سے نافذ کرتا ہوں
ور یہ کہ دستاویز ہذا میں میرا یا ریاست مذکورہ کے حکمران کا جو حوالہ ہو اس کی تعبیر یوں کی جائے گی
ہ وہ میرے وارثوں اور جانشینوں کو بھی شامل ہو۔

میرے ہاتھ سے آج آگسٹ انیس سو سینتالیس کے ... ویں دن (نفاذ) عطا کیا گیا۔

ثبت دستخط (حکمران)

میں بذریعۂ ہذا آگست انیس سو سینتالیس کے ... ویں دن کے مورخہ اس دستاویز کو قبول کرتا ہوں۔

شبہ دستخط گورنر جنرل انڈیا

## ضمیمہ

دستاویز شرکت سے ملحقہ ضمیمے میں ان امور کا تعین ہے جن کے متعلق قلمروی مقننہ کسی شرکت کنندہ ریاست کے لئے قوانین بنا سکتی ہے، وہ امور یہ ہیں:۔

### (الف) دفاع:۔

(۱) قلمرو کی بحری، بری اور ہوائی قوتیں اور ہر وہ مسلح قوت جو قلمرو تیار کرے یا قائم رکھے، کوئی اور مسلح قوتیں (بشمول ان قوتوں کے جو کوئی شرکت کنندہ ریاست تیار کرے یا قائم رکھے) جو قلمرو کی مسلح قوتوں کے ساتھ شریک کی جائیں یا ان کے ساتھ کام انجام دیں۔

(۲) بحری، بری اور ہوائی قوتوں کے کارخانے، چھاؤنی کے رقبوں کا نظم و نسق۔

(۳) اسلحہ، آتشی اسلحہ کی گولی بارود۔

(۴) بھک سے اڑنے والے مادے۔

### (ب) خارجہ معاملات:

(۱) خارجہ معاملات دیگر ممالک سے کئے ہوئے معاہدوں اور تہ ناموں کو جامۂ عمل پہنانا، تحویل ملزمین بشمول اس کے کہ بیرون انڈیا ہز مجسٹی کی دیگر قلمروؤں کے کسی حصے کو مجرمین اور ملزم اشخاص کی سپردگی۔

(۲) انڈیا میں آنے دینا اور وہاں سے ترک وطن اور اخراج اور اس سلسلے میں بشمول اس کے کہ انڈیا میں ان اشخاص کی نقل و حرکت کے قواعد بنانا جو برطانوی رعایا متوطن انڈیا یا کسی شرکت کنندہ ریاست کی رعایا نہ ہوں، بیرون انڈیا مقامات کی زیارتیں۔

(۳) رعیت بنانا۔

## (ج) مواصلات:

(۱) ڈاک اور تار بشمول ٹیلیفون، بے تار برقی، لاسلکی نشر اور مواصلات کی دیگر مماثل شکلیں

(۲) وفاقی ریلیں، چھوٹی ریلوں کے سوا تمام ریلوں میں حفاظت، نرخوں اور کرایوں کی انتہائی اور کم سے کم شرح، اسٹیشن کے انجام دادہ خدمات کے میقاتی مصارف، حمل ونقل (ٹرافک) کا باہم تبادلہ، اور ریلوے نظم ونسق کی ذمہ داری اسباب اور مسافروں کو لیجانے والے کی حیثیت سے، چھوٹی ریلوں کا انتظام حفاظت کے نقطۂ نظر سے اور ایسی ریلوں کی ذمہ داری اسباب اور مسافروں کو لے جانے والے کی حیثیت سے

(۳) سمندری جہازی حمل ونقل اور جہازرانی بشمول مدوجزری پانیوں میں جہازی حمل ونقل اور جہازرانی کے، امارت بحریہ کا اختیار سماعت مقدمات۔

(۴) بندرگاہی قرنطینہ

(۵) بڑی بندرگاہیں، یعنی ایسی بندرگاہوں کا اعلان اور حدبندی اور وہاں کے بندرگاہی انتظامات کی تشکیل و اختیارات۔

۱۴

(۶) ہوائی جہاز اور طیارہ رانی، طیران گاہوں کا قیام، طیران گاہوں کے ہوائی حمل ونقل کے انتظامات اور تنظیم۔

(۷) روشنی کے مینارے بشمول روشنی کے جہازوں، روشن اندازوں اور جہازوں اور طیاروں کی حفاظت کے دیگر انتظاموں کے۔

(۸) سمندر یا ہوا سے مسافروں اور اسباب کا لے جانا۔

(۹) کوتوالی کے دستے کے، جس کا تعلق کسی (خاص) وحدت سے ہو، ارکان کے اختیارات اور اختیار سماعت کا اس وحدت کے باہر کسی ریلوے رقبے تک وسعت دینا۔

## (د) ضمنی:

(۱) قانون مذکور کے اور اس کے تحت وضع شدہ کسی حکم کے احکام کے تحت قلمرو مقننہ کے لیے انتخابات۔

(۲) مذکورۂ بالا امور میں سے کسی کے متعلق قوانین کی خلاف ورزیاں۔

(۳) مذکورۂ بالا امور میں سے کس کے اغراض کے لئے دریافتیں اور اعداد وشمار

(۴) مذکورۂ بالا امور میں سے کسی کے متعلق تمام عدالتوں کا اختیار سماعت اور اختیارات لیکن (بجز اس کے کہ شرکت کنندہ ریاست کا حکمران رضامند ہو) اس طور پر نہیں کہ ریاست مذکور میں یا اس کے متعلق اختیار سماعت معمولاً جو عدالتیں استعمال کرتی ہیں ان کے سوا کسی دیگر عدالتوں کو کوئی اختیار سماعت یا اختیارات عطا کئے جائیں فقط

---

محمد حمید اللہ
شعبۂ قانون



یادداشت:

یہ مقالہ اقامت خانۂ (د)، جامعہ عثمانیہ کی سالانہ علمی کانفرنس (دسمبر ۱۹۴۷ء) میں سنایا گیا تھا.

# نغمۂ فراق

وہ دل کہاں ہے تھا جو کبھی شاد رات دن
لب پر تھا میرے نغمۂ آزاد رات دن
کاشانۂ خیال تھا آباد رات دن
فرقت میں تیری ہے نئی افتاد رات دن
اب میں ہوں اور ہے لبِ فریاد رات دن

دن سے کہیں زیادہ تھی رنگین میری رات
تو میرے ساتھ تھا تو موافق تھے شش جہات
نغموں سے میرے گونج رہی تھی یہ کائنات
ہر روز روزِ عید تھا ہر شب شبِ برات
کیا دن تھے وہ بھی کرتا ہوں میں یاد رات دن

جنگل کا ہو سماں کہ گلستاں کی ہو فضا
آبادیوں میں یا ہو وہ احباب کی سبھا
صبحِ وطن ہے آئینہ غربت کی شام کا
تیرے بغیر دل نہیں لگتا کہیں مرا
آبادیاں ہیں نظروں میں برباد رات دن

پیہم غمِ فراق سے سینہ فگار ہے
سوزِ دروں سے دیدۂ دل اشکبار ہے
ہر لمحہ زندگی کا مجھے ناگوار ہے
دل پر ہے کچھ نہ تم پہ مجھے اختیار ہے
پہلو میں دل ہے درد سے ناشاد رات دن

میرے دلِ حزیں کی تمنا کہاں ہے تو؟
میرے سرور و عیش کی دنیا کہاں ہے تو؟
مضطر ہے تیرا چاہنے والا کہاں ہے تو؟
قلبِ معین ہے غم سے دو پارا کہاں ہے تو؟
کب تک سہوں فراق کی بیداد رات دن

سید نظام الدین معین۔ بی کام (ابتدائی)

# علم ریاضی

میں اس کرسی پر بیٹھا ہوا فونٹن پن سے لکھ رہا ہوں، میرے اطراف میز، تخت، دیواریں اور دوسری ضرورت کی اشیا ہیں۔ کمرے کے باہر گلی میں موٹریں گھڑ گھڑاتی جارہی ہے، سیکلیں، تانگے وغیرہ دوڑ رہے ہیں کبھی کبھی ہوائی جہاز کی بھن بھناہٹ بھی سنائی دی جاتی ہے۔ اور جب اور دور نظر جاتی ہے تو آسمان پر تاروں اور سیاروں کا ایک عالم برپا ہے۔ ان سب پر جب میں اپنے موضوع کے نقطۂ نظر سے غور کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی معمولی صنعت، سوئی، قلم، گھڑی، موٹر وغیرہ سے لے کر تاروں اور سیاروں کے اس عظیم الشان عالم میں ریاضی اہم ترین عنصر ہے۔ اب اسی گھڑی پر غور کیجئے۔ انسانی کاموں کا تمام نظم وضبط گھڑیوں سے ہے اور ایک گھڑی تک پہنچنے کتنے انسانوں کی آنکھیں تاروں کو تکتے تکتے تھک گئیں؛ کتنوں کی فرصت کے اوقات پر مشقت سوالات پر غور کرتے کرتے کٹ گئے، کتنوں ہی کی پیشانیوں پر تھکاوٹ سے پسینہ آگیا اور کتنوں ہی نے مسلسل مشاہدہ اور غور وفکر کے بعد سورج اور زمین کی حرکت کی صحیح ترین پیمائشوں کی کوششیں کی۔ اور پھر گھڑی کے کل پرزوں کے چلنے کے لئے جو حیلی قوانین، اور پھر اس کی حرکت کی ایک مقررہ رفتار رکھنے کے لئے ان کی ترتیب وغیرہ کتنی ہی چیزیں تھیں جو محض ریاضی ہی کے ضوابط معلوم کرنے پر منحصر تھیں۔ اور بالآخر ان ضوابط کی دریافت نے اور ان کے عملی اطلاقات نے انسانوں کو اس عظیم طاقت کا مالک بنادیا ہے جسے آج ہم دیکھتے ہیں، سیکل، موٹر، ہوائی جہاز، میز، کرسی، مکان، قلم، سوئی غرض ہر انسانی صنعت کا ذرہ ذرہ اور پرزہ پرزہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہم ان مشینوں کی پیداوار ہیں، جو کتنے ہی بڑے ریاضی دانوں کی دماغی کاوشوں کے نتیجے کے طور پر یورپ، امریکہ میں دن رات چل رہی ہیں۔ اور پھر فطرت کے مظاہر نور، برق، حرارت، سیاروں کی حرکت وغیرہ کی توجیہ محض ریاضیاتی ضابطوں ہی میں بیان کئے جانے پر وقیع اور قابل نظر ہے۔ ورنہ تجاذب کا خیال مولانائے روم کی مثنوی سے بھی ملتا ہے لیکن وہ محض ایک قیاس تھا، اور اس کی عملی اور تجربی تصدیق اس وقت تک نہیں ہوسکی جب تک کہ نیوٹن نے اس کے لئے ضابطہ اخذ کیا۔

اور اس کا یہی ایک معمولی سا ضابطہ کہ تجاذبی قوت = مستقل × ک۱ ک۲ / ف۲

جہاں ک۱ اور ک۲ دو اجسام کی کمیتیں اور ف ان کا درمیانی فاصلہ ہے، اُسے بہت بڑا سائنسدان بناتا ہے کیونکہ اب ہر شخص کے لئے تصدیق یا تکذیب کے لئے ایک کھلی دعوت تھی۔ اور تصدیق کے ساتھ ہی تحقیق اور علم کی توسیع

مجلہ عثمانیہ
جلد ۳ شمارہ ۱، ۲

ساتھ ہی اس کے عملی اطلاق کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا۔ انھیں قوانین کی دریافت سے ہم نے اپنی کائنات کا نقشہ مرتب کیا ہے، اور اسی پر ہماری تمام فوقیت منحصر ہے۔ معاشیات، علم الحیل، طبیعیات، طبیعی کیمیا، انجینیری، فن تعمیر، اور دوسرے سائنسی علوم میں سے اکثروں کی تہہ میں ریاضی ہی کارفرما ہے اور ریاضی کے بغیر یہ تمام علوم افسانہ و خیالات کا ایک ڈھیر ہیں جن سے ذرہ برابر عملی کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تمدن کا تمام تر ارتقا محض ریاضی کا ارتقا ہے اور تمدن کی تمام تر چیزیں ریاضی کے مسائل کے عملی اطلاقات ہیں۔

موجودہ کیمیا داں، کیمیا گروں کی ظلمانہ کوششوں پر ہنس سکتا ہے، طبیعات داں پچھلے طبیعیات دانوں کا مضحکہ اڑا سکتا ہے، لیکن کوئی ریاضی داں کسی پچھلے ریاضی داں کو غلط ثابت کرکے اس کا مذاق نہیں اڑا سکتا۔ ریاضی میں جو چیز جن موضوعات کو مان کر ایک دفعہ ثابت ہو گئی ہمیشہ کے لئے ثابت ہو گئی۔ اس کے ثبوت کا ہر ہر قدم اتنا استوار اور ناقابل تردید ہوتا ہے کہ اس میں مزید اصلاح کی گنجائش نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں دوسرے علوم کے کسی عالم کو اپنا کافی وقت اور دماغ پچھلے عالموں کی غلطیوں کی اصلاح میں صرف کرنا پڑتا ہے لیکن ریاضی داں کیلئے پچھلے استدلالوں میں کوئی غلطی ہی نہیں جن کی اصلاح کے لئے وہ بیکار وقت ضائع کرے۔ وہ اپنا سارا وقت نئے استدلالوں اور نئی ایجادات میں صرف کر سکتا ہے اور اس طرح ریاضی میں ہر لحظہ ترقی اور وسعت کی گنجائش ہے۔

۱۸۔ "قطعیت" ہی ہے جو اُسے تمام دوسرے علوم سے ممتاز کرتی ہے جن میں قیاس، حواس اور وجدان کو عقلی استدلال پر ترجیح حاصل ہے۔

ریاضی داں کو ایک اور فوقیت یہ حاصل ہے کہ اگر اُسے ذوق ہو تو وہ اپنے مضمون کے علاوہ کسی اور مضمون کا مطالعہ بغیر کسی زیادہ وقت کے کر سکتا ہے صرف چند اصطلاحوں کا جاننا کافی ہے۔ مگر ایک تاریخ کے طالب علم یا ایک ادبیات، معاشیات، یا کسی اور مضمون کے طالب علم کے لئے ریاضی کی ابتدائی سے ابتدائی کتاب بھی ایک ایسی اجنبی زبان میں لکھی ہوئی ہے جس کا ایک جملہ بھی فہم و سمجھ سے ماورا ہے۔

وہ علوم جو خالص عقل و فکر سے تعلق رکھتے ہیں غور و انہماک بھی چاہتے ہیں۔ فلسفہ اور ریاضی کے بعض دقیق مسائل پر سوچتے سوچتے انسان بالکل کھو سا جاتا ہے اور ان ہی وجوہ کی بنا پر دوسرے انسانوں میں جنھیں شاید قدرت سوچنے کی صلاحیت عطا کرنے میں کچھ کفایت شعاری سے کام لیتی ہے اور جنھیں غور و فکر کرنا کوئی عجیب غریب مرض معلوم ہوتا ہے اور جن کی زندگی محض وقتی خواہشات اور فطری ضروریات ہی کو پورے آداب و رسوم کے ساتھ انجام دیتے رہنا ہے، وہ غائب دماغ، مجنون اور پاگل سا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان ہی لوگوں کی غائب دماغی اور پاگل پن ہے جن سے آج دنیا اتنے بے شمار فوائد سے بہرہ مند اور تاریخ کے پچھلے ادوار پر خندہ زن ہے۔

ریاضی اور فلسفہ کو ان کے انتہائی غیر جذباتی اور خالص استدلالی ہونے کی وجہ سے خشک سمجھا جاتا ہے لیکن یہ

واقعہ ہے کہ ہر مضمون کی دلچسپی اور دلفریبی محسوس کرنے کے لئے ذوق کی ضرورت ہے۔ ایک کاروباری ذہن کے لئے اقبالؔ، اور شکسپیر بھی غیر دلچسپ محسوس ہوں گے جن کا دماغ، فکر اور منطقی استدلال کے لئے خاص طور پر موزوں ہو انھیں ریاضی اور فلسفہ ہی میں انتہائی دلچسپ اور دلفریب نکتے محسوس ہوتے ہیں، اور اکثر کسی مسئلے کے اچھوتے پن ہی میں ایک عجیب لطف و مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

جو حضرات منطقی اور ریاضیاتی استدلال سے واقف نہیں وہ ان علوم کے بعض مسائل کو بال کی کھال کہتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جو چیز آشکار اور عیاں ہے پھر اس کے متعلق اور کیا ثبوت دیا جائے ع آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ لیکن آفتاب کا صرف نظر آجانا اس کے ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ آئینے میں ہزارہا چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ آئینے کے پیچھے نہیں ہوتیں۔ انسانی حواس ہمیشہ سے ہمیں دھوکا دئے چلے جارہے ہیں ستارے نور کی ٹکیاں نظر آتی ہیں بلکہ شاید کسی مشرقی شاعر کی آہوں کی چنگاریاں، آفتاب اور ماہتاب تھالی برابر نظر آتے ہیں، لیکن کیا درحقیقت وہ اتنے ہی ہیں؛ مچھلی وہاں نہیں ہے جہاں وہ نظر آتی ہے، دور کے پہاڑ جو پستہ قد نظر آتے ہیں، بہت بلند ہیں۔ غرض کتنی ہی چیزیں ہیں جن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہماری نظر، ہماری سماعت، اور ہماری "فہم عامہ" جو روزمرہ کے مشاہدات اور حواسی تجربات سے بنتی ہے ہمیں دھوکا دیتی رہی ہے، اور سائنس کا کام اسی فریب میں کارفرما حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔

19

الجبرا کا ایک اہم موضوعہ ہے ا + ب = ب + ا یعنی جمع کرنے کا عمل ایسا ہے کہ دو عددوں کو جمع کرتے میں ان کی ترتیب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس پر کوئی شخص اعتراض کرے گا کہ یہ تو "ظاہر ہے" پھر بلاوجہ اسے ایک اہم موضوعہ کے طور پر لکھنا کیا ضرور۔ لیکن ریاضی اسی "ظاہر ہے" کو کم سے کم استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اور اس "ظاہر ہے" سے جو مغالطے دئے جاتے ہیں انھیں ختم کرنا چاہتی ہے

مثلاً کوئی شخص استدلال کرے کہ کائنات میں کروڑوں ستارے اور سیارے ہیں۔ زمین ان میں ایک معمولی سا جسم ہے جس پر یہ انسان کاربن کا حقیر ذرہ ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ زندگی اتفاقی ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ یہ "ظاہر ہے" آپ کو کافی چکر میں ڈال دے گا۔ لیکن اگر میں اسی قسم کا استدلال کرکے کہوں کہ زمین اتنا بڑا کرہ ہے اور میرے ہاتھ کی گھڑی انتہائی حقیر دھات کا ٹکڑا ہے اس لئے ظاہر ہے گھڑی کا وجود اتفاقی ہے تو شاید آپ اس قسم کے استدلال کی مغالطہ دہی کو پہچان جائیں گے۔

ا + ب = ب + ا کو بطور ایک موضوعہ کے لکھنا اس لئے ضروری ہے کہ دوسرے اور اعمال مثلاً تفریق، تقسیم وغیرہ کے لئے دو اعداد کی ترتیب سے فرق پڑجاتا ہے۔ کیونکہ ا - ب ≠ ب - ا اور یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ جمع کے عمل میں دو اعداد کی ترتیب بدلنے سے حاصل ایک ہی رہتا ہے۔ کیمیائے عملی کا استاذ نصیحت کرتا ہے

کہ پانی میں سلفیورک ترشہ ملانا چاہیئے نہ کہ سلفیورک ترشے میں پانی کیونکہ وہاں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے۔

ریاضی کی ایک اور بڑی خوبی اس کی زبان کا اختصار ہے۔ ریاضیاتی زبان اختصار اور عالمگیری کی بہترین مثال ہے۔ مثلاً ایک جملہ ہے "ایک مقدار کے مربع کے چار گنے کو اس مقدار کے آٹھ گنے میں جمع کرکے ۴ جمع کرنے سے ایک اور مقدار کا مربع حاصل ہوتا ہے جو پہلی مقدار کے دگنے میں ۲ جمع کرنے سے حاصل ہوتی ہے"۔ اس طویل اور دیر میں سمجھ میں آنے والی عبارت کو ریاضیاتی زبان میں یوں لکھا جائے گا۔

$$۴\,لا^{۲} + ۸\,لا + ۴ = (۲\,لا + ۲)^{۲}$$

جس سے اس کے علامتوں کے اختصار و جامعیت کی خوبی آشکار ہو جائے گی۔

ریاضی کا طریقہ استدلال یہ ہے:- "اگر ف صحیح ہے تو ق صحیح ہے" یعنی اگر کسی شئے لا یا کوئی اشیاء لا، ما، ی۔ کے لئے کوئی دعویٰ ف صحیح ہے تو کوئی اور دعویٰ ق بھی ان ہی اشیاء کے لئے صحیح ہے۔ ف اور ق کے درمیان ایک رشتہ ہے جسے ہم باضابطہ نتیجہ کہتے ہیں۔

"باضابطہ نتیجہ" ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی تعریف نہیں کی جاتی۔ خود منطق میں یہ اصطلاح بغیر تعریف کے ایک معلومہ عام حقیقت سمجھی جاتی ہے۔ اوپر کی تعریف میں ف اور ق مفروضات ہیں جو ایک یا زائد متغیرات پر مشتمل ہیں اور جن میں اگر کوئی مستقلات ہیں تو صرف منطقی مستقلات ہیں اور منطقی مستقلات وہ تمام خیالات ہیں جو حسب ذیل الفاظ کی رقوم میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ نتیجہ، جماعت، رکن اور جماعت کا رشتہ، "ایسا ہے کہ" مفہوم، "رشتہ" کا مفہوم اور "صحیح ہونے" کا مفہوم۔

اگر ہمیں "صحیح ہونے" اور جماعت کے مفہوم سے آگاہی ہے تو ہم باضابطہ نتیجہ کو یوں سمجھا سکتے ہیں کہ اگر دو بیانات اس طرح مربوط ہوں کہ اگر پہلا صحیح ہو تو دوسرا لازماً صحیح ہو تو کہا جاتا ہے کہ دوسرا بیان پہلے کا منطقی نتیجہ ہے پہلا بیان موضوعہ اور دوسرا نتیجہ کہلاتا ہے جو بیان نتیجہ اور موضوعہ پر مشتمل ہو مفروضہ کہلاتا ہے مثلاً موضوعہ (ا) تمام ہندوستانی، ایشیائی ہیں (ب) زید ہندوستانی ہے۔ نتیجہ:- زید ایشیائی ہے۔

اگر نتیجہ واقعی موضوعہ سے لازمی طور پر نکلتا ہو تو کہا جاتا ہے کہ استدلال معقول ہے معقول نتیجہ نکالنے کا طریقہ استخراج کہلاتا ہے۔ معقول استدلال سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر موضوعہ صحیح ہے تو نتیجہ لازمی طور پر صحیح ہے۔ نیز یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اگر نتیجہ صحیح ہو تو ہم موضوعہ کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً "غور کرو" اگر ۳ = ۷ تو ۱۰ = ۱۰" یہ مانتے ہوئے کہ اگر مساوی مقداروں میں مساوی جمع کئے جائیں تو مجموعے مساوی ہوتے ہیں، یہ نتیجہ یوں حاصل ہوتا ہے۔

اگر ۳ = ۷ تو ۷ = ۳ ، ۳ + ۷ = ۷ + ۳ ∴ ۱۰ = ۱۰

استدلال معقول ہے، نتیجہ صحیح ہے لیکن موضوعہ غلط ہے۔
یعنی اگر بیان ب (موضوعہ) سے بیان ا بطور نتیجہ نکلتا ہو اور ا کو صحیح سمجھا جاتا ہو تو ب کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق ہم قطعی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتے۔
ا کا نتیجہ ب ہے" کا عکس ہے" ب کا نتیجہ ا ہے"۔ یعنی کسی مفروضہ کا عکس موضوعہ اور نتیجہ کو ادل بدل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہے کہ " ا کا نتیجہ ب ہے" معقول ہے اور نیز ا صحیح ہے تو ب لازمی طور پر صحیح ہوگا۔ لیکن معقول استدلال کا عکس لازمی طور پر معقول نہیں ہوتا مثلاً ایک معقول استدلال ہے" اگر کوئی جانور کتا ہے تو اس کے چار پاؤں ہیں"۔ اس کا عکس ہے" اگر کسی جانور کے چار پاؤں ہیں تو وہ کتا ہے"، جو ظاہر ہے کہ غلط ہے اور اس کے خلاف تمام گدھوں کو احتجاج کرنے کا حق حاصل ہے۔
باضابطہ یا استخراجی منطق :- جب ذیل مثال پر غور کرو، موضوعہ (ا) تمام لا، ما ہیں (ب) تمام ما، ی ہیں۔ نتیجہ :- تمام لا، ی ہیں
یہ مجرد استدلال معقول ہے خواہ لا، ما، ی کا اطلاق کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ان بیانات کی صحت یا غلطی کے متعلق کچھ کہنا لغو ہے جب تک کہ لا، ما اور ی کی جگہ کوئی معین اشیاء نہ رکھی جائیں۔ مثلاً لا کی جگہ انسان اور ما کی جگہ ہندوستانی رکھیں تو استدلال کی معقولیت میں تو فرق نہیں آئے گا موضوعہ (ا) غلط ہو جائے گا۔
لا، ما اور ی کی جگہ متعین اشیاء رکھنے پر ہمیں جو موضوعہ اور نتیجہ حاصل ہوتا ہے اُسے مفروضہ کہتے ہیں۔ پس مفروضہ، صحیح یا غلط یا بے معنی ہوتا ہے۔ مثلاً بیان " لا ہندوستان کا پہلا مغل بادشاہ تھا " کوئی دعویٰ یا مفروضہ نہیں ہے جبتک کہ لا کو کوئی معین قیمت نہ دی جائے۔ اگر ہم لا کی جگہ اورنگ زیب رکھیں تو غلط بیان حاصل ہوگا، اور اگر بابر رکھیں تو صحیح لیکن اگر لا = سرخ رنگ، رکھیں تو بے معنی بیان حاصل ہوگا۔
علامات، لا، ی ... جن کے ایک سے زائد معنی ہوں متغیر کہلاتے ہیں۔ متغیر، کسی جماعت کا کوئی رکن ہوتا ہے۔ یہ جماعت نہیں ہوتا، نہ جماعت کا کوئی مخصوص رکن اور نہ تصور جماعت۔ بلکہ جماعت کا کوئی بھی رکن
ایسے بیانات جن میں ایک یا زائد متغیر ہوں مفروضاتی تفاعل کہلاتے ہیں۔ جب متغیر کو کوئی مستقل قیمت دی جائے تو مفروضاتی تفاعل، مفروضہ کہلاتے ہیں اور اس صورت میں مفروضہ (۱) صحیح (۲) غلط یا (۳) بے معنی ہو سکتا ہے
ریاضیات صرف مفروضاتی تفاعل اور ان کے معقول استدلالوں سے بحث کرنے کا علم ہے۔ جب ہم کسی بیان کو صحیح یا غلط کہتے ہیں تو وہ مفروضے کے متعلق ہوتا ہے، مفروضاتی تفاعل نہ غلط ہے نہ صحیح اور نہ بے معنی جبتک کہ اس کے متغیروں کو کوئی قیمت دے کر اسے مفروضے میں نہ تحویل کر دیا جائے۔
اس طرح ریاضی کی دو اہم خصوصیات ہیں (۱) منطقی نتائج حاصل کرنا (۲) متغیروں پر مشتمل ہونا۔

متغیر کا مفہوم ریاضی اور منطق کے مشکل ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ بہرحال ریاضی کے تمام مفروضوں میں متغیر ہوتے ہیں گو بعض وقت پہلی نظر میں ان کا پتہ چل نہ سکے۔ ابتدائی حساب کو غالباً متغیروں سے پاک سمجھا جائے مثلاً ۱ + ۱ = ۲ میں نہ تو کسی نتیجہ کا ادعا ہے اور نہ کوئی متغیر ہی نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے معنی ہیں "اگر لا ایک اکائی ہے اور ما ایک اور لا، ما سے مختلف ہے تو لا اور ما دو ہیں اور اس مفروضہ میں نتیجہ اور متغیر دونوں موجود ہیں۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے "لا، ما سے مختلف ہے" کہنا ضروری ہے۔ اگر لا، ما سے مختلف نہیں تو لا اور ما دو نہیں بلکہ ایک ہی ہوں گے۔ اوپر کے مفروضے کو یوں بھی لکھا جا سکتا ہے "کوئی اکائی اور کوئی دوسری اکائی دو اکائیاں ہیں"۔ یہاں لفظ "کوئی" متغیر ظاہر کرنے کا مخصوص لفظ ہے۔ پس ریاضی کا عام مفروضہ ہے "ف (لا، ما، ی، ...) کا نتیجہ ق (لا، ما، ی، ...) ہے، لا، ما، ی ... کی خواہ کوئی قیمتیں ہی کیوں نہ ہوں، جہاں ف (لا، ما، ی...) اور ق (لا، ما، ی، ...) لا، ما، ی ... کی تمام قیمتوں کے لئے مفروضات ہیں (یعنی ف اور ق مفروضاتی تفاعل ہیں)۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا ہے کہ ف یا ق ہمیشہ صحیح ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ خواہ ف صحیح ہو یا غلط ق اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا اور زیادہ صحیح ہوگا کہ ہمیں ف، ق اور لا، ما، ی... وغیرہ کے معنی و مفہوم سے، نیز ان کے صحیح اور غلط ہونے سے قطعی بحث نہیں۔ بس ہمیں اتنی خبر ہے کہ لا، ما، ی... متغیرات ہیں، ف اور ق، ان متغیروں کے مفروضاتی تفاعل ہیں اور لا، ما، ی، ف، ق چند شرائط کے پابند ہیں۔ ان شرائط کے تحت ہم ریاضیاتی علم کو آگے بڑھاتے ہیں اور مزید چند نتائج حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے برٹرنڈ رسل ریاضی کے متعلق نیم مزاحیہ پیرائے میں کہتا ہے "ریاضی ایک ایسا علم ہے جس میں نہ ہم اس چیز کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم بحث کر رہے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ وہ سچ ہے"۔

ریاضی کے اصولوں کے عملی اطلاق کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو نتائج ایک متغیر کے لئے صحیح ثابت کئے جا چکے ہیں وہ اسی متغیر کی کسی خاص قیمت کے لئے بھی درست ہیں۔ مثلاً اگر م اقلیدسی مکان ہے تو اقلیدسی ہندسہ کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے جس میں م متغیر ہے۔ اگر ہم ساتھ ہی یہ بھی کہیں کہ "جو مکان وجود رکھتا ہے وہ اقلیدسی ہے" تو یہ موجود مکان متغیر م کی ایک قیمت ہے اور اس لئے اقلیدسی ہندسہ کے عام نتائج کا اس مکان پر اطلاق ہو سکے گا۔

"ف کا نتیجہ ق ہے" کو اگر ہم زیادہ واضح زبان میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کر سکتے ہیں کہ ریاضیات کا کوئی علم مفروضات کا کوئی مجموعہ ہے جو منطقی سلسلے کی حیثیت سے ترتیب دئے گئے ہوں یعنی اس طرح ترتیب دئے گئے ہوں کہ کسی خاص مفروضے کے بعد کا مفروضہ پچھلے چند مفروضات کا باضابطہ منطقی نتیجہ ہو۔

فرض کرو کہ ہمارے پاس اس تعریف کو پورا کرنے والے مفروضات کی ایک جماعت ہے۔ پہلا مفروضہ ظاہر ہے

کسی پچھلے مفروضے کا منطقی نتیجہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ پہلا ہے۔ دوسرا بھی اگر مفروضات کی تعداد بہت زیادہ ہو، پچھلے باضابطہ نتیجہ کے طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک مفروضے کے منطقی اطلاقات زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ کسی ریاضیاتی علم کی ابتدا، ایک یا زائد ایسے مفروضات سے ہونی چاہئے جن کا قطعی کوئی ثبوت نہیں دیا جاتا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بعض نا تعین شدہ اصطلاحات بھی ہوں گے۔ کسی لفظ یا اصطلاح کی تعریف کے لئے دوسرے الفاظ کی ضرورت ہوگی جن کا مفہوم عام العام سمجھ لیا گیا ہو۔ گویا چند الفاظ ہوں گے جن کے مفہوم کا کوئی تعین نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر ہم اقلیدس کے ہندسے کو لیتے ہیں۔

اقلیدس کا ہندسہ:۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اقلیدس کے مبادیات سے، ریاضی ایک باضابطہ علم کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقلیدس کا مقصد مکان کے خواص دریافت کرنا تھا جو چند واضح طور پر بیان کردہ موضوعوں اور بدیہیات سے نکل سکیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے تعریفوں، موضوعوں اور بدیہیوں سے ابتدا کی۔

تعریفات:۔ (۱) نقطہ وہ ہے جس کے حصے نہ ہوں

(۲) خط، طول ہے بغیر عرض کے

(۳) خطِ مستقیم، اپنے دو نقاط کے درمیان یکساں سیدھ میں رہتا ہے۔

ان تعریفات سے ظاہر ہے کہ اصطلاحات کی تعریف میں کس طرح ایسے الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے جن کا مفہوم معلوم اور واضح تصور کرلیا جاتا ہے۔ الفاظ "حصہ" "طول" "عرض" اور "یکساں سیدھ" کی کوئی تعریف نہیں۔ یہ الفاظ جب تک کہ ہم ان کے معنی و مفہوم سے اچھی طرح آشنا نہ ہوں، اصطلاح کا کوئی قطعی مفہوم پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ خود اقلیدس ان تعریفات سے مطمئن نہیں تھا اور اس نے نقطہ، خط اور خطِ مستقیم کو عام معلوم اشیاء کے طور پر قبول کرلیا۔ تعریفات صرف ان کے اہم ترین وجدانی خواص کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہیں۔

موضوعات:۔ (۱) کسی دو نقاط کو ملانے والا خطِ مستقیم کھینچا جا سکتا ہے

(۲) ایک محدود خطِ مستقیم کو دونوں سمتوں میں بے انتہا طور پر خارج کیا جا سکتا ہے۔

(۳) مرکز دیا ہوا ہو تو ایک اور نقطہ میں سے گزرنے والا دائرہ کھینچا جا سکتا ہے۔

(۴) تمام قائمہ زاویے مساوی ہوتے ہیں۔

(۵) اگر ایک سطحِ مستوی میں دو خطِ مستقیم ایک اور خطِ مستقیم سے ملیں تو جس سمت کے داخلی زاویوں کا مجموعہ ۲ قائموں سے کم ہوگا، خارج کرنے پر وہ دو خطوطِ مستقیم اسی سمت میں ملیں گے۔

بدیہیات:۔ اس کے بعد اقلیدس بدیہیات کا ایک مجموعہ دیتا ہے جو موضوعات کے مماثل ہے مگر جسے ہر علم کے

لئے درست تصور کیا جا سکتا ہے حالانکہ کے موضوعات صرف ہندسے کے لئے ہیں

(۱) وہ چیزیں جو ایک ہی چیز کے مساوی ہیں، آپس میں مساوی ہیں (یعنی ا = ب، اور ج = ب تو ا=ج)

(۲) مساویوں میں مساوی جمع کی جائے تو حاصل جمع بھی مساوی ہوں گے (یعنی ا = ب تو ا + ج = ب + ج)

(۳) مساویوں میں سے مساوی تفریق کی جائے تو حاصل تفریق مساوی ہوں گے۔

(۴) کل اپنے کسی جزو سے بڑا ہوتا ہے۔

(۵) جو چیزیں منطبق ہو جائیں مساوی ہیں۔

کوئی دو ہزار برس تک ان بدیہیات اور موضوعات کو ہماری فضا کے لئے صحیح اور واحد منطقی ہندسہ سمجھا گیا ہے۔ لیکن اب دیکھا جا رہا ہے کہ اس سے ذرا مختلف موضوعات فرض کر کے اور کئی قسم کے ہندسے بنائے جا سکتے ہیں مثلاً زائدی ہندسہ، ناقصی ہندسہ نیز اقلیدس کی بدیہیات، ریاضیات کی دوسری شاخوں کے لئے درست نہیں انھیں بھی اقلیدسی ہندسے کے موضوعات ہی گننا چاہئے۔ جیسے لامتناہی جماعتوں کے لئے بدیہی (۴) درست نہیں رہتا۔ نیز نقطہ، فاصلہ، سطح مستوی وغیرہ کے تصورات اُتنے سادہ نہیں جتنے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً دو نقاط کے درمیان فاصلہ پر غور کرو۔ جب ہم یہ کہتے ہیں تو ہمارا کیا مطلب ہوتا ہے شاید پہلے پہل پٹری سے ناپنے کا خیال آئے لیکن اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم پہلے ہی سے فاصلہ کا مفہوم جانتے ہیں کیونکہ یہ گویا فرض کرنا ہے کہ پٹری کو مساوی وقفوں (فاصلے کی اکائیوں) میں تقسیم کیا جانا ممکن ہے۔ لیکن "مساوی فاصلوں" سے کیا مراد ہے۔ یہ ذرا آسان معلوم ہوتا ہے ا اور ب کا درمیانی فاصلہ، خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ج اور د کے درمیانی فاصلے کے مساوی ہے اگر ا ب کے جوڑے کو بغیر ان کا درمیانی فاصلہ بدلے کے، اس طرح حرکت دی جا سکے کہ وہ ج، د کے جوڑے پر منطبق ہو جائے، شرط "بغیر ان کا درمیانی فاصلہ بدلے کے" یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہم پہلے ہی سے مساوی فاصلوں کے مفہوم کو جانتے ہیں "اچھی بات ہے!" کوئی کہیگا "ہمیں ا، ب کو ایک خط مستقیم سے ملانا چاہئے، تب ہم فاصلہ ا ب اور ج د کو مساوی کہیں گے اگر خط ا ب کو استوار حرکت کے ذریعہ خط مستقیم ج د کے ساتھ منطبق کیا جا سکے۔" کیا "دو نقاط کے درمیان فاصلہ" خط مستقیم ہی کے تصور کو مستلزم ہے؟ پھر اس بیان کا کیا مطلب ہے کہ دو نقاط کے درمیان چھوٹے سے چھوٹا فاصلہ خط مستقیم ہے؟ اور پھر یہ "استوار حرکت" کیا ہے۔ یہ ایسی حرکت ہے جسمیں دو نقاط کا درمیانی فاصلہ برقرار ہے۔ الفاظ بدل کر دھوکا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

۲۴

اس تمام بحث سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ لازمی طور پر ہمیں ابتدائی اصطلاحوں اور موضوعوں کو تنقید سے بالا اور بغیر کسی ثبوت کے مان کر ابتدا کرنی چاہیئے۔ اور ان کے مفہوم اور عملی اطلاق سے ریاضیات کو کوئی دلچسپی نہیں۔ ریاضیات کے کسی علم کی ابتدا کے لئے، جن موضوعوں کو بغیر ثبوت کے مان لیا جاتا ہے ان میں تین اہم خصوصیات

کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) وہ باہمی طور پر مربوط ہوں۔ (۲) ان میں کا ہر مفروضہ' دوسرے مفروضات سے غیر تابع ہو یعنی بقیہ مفروضات سے بطور باضابطہ نتیجہ نہ حاصل ہو سکے۔ (۳) مفروضات کی اس جماعت کا اطلاق' ایک سے زائد ہے۔

پہلی دو خصوصیات کا جنھیں ہم ربط اور غیر تابعیت کہیں گے ناثابت شدہ مفروضات میں ہونا لازمی ہے البتہ تیسری خصوصیت' مفروضات کے اس مجموعے کو مفید فن بناتی ہے، ورنہ ریاضیات اور شطرنج کے مقاصد میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔

ربط :- چند مفروضات کے درمیان منطقی ربط معلوم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا کوئی مقرون اطلاق (عملی مثال) بتلایا جائے۔ اگر ہم ان مفروضات کو پورا کرنے والی ایک مثال دے دیں تو ان مفروضات کے درمیان منطقی ربط ہوگا۔

غیر تابعیت :- اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا کوئی ناثابت شدہ مفروضہ' اور مفروضات سے باضابطہ نتیجہ کے طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ غیر تابعیت کا ثبوت حسب ذیل طور پر دیا جاتا ہے۔ فرض کرو کہ مفروضات کی ایک جماعت ۱' ۲' ۳' ن مفروضات پر مشتمل ہے۔ اور یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مفروضہ ک' بقیہ مفروضات کے غیر تابع ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایک ایسی مقرون مثال پیش کرنی ہوگی جس کے لئے تمام مفروضات بجز ک کے پورے ہوں' اس قسم کی مثال سے ک کی غیر تابعیت ثابت ہو جاتی ہے۔



اگر ان مفروضات کی تعبیر کئی طریقوں سے کی جا سکتی ہے تو افادی نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ کیونکہ بالآخر ہر فن اور ہر علم کا مقصد' نوع انسانی کی خدمت کرنا ہے' اور بغیر اس مقصد کے علم کا رتبہ' تفریح سے بھی گر جائے گا۔ ان خصوصیات کو ہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کریں گے۔

خطی ترتیب :- خطی ترتیب کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے ہم چند اصول وضع کرتے ہیں اور چند علامتیں استعمال کرتے ہیں جن کی تعریف یا تعین نہیں کیا جاتا۔ ہم علامت د کا استعمال کریں گے جس کا مفہوم "پہلے ہے" "کم ہے" "قدیم تر ہے" یا اور کچھ لیا جا سکے گا۔ ا = ب کا مفہوم (اسے ا مساوی ہے ب یا ا دہی ہے ب پڑھو) یہ ہے کہ ارکان ا اور ب، بحث کے دوران میں ایک دوسرے سے بدلے جا سکتے ہیں۔ رشتہ د کا مفہوم حسب ذیل مفروضات سے متعین کیا جاتا ہے۔ مساوی کی علامت کو کاٹ دیا جائے تو اسے وہی نہیں ہے پڑھو۔

جماعت ج اور رشتہ د دیا گیا ہے۔ ا' ب' ج' جماعت ج کے ارکان ہیں۔

(۱) اگر ا≠ب تب یا تو ا د ب یا ب د ا

(۲) اگر ا د ب تو ا≠ب

(۳) اگر ا د ب اور ب د ج تو ا د ج

ان سے بطور نتیجہ کے حاصل ہوتا ہے کہ اگر ا، ب جماعت کے دو ارکان ہوں تو یا تو ا = ب یا ا د ب یا ب د ا۔

اب ہم ان مفروضات میں ربط اور غیر تابعیت کی موجودگی ثابت کریں گے۔ ربط کے لئے ہمیں صرف ایک مثال دینی ہوگی جس کے لئے جماعت ج اور علامت د کے لئے یہ مفروضات پورے ہوں۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً ج طبعی اعداد کی جماعت ہو اور د کا مفہوم "کم ہے" لیا جائے۔ یا کسی خط پر کے نقاط جہیں د کا مفہوم "پہلے ہے" لیا جائے وغیرہ

غیر تابعیت ثابت کرنے کے لئے ہمیں تین مثالیں دینی ہوں گی تاکہ تینوں مفروضات ایک دوسرے کے غیر تابع ہوں۔ پہلے مفروضے کی غیر تابعیت کے لئے ہم ایک ایسی مثال دیتے ہیں جسمیں مفروضات (۲)، (۳) صحیح ہوں اور (۱) غلط۔ ج تمام انسانوں کی جماعت ہو اور د کا مفہوم "مورث ہے"۔ تو (۲) کا مطلب یہ ہوا کہ ا، ب کا مورث ہے تو ا، ب نہیں ہے۔ (۳) کا مطلب ہوا کہ اگر ا، ب کا مورث ہے اور ب، ج کا مورث ہے تو ا، ج کا مورث ہے یہ دونوں صحیح ہیں مگر (۱) اس صورت میں ہو جائے گا کہ اگر ا، ب نہیں ہے تو یا تو ا، ب کا مورث ہے یا ب، ا کا مورث ہے۔ اور یہ مفروضہ اس صورت میں غلط ہے۔

(۲) کی غیر تابعیت ثابت کرنے کے لئے ج طبعی اعداد کی جماعت اور د کا مفہوم "مساوی یا کم ہے" لو، تب طبعی اعداد سے پہلا اور تیسرا مفروضہ درست ثابت ہوتا ہے اور دوسرا نہیں۔

تیسرے مفروضے کی غیر تابعیت ثابت کرنے کے لئے د کا مفہوم "مختلف ہے" لو۔ یا اس کے لئے جماعت ج کے ارکین کو ایک دائرے کے محیط پر پانچ نقاط ا، د، ب، ع، ج مساوی فاصلوں پر لو۔ اور د کا مفہوم یہ لو کہ "سمت ساعت میں ناپنے پر کسی دو کی درمیانی قوس نصف دائرے سے کم ہے"۔ اس صورت میں (۱)، (۲) پورے ہوتے ہیں (۳) نہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مفروضات کی کوئی جماعت جو منطقی طور پر مربوط ہو خالص ریاضیات کی ایک شاخ ہے! اس طرح ہم بغیر عملی اطلاق کی پرواہ کئے مفروضات کی کروڑوں جماعتیں بنا سکتے ہیں لیکن ان میں صرف انھیں کو اہمیت حاصل ہوگی جو واقعی اپنا کوئی فائدہ مند عملی اطلاق رکھتے ہوں۔

علوم کی ترتیب میں ریاضی کا دوسرا درجہ ہے۔ پہلے منطق اور پھر ریاضی۔ ہم نے دیکھا کہ کسی ریاضیاتی علم کا انحصار صرف چند منطقی مستقلات پر ہے، اس کے علاوہ ریاضی اپنی ترقی اور توسیع میں کسی اور علم کی رہین منت نہیں۔ ریاضی، آرٹ سے متعلق ہے کیونکہ اس کا تانا بانا، خالص ذہن پر منحصر ہے اور تجربات کی وہ محتاج نہیں۔ چند مفروضات

کویے کرہم کسی ریاضیاتی علم کی بنیاد ڈالتے ہیں اور خالص استدلال سے اس پرایک عالیشان عمارت کھڑی کردیتے ہیں جس میں خارجی خام مسالہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ریاضی تمام سائنسی علوم کی جان ہے۔ اس طرح ریاضی کا بیج آرٹ کی زمین میں بویا جاتا ہے مگر اس کی نشوونما سائنسی فضا میں ہوتی ہے۔

ریاضی کی اپنی ایک علٰحدہ جمالیات ہے۔ اس علم کی نوک پلک اتنی درست اور نازک نقشہ اس احتیاط اور سجاوٹ سے بنایا جاتا ہے کہ اس کے کسی مسئلہ کی خوبی اور باریکی میں غرق' با خبر انسان گھنٹوں کھو جاتا ہے۔ ریاضی کا حسن شاعری کے حسن کی طرح گرم' جذباتی' اور ولولہ انگیز نہیں بلکہ سرد' سنجیدہ اور بارعب ہے۔ تمام جذباتی آبگینوں سے بلند کیا ہوا خالص عقلی حسن جو انسان کے کسی کمزور حصے کو اپیل نہیں کرتا۔ جس میں موسیقی اور تصویر کی طرح آوازوں اور رنگوں کی گوناگونی اور دلآویزی نہیں بلکہ مجسمہ سازی کی طرح ٹھوس تکمیل' اور کائنات کی طرح مکمل ہم آہنگی۔ ایک ایسا علم جس نے ہر زمانے کے ہر بڑے فلسفی اور مفکر کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ جس نے کائناتی قوانین' زماں و مکاں کے ضوابط تسلسل' لامتناہی کُل اور حرکت وغیرہ جیسی دقیق اور سخت گرہوں کو کھولا ہے جن کو کھولتے ہوئے فلسفہ کے ناخن ٹوٹ کر گر پڑے ہیں۔

محمد معین الدین صدیقی
متعلم ام۔ اے (آخری)

# غزل

ایک راز تھا جس کو کہہ نہ سکے اک بھید تھا ہم بتلا نہ سکے
خاموش رہے اور ضبط کیا آنسو آئے ڈھلکا نہ سکے

جذبات کا اک طوفان اٹھا ہم دامنِ دل لہرا نہ سکے
مضراب نے ہلکی جنبش کی پر تار جو ٹھٹکے تھرا نہ سکے

یاں غیروں کا تو ذکر ہی کیا اپنے کو جب اپنا نہ سکے
اس بختِ رسا کا کیا کہنا وہ آتے آتے آ نہ سکے

بچپن تو کٹا ہنستے ہنستے اور رو رو جوانی بیت گئی
اب پیری میں ہم ڈھونڈیں کیا جو ڈھونڈا تھا وہ پا نہ سکے

اب کوششِ عرضِ حال سے کیا اور جرأتِ قیل و قال کہاں
دل روتا رہا آنکھیں نم تھیں افسوس انھیں پرچا نہ سکے

"اب اپنا کسی پر زور نہیں وہ اگلا سا اب دور نہیں"
اف لذتِ طعن عشوہ گری ہم حالتِ دل دکھلا نہ سکے

وہ اُن کی ادائے جلوہ گری کیا کہیے بیاں اک کی بتی
وہ آ نہ سکے تو یہ اُجڑی جب یہ اُجڑی وہ آ نہ سکے

پتھرا گئیں آنکھیں مست و پا شل ہو گئے راہِ قاصد میں
اب پیکِ اجل ہے عزم اس کا وہ خط لایا ہم پا نہ سکے

یہ دل کی دھڑکن، مایوسی، یہ آنکھیں نم یہ انکا کرم
کیا کہیے نادرؔ شکوۂ دل ہم تابِ کرم بھی لا نہ سکے

ضیاء الدین نادر
بی ایس سی (ابتدائی)

# سماج سازی اور تقلید پسندی

تہذیب و شائستگی کی بقا، اور منتقلی کا ذریعہ تقلید پسندی ہے۔ تارد نامی ایک فرانسیسی محقق نے تقلید پسندی پر اتنا زور دیا کہ صرف تقلید پسندی کی جبلت کو سماج سازی کا اہم ترین ذریعہ قرار دیا ہے۔

ہم اپنے آس پاس ہونے والے روز آنہ کے بیسیوں واقعات بلکہ اپنی ذاتی زندگی کی کئی مثالوں سے تارد کے خیال کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہماری بہت سی عادتیں اور خصلتیں تقلید پسندی کا نتیجہ ہیں۔ خود زبان بھی اسی جبلت کی وجہ سے سیکھی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے جن آوازوں کو سنتے ہیں، ان سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اس سے زیادہ آوازوں کو دہرانے کی کوشش کرتے ہیں جب ان سہل ترین آوازوں کو بھی وہ ادا کرنے سے مجبور ہوتے ہیں تو وہ ان کی قریب ترین آوازیں نکالتے ہیں جنھیں ہم تتلانا کہتے ہیں جیسے جیسے وہ سیانے ہوتے جاتے ہیں، آوازوں کی نقل بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں اور ہر مخصوص آواز کو ہر مخصوص چیز سے تعبیر کرتے ہوئے زبان کے ذریعہ ماحول کا پہلا اثر قبول کرتے ہیں۔

جس چیز سے پیاس بجھتی ہے اس کو اُردو میں پانی، ہندی میں جل، فارسی میں آب، انگریزی میں واٹر جرمن میں واسر اور تلنگی میں نیل کیوں کہتے ہیں؟ اس کا صرف ایک جواب ہے۔ بچپن میں ہم نے پانی کو پانی کہتے سنا۔ اس لئے ہم نے پانی کہنا شروع کیا دوسروں نے اسی چیز کو دوسری آوازوں سے منسوب ہوتے سنا اس لئے انھوں نے بھی وہی آوازیں ادا کیں۔ پانی کو پانی کہنے کی کوئی منطقی وجہ نہیں۔

یہ محض اتفاق ہے کہ پیڑیوں سے ہم ۱، ۲، ۳، ۴ کو ایک دو تین چار سنتے کہتے چلے آئے اگر ہم ۱، ۲، ۳، ۴ کو چار، تین، دو، ایک کہتے ہوتے تو ہم کہتے "ہر شخص کے چار ناک، تین آنکھیں، تین کان، اور تین پانو ہوتے ہیں" بھینس کے ایک پانو ہوتے ہیں، اسی طرح ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ کی شکلیں محض اشارے ہیں۔ اگر ہم ۷ کو ۵ اور ۵ کو ۷ لکھنا شروع کریں اور ہر شخص اس کی تقلید کرنے لگے تو ہم کہہ سکیں گے اور لکھ سکیں گے کہ "ہر ہاتھ میں ۷ انگلیاں ہوتی ہیں" یا "رشی کمان میں ۵ رنگ ہوتے ہیں، اس لئے اس کو بیچ رنگی کہا جاتا ہے۔ جس طرح اعداد اشارے ہیں، اسی طرح حرف بھی اشارے ہیں، آوازیں بھی اشارے ہیں، زبان میں منطقیت نہیں ہوتی۔ چند لفظوں کو چھوڑ کر جو قدرتی آوازوں کی نقل ہوتے ہیں جیسے کڑکنا گرجنا، میاؤ میاؤ یا غٹرغوں کرنا، ٹرانا، پھنکارنا، جھنجھنانا، کڑکڑانا، ہنہنانا، تقریباً تمام الفاظ

سن مانی آوازیں ہیں جو رواج پاکر مخصوص معنی اختیار کرتی ہیں اور یہ تقلید ہی کا کرشمہ ہے کہ بے معنی آوازیں معنی دار لفظ بن جاتی ہیں۔

جس طرح ہم زبان و ادب میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں اسی طرح تمام تمدنی معاملوں میں دوسروں کی نقالی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے کردار کی توجیہ کرتے ہوئے صرف یہ کہتے ہیں "ہمیں کیا معلوم؟ بزرگوں کا یہی طور طریق تھا، اس لئے ہم نے بھی نبھایا"

انتہائی معصومیت اور بھولے پن کا یہ منظر کس قدر دلفریب ہوتا ہے۔ جب دو ڈھائی سال کا بچہ اپنی ماں کو نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر خود بھی نماز پڑھنے کھڑا ہوجاتا ہے، ماں رکوع میں جاتی ہے تو خود بھی رکوع میں جاتا ہے۔ ماں سجدہ کرتی ہے تو خود بھی زمین پر پیشانی رکھتا اور جھٹ کنکھیوں سے ماں کو دیکھتا ہے اور جہاں تک اس سے بن پڑتا ہے نماز کے حرکات و سکنات کی پوری نقل اتارتا ہے۔ مذہب زدہ معتقدین کہیں تو کہیں کہ بچہ بھی خدا کی ہمیشہ رہنے والی ہستی سے مرعوب ہوکر بے زبان جانداروں اور پرندوں بلکہ پھولوں اور کلیوں کی طرح پرماتما کی بارگاہ میں اپنی عبدیت کا اعتراف کرتا ہے مگر تارد اور اس کے حامیوں کے نزدیک سماجیات اور سماجی نفسیات کے جاننے والوں کے لئے یہ محض انسان کی فطری جبلت تقلید کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ہر گھرانے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ساڑھی پہننے یا دوپٹہ اوڑھنے کے شوق کو ظاہر کرتی ہیں اور ان کے حاصل کرنے کے لئے لاڈ پیار، خوشامد، اور تقاضے کرتی اور کبھی کبھار مچلتی ہیں انھیں ساڑی یا دوپٹہ نہ بھی ملے تو توال کو ساڑی کی طرح لپیٹنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یا دوپٹے کی طرح استعمال کرتی ہیں۔

مغربی تہذیب اور آداب سے جو نوجوان واقف ہیں اور کسی کام یا تعلیمی غرض سے یورپ جاتے ہیں انھیں بیسیوں معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے دشواری ہوتی ہے۔ وہ ہر انوکھی بات کے کرنے یا نہ کرنے میں اٹکتے جھجکتے اور آخر کار دوسروں کی تقلید کرتے ہیں، اسی قسم کے ایک صاحب جہاز پر سفر کر رہے تھے بیرونی ملکوں کا پہلا سفر تھا اور مغربی سماج سے پہلے پہل مڈبھیڑ ہورہی تھی، کھانے کے وقت انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سیدھی جانب چار چھریاں، بائیں جانب چار کانٹے سامنے تین مختلف سائز کے چمچے، رکابی پر رکھا دھری ہے اس کے قریب الٹا گلاس اور نیپکن سب قرینے سے جمائے گئے ہیں۔ مگر لطف یہ کہ کھانا ندارد! یہ بھی اچھی کی بات تھی کہ کھانے کے لئے علٰحدہ کمرہ ہوتا ہے۔ اور کھانے کے وقت بلانے کے لئے گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ مین کھانے کے وقت دامن پر نیپکن ڈال لیتے ہیں گویا ہم بچے ہیں! جب سوپ آیا تو انھوں نے چھوٹا چمچہ مگر یہ دیکھ کر کہ بقیہ سب لوگ بڑے چمچے سے سوپ پی رہے ہیں جھٹ چھوٹا چمچہ چھوڑ بڑا چمچہ اٹھالیا۔ یورپ کی تہذیب کا یہ منظر دیکھ کر انھیں اچنبھے پر اچنبھا ہو رہا تھا کہ جہاں ایک چیز ختم ہوئی کہ رکابی بدلی جاتی

بھلا اس طوالت کی کیا ضرورت ؟ مانجھنے کے لئے برتنوں کی یہ جھنجھٹ مفت کی دردسری ہے ! کھانے میں آخر ہر چیز کی کھٹ کھٹ کیوں ؟ مچھلی کھانے کے علیحدہ چھری کانٹے استعمال ہوتے ہیں، گوشت ترکاری کے لئے علیحدہ اور پھل کاٹنے کے لئے جداگانہ، سب سے بڑی آفت تو یہ ہے کہ ہر مرتبہ سرونگ کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کے ذہن میں ہندوستانی دعوتوں کا نقشہ اُتر آیا اور انھوں نے خیال کیا کہ کیا اچھا طریق ہے کہ سب کھانے پینے کی چیزیں پہلے ہی سے دسترخوان پر رکھ دی جاتی ہیں۔ روٹی، چانول، پلاؤ، شیرمال، شکپور، سالن، چٹنی، میٹھا سب قرینہ سے چن دئے جاتے ہیں جس کا جہاں جی چاہے بیٹھ جاتا اور جی بھر کر کھاتا ہے۔ نہ انتظار کی کوفت، نہ کانٹے چھری کی علت، چمچے نہ بھی ہوئے یا کم ہوئے تو بسم اللہ کہہ کر آستیں چڑھائی پانچوں انگلیاں پلاؤ میں آتار، ہاتھ بھر بھر کر چانول لے لئے، کٹورے میں سے سالن انڈھیل لیا، ہاتھ بڑھا کر شکپور سمیٹ لیا، انگلی سے چٹنی چاٹتے رہے۔ مزے لے لے کر میٹھا کھایا اور اُٹھ کھڑے ہوئے، اُٹھتے اُٹھتے بھی چٹنی چاٹتے ؛ نہ کھانوں میں ترتیب کی قید نہ ایٹی کیٹ کی مصیبت !

مشرقی اور مغربی تہذیب کی ٹکر سے جب ایسی متضاد صورتیں پیدا ہوتی ہیں تو ہر شخص کی رہبری خود اس کی یہ جبلت کرتی ہے کہ جیسا دوسروں کو کرتا دیکھو، ویسے خود بھی کرو۔ تمدنی زندگی کی یہ اصلیت ہے کہ ہم نہ صرف دوسروں کی تقلید کرتے ہیں بلکہ دوسرے بھی ہماری تقلید اور نقالی کرتے ہیں۔ جب کبھی کوئی نئی بات دریافت ہوتی ہے یا کوئی تجدید و اصلاح، یا ترمیم و تبدیلی کی جاتی ہے تو وہ اسی وقت کامیاب تصور کی جاتی ہے جب دوسرے اس کی تقلید اور نقل کریں !



نقل اور تقلید کے بغیر کوئی بھی ایجاد، کوئی بھی سدھار، کوئی سا اصول غیر اہم اور بے جان رہتا ہے۔ بہترین سے بہترین سدھار کیجئے کوئی اسے اختیار کرے یا نہ کرے تو بیکار ثابت ہوتا ہے۔ فیشن میں پہل سی پہل تبدیلی کیجئے دس پانچ پیروی کرنے لگیں۔ ان کی بدولت سینکڑوں، سینکڑوں کے طفیل سے ہزاروں تقلید کریں اور نیا فیشن چل پڑے تو وہی کارآمد یا کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ سرمد نے برہنگی کی خاطر جان تک دے دی۔ اور اپنے اصول کے لئے خود کو قربان بھی کر دیا مگر ہندوستانی تہذیب پر سرمد کے سماجی تخیلات کا مطلق اثر نہ ہوا، سرمد سے پہلے اور سرمد کے بعد بیسیوں ہندو گوسائیوں اور سنیاسیوں نے تیاگ کے تحت کپڑے وغیرہ چھوڑ کر ننگ دھڑنگ پھرتے رہے اور پھرتے ہیں مگر پھر بھی برہنگی بہت بڑا عیب سمجھی جاتی ہے کیونکہ عام طور پر ننگے پن کی تقلید نہیں کیجاتی۔ اس کے برعکس یورپ میں برہنگی کی تحریک مستقل طور پر زور پکڑ رہی ہے۔ سماجی تقریبوں میں اور اس سے بہت زیادہ اشنان گھاٹوں پر بے لباسی اور برائے نام ملبوسیت رہ گئی ہے۔ پہلے پہل جس نے کم لباسی اختیار کی اس پر طعن کئے گئے اُسے آوارہ کہا گیا۔

پولیس اور حکومت نے قیدیں عائد کیں مگر جیسے جیسے اشنانی لباس مختصر ہوتے ہوتے تقریباً مفقود ہو گیا

مخالفتیں کم ہوئیں اور عام تقلید کی وجہ سے حکومتی مداخلت بھی نہیں رہی۔

ہر مصور نقشہ کشی اور رنگوں کی آمیزش میں ہر شاعر اور ادیب نظم و نثر میں دوسروں کی تقلید کرتا ہے مصوری کے مختلف طریقوں میں چینی جاپانی طریق قدیم ہندوستانی طریق، قدیم مصری طریق اور یورپی سب نمایاں ہیں۔ یورپی مصوری میں بھی کلاسیکی طریق اور جدید اظہاریتی طریق میں بھی نمایاں فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی تصویر کو دیکھ کر فنی ماہر اور مستند نقادوں کا کیا ذکر عام پڑھے لکھے اور مصوری سے معمولی دلچسپی اور واقفیت رکھنے والے لوگ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فلاں تصویر کس ملک یا فنی مدرسے کی ہے۔ فنی ماہر اور مستند نقاد ہر دور کی مصوری بلکہ ہر بڑے مصور کی تصویر پہچان سکتے ہیں۔ حد و انتہا یہ کہ خصوصی ماہر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ فلاں مصور نے فلاں تصویر اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں کھینچی تھی بیچ دور میں یا آخری زمانے میں؟ کیوں کہ ہر ملک و زمانہ کی خصوصیتیں مختلف ہوتی ہیں اور ہر شخص ان کی تقلید کرتا ہے۔

جو حال مصوری کا ہے وہی نقاشی، بت گری، فن تعمیر، خوش خطی، شاعری، موسیقی، طریق تعلیم، فن کاری صنعت و حرفت، ملازمت، تجارت، حکومت، سیاست، حد و انتہا یہ کہ جنگ اور عاشقی کا ہے۔ شجاعت و دلیری کا اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ دشمن کے سامنے تلواریں یا پستول رکھ کر پہلے اسے موقع دیا جائے کہ جو بھی ہتھیار



چاہے لے لے، اب تو نفسیاتی جنگ کاری کے نام سے جھوٹ، فریب، دغابازی، پریشان بیانی کی جاتی ہے۔ جراثیمی جنگ کاری ہوتی ہے اور کھانے پینے کی چیزوں کے ذریعہ جراثیم پھیلائے جاتے ہیں یا دوسرے طریقوں سے تکلیف دہ اور خطرناک بیماریاں پھیلائی جاتی ہیں۔ ناکہ بندی کے ذریعہ بھوکا ڈالا جاتا ہے! رہائشی محلوں کو برباد کر کے سراسیمگی پھیلائی جاتی ہے، دہشت انگیز خبروں کا پرچار کیا جاتا ہے، خوف اور بوکھلاہٹ بڑھائی جاتی ہے۔ ان سب کا نام اعصابی جنگ رکھا گیا ہے۔ پانچویں کالم کے ذریعے غداری اور قوم فروشی بے وفائی اور ملک دشمنی کی ترغیب اور پیش بندی کی جاتی ہے۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد شرمانا تو بڑی بات ہے کسی کو خیال تک نہیں آتا کہ جنگ کے یہ طریقے جائز نہیں۔ موجودہ زمانے میں لڑائی دو بہادروں کی لڑائی نہیں رہی، دو غرضمندوں کی لڑائی ہو گئی ہے جو کسی طرح ہو جیتنا چاہتے ہیں، نئی دنیا اور نئے زمانے نے اس اصول کو مان لیا ہے، عشق اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔ تمام قومیں اسی اصول پر عمل کرتی ہیں، خود ہارنے والی بھی دل ہی دل میں حسرت کرتی ہیں کہ کاش "کسی طرح بھی جیت جائیں"۔

بہر حال اچھائی ہو یا برائی، علوم ہوں یا فنون، کھیل ہوں یا مشغلے ترقی کا تعین ہو یا تنزل کا، کامیابی اور ناکامی کا تعلق اور دونوں کا انحصار تقلید پر ہے۔ جس چیز کی تقلید کی گئی اور جس حد تک اس کی تقلید کی گئی، اسی نسبت سے وہ کامیاب قرار پائی اور معکوس صورت میں ناکام تصور کی گئی۔

تقلید کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ لوگ جن باتوں کی تقلید کرنے کے عادی ہوتے ہیں انھیں ترک کرنا یا ان میں تبدیلی کرنا پسند نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ عام طور پر جسے سدھار کہتے ہیں وہ چند معمولی تبدیلیاں ہوتی ہیں جسے انقلاب کہا جاتا ہے وہ چند نمایاں تبدیلیاں ہوتی ہیں سولہ آنے یکلخت تبدیلی کسی ملک کے کسی دور تاریخ میں نہیں ہوئی نہ سیاست میں نہ حکومت میں نہ سماج میں نہ مذہب میں! دو چار ترمیموں کا نام تجدید ہے اور آٹھ دس کا انقلاب[1]۔

دنیا کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں دی جا سکتی جب کہ تمدنی زندگی کے ہر شعبے میں یکلخت تبدیلیاں ہوئی ہوں۔ لباس کی حد تک یہ تو ممکن ہے کہ ہم انگرکھے اور ڈھیلے پاجامے کو آہستہ آہستہ ترک کریں اور چوڑی دار پاجامے یا شلوار یا دونوں کی بجائے پتلون نما پاجامے شروع کریں، مگر یہ ناممکن ہے کہ ہم موجودہ پہناوا چھوڑ کر زنانہ لباس اختیار کریں! ساتھ ہی زبان میں یکلخت "سدھار" کر کے زنانی گفتگو ترک کریں اور مذکر اور مونث کی فرضی تفریق کو مٹا کر تمام بے جان چیزوں کو یکساں طور پر استعمال کریں۔ سچ پوچھیے تو یہ بالکل چھوٹی سی بات ہے کہ ہم چاند سورج، کان، مجمع، قلم فلک وغیرہ کو مذکر اور صورت، ناک، زمین، بھیڑ، میز کو مونث تصور کر کے محض مفروضہ باتوں کی بنا پر زبان کی پیچیدگیوں میں اضافہ کریں۔ جاگیردار اور کسان، مالک کارخانہ اور مزدور، سرمایہ دار اور نہتے محنتی، ان کے باہمی اختلافوں کو مٹانا معاشی انقلاب ہوگا۔ دنیا کا سب سے بڑا انقلابی حاکم یا شاعر اگر مروجہ زبان ہی میں یکلخت تبدیل کرنا چاہے اور زنانی گفتگو کرے یا زنانہ طریقے سے تخاطب کرے اور اس پر طرہ یہ کہ زنانہ لباس پہننا شروع کرے تو وہ انقلاب کو قریب تر لانے کی بجائے دور تر کر دے گا۔ اس کا لباس، اور اس کی زبان، اس کی ہنسی اڑائے جانے کا باعث بنیں گے، لوگ اسے پاگل سمجھیں گے۔ اور ایسے "انقلابی" شاعر سے پنپتی ہوئی تحریک کو بھی نقصان پہنچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے انقلابی جو سیاسی تبدیلیوں کے درپے ہوتے ہیں، سماجی اور مذہبی خرابیوں کو خاموشی سے گوارا کرتے ہیں، جو لوگ سماج سدھار کے درپے ہوتے ہیں یا زبان و ادب یا سیاست و حکومت میں اہم تبدیلیاں کرنا چاہتے ہیں یا شاعری یا ادب کے رجحانوں کو بدلنے کی جان توڑ کوشش کرتے ہیں وہ سماج سدھار یا مذہبی تبلیغ کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ تن تنہا یا وقت واحد میں ہر جہتی انقلاب نہیں کر سکتے۔ کوئی پروفیسر جو اپنے علم کے مانے ہوئے اصولوں سے بغاوت کر رہا ہو، کوئی واعظ

---

[1] خاص کر ہمارے ملک میں انقلاب کے معنے صرف سیاسی تغیر و تبدل کے لئے کئے جاتے ہیں۔ تمدنی انقلاب چونکہ یہاں ہوتا ہی نہیں یا ایک عرصے سے نہیں ہوا اس لئے انقلاب صرف سیاسی مفہوم میں تھوڑی بہت اہمیت رکھتا ہے اس لئے ضروری نہیں کہ حکومت یا طرق حکومت میں تبدیلی ہو۔ غیر حقیقی طور پر صرف ایک حاکم کا ہٹنا ہمارے ملک میں "انقلاب" کہلاتا ہے! کسی دفتر کے ناظم، کسی کالج کے پرنسپل کسی سررشتہ کے افسر کا ہٹایا جانا یقینی "انقلاب" ہے گویا ایک فرد ہٹ جائے اور دوسرا آ جائے مگر پرانا دستور بدستور قائم رہے تو یہ بھی انقلاب ہے۔ "انقلاب زندہ باد"

بالکل جو اپنے فرقے یا پیشے میں اہم تبدیلیاں کرنا چاہتا ہو کبھی ایسی تجویزیں نہیں پیش کرے گا۔ جو مقامی عوام کی تہذیب وتمدن کے ہراول دستے اور ہر شعبے کے مانے ہوئے اصولوں کے برعکس یا بالکل مختلف ہوں۔ ہر حتمی انقلابی تجویزیں جگ ہنسائی کا باعث ہوں گی اور جگ ہنسائی ناکامی کا پیش خیمہ ہے عام طور پر لوگ جن چیزوں کے عادی ہوتے ہیں اور جن باتوں کی تقلید کرتے کرتے اس سے مانوس ہو جاتے ہیں اسی کو فطری سمجھتے ہیں وہ اس خیال میں اتنے کھوئے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس کے سوا کسی اور طریق کے وجود کے بھی قابل نہیں ہوتے۔

نقل وتقلید کا اثر نہ صرف نمایاں اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس پابندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نمودار ہونے، پھیلنے اور زور پکڑنے کے بارے میں پیش قیاسیاں اور متوقع خیال آرائیاں کی جاسکتی ہیں۔ یہ پیش خیالات نری قیاس آرائیاں نہیں ہوتیں بلکہ معقول توقعات پر مبنی اصول ہوتے ہیں جنھیں قوانین کا مرتبہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان قوانین میں قطعیت اور منطقیت نہیں ہوتی مگر ان کا دائرۂ اثر اتنا وسیع اور ان کا طریق اتنا باقاعدہ ہوتا ہے کہ ہم ان قوانین کو شبہ فطری ( Quasi Natural ) کہہ سکتے ہیں۔

۴۴ اگرچہ تقلید کے بارے میں اکثر قوانین فرانس کے تارد نامی عالم ومفکر کے بیان کردہ ہیں مگر ان میں نقلی ردوبدل کرکے ان کی اہمیت بڑھادی گئی ہے۔ تقلید کے قانون چاہے کسی کے ہوں اس میں شک نہیں کہ ان میں صحت پائی جاتی ہے۔

## تقلید کے قانون

تقلید کا ایک قانون تو یہ ہے کہ

" بالعموم اقلیت اکثریت کی، محکوم حاکموں کی، چھوٹے بڑوں کی،
ماتحت افسروں کی، غریب امیروں کی، نیم تربیت یافتہ مہذب
لوگوں کی، اور گنوار شہریوں کی تقلید کرتے ہیں "

انگریزی کی کہاوت ہے کہ "روما میں رومیوں کی طرح عمل کرو" کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں تعداد میں بہت فرق ہوتا ہے تو عام صورتوں میں کم تعدادی جماعت کثیر تعدادی جماعت کی تقلید کرتی ہے۔ جب تک ہندوستان میں مسلمان برسر حکومت رہے، حاکمیت کے کرشمے سے سب لوگ مسلمانوں کی تقلید کرتے رہے، خاص کر وہ جو حاکموں کے قریب تر تھے اور ان سے براہ راست تعلق رکھتے تھے، یہ لوگ مسلمانوں کا پہناوا پہنتے تھے، ان کی زبان سیکھتے تھے اور انھیں کے رسم و رواج اختیار کرتے تھے۔ ابھی حال حال تک آگرہ اور اودھ کے متحدہ صوبائی علاقوں میں (جو مدتوں تک مسلمانوں کی تہذیب و حکومت کا مرکز تھا) بیسیوں ہندو عربی اور فارسی شوق سے سیکھتے تھے جن

میں بعض صاحب کمال نکلتے تھے ۔ اب بھی یورپ اور دکن کے مقابلے میں کئی یو پی کے ہندو ملیں گے جو فارسی سے واقفیت رکھتے ہیں، قدیم تہذیب کے متعدد ہندو گھرانے کے معززوں کو میں نے دیکھا ہے کہ جب کبھی وہ گھر سے باہر جاتے ہیں تو قدیم ہندوانی پوشاک کی بجائے پاجامہ اور شیروانی پہنتے ہیں۔ اسی قانون کا عالم گیر اثر ہے کہ آج ہندو مسلمان، سکھ، پارسی، یہودی، عیسائی مغربی لباس شوق سے اختیار کرتے ہیں اور مذہبی قومی تقریبوں کو چھوڑ کر تمام سماجی، معاشی اور ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ سیاسی موقعوں پر سوٹ پوش ہوتے ہیں اور کتنے ہی ہندو مسلمان ہیں جو مغربی تقلید پرستی میں اتنے کھوئے ہوئے ہیں کہ وقت بے وقت اور موقع بے موقع مغربی تہذیب کو ترجیح دیتے ہیں

تقلید کا ایک اور قانون ہے :

" جس اصول یا قاعدے کی تقلید میں نفس کا لبھاؤ زیادہ ہوگا اسی قدر تقلید کرنیوالوں کی رغبت اور تعداد زیادہ ہوگی "

اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ

" جس اصول یا قانون کی پابندی میں جس قدر زیادہ نفس کشی درکار ہوگی، اسی قدر تقلید کا دائرہ محدود اور اثر سطحی ہوگا "

یہی وجہ ہے کہ مغرب کی برائیاں ! سگریٹ نوشی اور ناچ، شرابی محفلیں اور مخلوط پارٹیاں، فیشن پرستی اور ٹھاٹھ پسندی مشرقی ملکوں اور علاقوں میں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں مگر مغرب کی خوبیاں ! وقت کی پابندی عام تعلیم اور اعلیٰ کارکردگی، نفاست پسندی اور منصوبہ بندی، سیاری تحقیق اور علمی و اسنگی، عملی ہمدردی اور مفید تنظیم بہت ہی کم لوگوں کی تقلید کا باعث ہوئیں۔ روز ازل سے عام مطالبے اور عوامی مطالبے دو رہے ہیں: لذیذ چیزیں اور تماشے ! تن بدن کو سکھ پہنچانے والی یا من بھلاوے کی کوئی چیز ہو تو اسے اختیار کرنے میں کیا دیر لگتی ہے ۔

تقلید کا تیسرا قانون ہے :—

" جن لوگوں میں احساس کمتری ہوتا ہے وہ اپنے سے حقیقی یا تصورہ برتر لوگوں کی تقلید کرتے ہیں "

کمتری کا احساس غلامانہ ذہنیت کی ایک قسم اور نفسیاتی بیماری ہے۔ اس کی وجہ سے انسان بلا وجہ خود کو دوسروں سے کمتر یا زیادہ نا اہل تصور کرتا ہے ۔ کمتری کے احساس کے تحت جو تقلید ہوتی ہے وہ نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر کی جاتی ہے ۔۔

تقلید کا چوتھا قانون ہے:

"حقیقی اور عملی تقلید سے پہلے دل ہی دل میں تقلید شروع ہوتی ہے"

یعنی عملی تقلید سے پہلے تقلید کی خواہش و حسرت ہوتی ہے ہر شخص اپنے اپنے حوصلے اور جرأت کے مطابق کچھ نہ کچھ عرصہ تک کروں یا نہ کروں کے ادھیڑبن میں مبتلا رہتا ہے۔ مولویانہ نوجوان جب ڈاڑھی مونچھ منڈانے والوں کو حسرت سے دیکھنے لگتے ہیں تو ان میں خواہش تقلید پیدا ہوتی ہے وہ اپنی جگہ ڈاڑھی سے شرمانے لگتے ہیں اسے غائب کر دینے کا خیال رہ رہ کر پیدا ہوتا اور انھیں بیقرار کرتا ہے۔ ایسی گہری خواہش کے پیدا ہونے کے بعد تقلید کا دیر سویر عملی طور پر ظاہر ہونا لازمی ہے۔

تقلید کا ایک اور قانون ہے

"واسطوں سے گزرتے ہوئے اصل رسم و رواج یا اصل اصول منحرف ہو جاتے ہیں"

تب ہی تو اصل اور نقل میں فرق ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم مغرب کا کوئی طریق اختیار کریں اور وہ تمام و کمال ہمارے ہاں ویسا ہی ہو جیسا کہ یورپ میں ہے۔ کانفرنس منعقد کرنے کا طریقہ ہم نے مغرب سے سیکھا مگر کانفرنس کی ابتدا کسی مقدس کتاب کے کلموں سے کرنا اور یا خدا سے کانفرنس کی کامیابی کے لئے پرارتھنا کرنا یا دعا مانگنا ٹھیٹ مشرقی طریقہ ہے! ہندوستان میں بس جانے کے بعد ایرانیوں اور عربوں کے رسم و رواج میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ بہت سی ہندوستانی رسمیں مسلمانوں کی رسموں کے ساتھ ایسی گھل مل گئیں کہ ان میں فرق کرنا ناممکن ہو گیا اتنا تو بہرحال ضروری ہے کہ جہاں کہیں تقلید ہوتی ہے مقامی تہذیب و تمدن کی وجہ سے اصل رسم میں تبدیلی ہوتی ہے، اسی تبدیلی کو اصطلاحی زبان میں انحراف اور مقامی تہذیب و تمدن کو واسطہ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد جعفر حسن
صدر شعبہ عمرانیات

# جلوۂ محبوب

تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں  غالب

غالب کے اس مصرعے میں جو صداقت ہے اُسے کوئی فن کار ہی سمجھ سکتا ہے۔ آرٹ اوجِ ثریا کو اُس وقت چومتا ہے جب فن کار کا دماغ کسی انجانے محرک کی تاب نہ لا کر فن کی تخلیق کرتا ہے۔ غالب کے اشعار میں جو خوبی ہے وہ اُن کے لاشعوری احساس کی غمازی کرتی ہے۔ میرؔ کی سوگوار شاعری ڈھونگ بن جاتی اگر اس میں تاثر نہ ہوتا، ظفرؔ کا ماتم کناں کلام تکلف سے مملو ہو جاتا، اگر اُس کا دل درحقیقت روتا نہ ہوتا، ڈانٹے نے "طربیۂ خداوندی" جیسی مشہورِ عالم نظم ضبطِ قلم نہ کی ہوتی اگر اُس کی زندگی میں بیٹرس جلوہ بار نہ ہوتی۔ اک بار اُس کا سیہ خانۂ دل جگمگا اُٹھا اور پھر بیٹرس کے حصول کی ناکامی اُنے دل توڑ کے رکھ دیا اور اس ان دیکھے بربطِ سے مچلتے ہوئے نغمے اُٹھے اور طربیۂ خداوندی وجود میں آئی۔ لیونارڈو ڈاونسی کے قلم سے مونالیزا کی مجسم نسوانیت پردہ پر دہ کھینچے جاتی، اگر اُس کے احساس کو کسی نے چابک نہ دیا ہوتا۔ بوتشے نے وینس کے مدہوش حسن اور روبنس نے اڈونس کی رقصندہ جوانی کو اپنے اپنے تخیلی پیکروں کا کمال نہ دیا ہوتا اگر اُن کے تصور میں کسی ہستی کی رعنائی جھلکتی نہ ہوتی!

---

اکبر کا عہد زریں ہے۔ رعایا مرفہ الحال ہے۔ دولت کی فراوانی ہے۔ سارا ہندوستان اُس کے زیرِنگین ہے جو اس کی جنم بھومی بھی ہے۔ اس کی محبت اور رعایا پروری ضرب المثل ہے۔ آرٹ اور ادب کے سوتے جو کبھی کے خشک ہو چکے تھے، اس دور میں پھر سے نئی حیات لے کر اُبل پڑے ہیں، مصوری اور ادب منتہائے کمال پر ہیں، ذہانت اور فراست کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ دلوں میں اُمنگ ہے اور دماغوں میں جنون۔ نہ سیاسی افتراق ہے، نہ سماجی اختلاف، دربارِ اکبری ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار بنا ہوا ہے، اُس کے نورتن فقید المثال ہیں اور اُس کی خود فطانت ناقابلِ داد اور بالائے تحسین۔ مردم شناسی میں یکتائے زمانہ اور ژرف نگاہی میں بے مثل اور یہی وہ دور ہے جس کا عکاس خواجہ عبدالصمد شیریں قلم شیراز کا رہنے والا حضورِ اکبری کی برکات سے ہزاروں شاگردوں کا اُستاد ہے مصوری میں جواب نہیں رکھتا۔ رنگوں کے وہ کھیل رچائے کہ قوسِ قزح کو بھی شرم آئے، فطرت کو اپنے مو قلم سے یوں قید کرے کہ خالقِ ازل کو

اس نقاشِ فطرت پر ناز آئے۔ سیمیں پیکروں کی دلربا اداؤں کو رنگوں کی آمیزش سے کچھ یوں ظاہر کرے کہ تصویر سے نظر ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ میدانِ جنگ کی ہولناکی، سمندرِ مواج، آسمانِ قہار، اور برقِ خرمن سوز کو بھی اُس طرح پردہ پر لے آئے جیسے اُن کا وجود ہوتا ہے۔ دل کی تڑپ کو برش سے یوں دکھائے کہ تڑپنے کو جی چاہے، حسنِ تابناک کو ایسے مصور آئے کہ باہوش آدمی دامنِ جنون کی صد چاکی پر فدا ہو جائے۔ بادشاہِ وقت کو اپنے مصور پر ناز تھا اور مصور کو بھی ایسے قدردان سے عشق۔ اس دور میں آرٹ نے ایک منفرد شکل اختیار کر لی۔ دانیانِ فرنگ کا فن اس کے آگے پیچھے نظر آیا۔ نہ محض ایرانی، بلکہ دونوں ثقافتوں نے ہمکنار ہو کر ایک نئی تہذیب کو جنم دیا، مغل آرٹ کی یہی ایک خصوصیت تھی۔

ان ہی دنوں کی ایک داستان دلنواز ہے ۔ عبدالصمد شیریں قلم کے جہاں اور شاگرد تھے، اُن میں وسونت بھی ایک ہندو سجیلا نوجوان تھا۔ یہ ایک غریب کھار کا لڑکا تھا۔ جو ایک تصویر خانے میں ملازم تھا۔ بچپن سے تصویریں بنانے کا خبط تھا۔ شاید اُس کے ستارے کبھی دن پھرے کہ اکبر جوہر شناس کی نگاہ اُس پر پڑی۔ اس جوہر کو زنگ میں آلودہ دیکھکر عبدالصمد شیریں قلم کے سپرد کیا کہ اس کو نکھارے۔ جوہر دراصل گوہر یکدانہ تھا کہ ذراسی صیقل سے جگمگا اُٹھا۔ رنگ آمیزی میں طبیعت کی ایسی انفرادیت بتلائی کہ وہ علانیہ وسونت کے دستِ مشاق کی غمازی کرنے لگی۔ عبدالصمد وسونت پر جان فدا کرنے لگا۔ شاگردوں میں سب سے زیادہ اس پر توجہ منعطف ہوئی اور ملک بھر میں اس کا شہرہ ہوا۔ سبھوں کی یہی خواہش تھی کہ پردہ پر اس کی تصویر کھینچ جائے۔ حرم کی کنیزوں نے اس کی منت سماجت کی۔ منہ چڑھی باندیاں الگ گلے کا ہار ہوئیں، راجپوتنیاں بھی اصرار کرتیں کہ انہیں وہ زندہ جاوید کر دے طوائفین کی الگ ترغیبیں تھیں غرض وسونت کی تصویر کشی اب بالا بالا بڑھنے لگی تھی۔ لیکن عبدالصمد نے اس کی شہرت کو چند ٹکوں کے عوض بکنے نہ دیا بلکہ اُس کی خواہش تھی کہ یہ گوہر لاجواب کسی قدردان کی خاتم زرنگار کی آب بن جائے۔ شاگردِ رشید نے استاد کا کہا مانا، نسوانی حسن کو پردے پر لانے سے احتراز کیا۔ کچھ تو استاد کا حکم تھا اور کچھ معاشرت کی بندشیں۔ اسی لئے صرف منظر کشی میں ہی یدِ طولیٰ حاصل کیا۔ اُس کے کئی مرقعے نظرِ اقدس سے گذرے اور خراجِ تحسین حاصل کرتے گئے۔ شاہی تصویر خانے میں اس کی تصویریں بھی آویزاں ہوگئیں۔ دوسرے مصور حسد کی آگ سے جلنے لگے، کسی نے باعثِ رشک اُس کے فن کی نقل اڑائی تو بھونڈے پن پر جگ ہنسائی ہوئی۔ کسی نے کوسے دئیے جادو ٹونے کروائے، مارنے کی صدہا ترکیبیں کیں، لیکن وسونت کو زندہ رہنا تھا اور کچھ کرکے مرنا تھا!

کچھ دنوں سے وسونت علی الصباح مصور کے سامان کے ساتھ چلا جاتا تھا، استاد سے کہا کہ وہ طلوعِ آفتاب اور گنگا کے کنارے کا منظر کھینچ رہا ہے۔ مرقع میں ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں سبزہ زار، دریا کا پاٹ، آس پاس کے گاؤں اور فلک بوس مینار ۔۔ یہ منظر قدرے مشکل تھا، اس لئے زیادہ دن لگ جاسکتے تھے۔ لیکن جب یہ مشغلہ کسی طور پر کم نہ ہوا تو عبدالصمد کو کھوج ہوئی۔ تصویر کو دیکھا تو ہنوز نامکمل! اور وسونت بھی اُن دنوں خاموش اور فکرمند سا رہنے لگا

تھا کبھی کبھار کسی نامعلوم روشنی سے اُس کا دماغ جگمگا اُٹھتا اور وہ برش کو پردہ پر دوڑانے لگتا۔ کچھ ہی دیر میں کبھی نازنین کا ہیولا، پھر نقش، اور پھر شبیہ اُترنے لگتی۔ اور یکایک اُسے کچھ یاد آجاتا اور وہ ساری تصویر کو خراب کر ڈالتا اور سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ جاتا۔ جانے اُسے کیا ہوگیا تھا، جانے اُسے کیا ہو رہا تھا۔ استاد اس کے اندرونی خلفشار سے بے خبر تھا، لیکن دسونت جانتا تھا کہ اس اضطراب دل کی کیا وجہ ہے، اس طوفان کے اندر کیا چھپا ہوا ہے، یہ جیسن کیسی یہ کسک کس لئے، یہ گداز، یہ تڑپ۔ وہ جانتا تھا، وہ سب کچھ سمجھتا تھا۔ یاسمن، یاسمن۔ وہ زور سے پکارا یاسمن!
معاً اُسے ماحول کا خیال آگیا، پھر وہ مطمئن ہوگیا کہ وہاں کوئی بھی نہیں، لیکن اس بے خبر کو کیا معلوم تھا کہ اس کے شفیق استاد کی چھپی ہوئی آنکھیں پردہ کی اوٹ سے اُسے دیکھ رہی ہیں۔ وہ پھر سوچنے لگا، وہ صبح کیسی جانفزا تھی جب اس نے فن اور فطرت دونوں کو مدغم کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے یکایک بے جان فطرت کی عکاسی کو ختم کرنے کی ٹھان لی اور پردہ دار حسن کی پرکاری کو پردہ پر نقش کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن استاد کا حکم یاد آیا اور فوراً اس کے ہاتھوں کی طاقت سلب ہوگئی اور جب پردہ دار حسن کی پرکاری کو وہ رنگ کا روپ دینا چاہتا تھا۔ وہ یاسمن تھی، یاسمن، یاسمن۔ اور وہ بے تاب ہوا تھا اور ہاتھ میں برش لے کر دوڑا ہوا استاد کے پاس پہونچا اور التجا کی کہ وہ ایک نازنین خیالی کی جلوہ پاشی کو تاروں کی جگمگاہٹ سے زیادہ تابندہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن استاد نے کچھ دن اور انتظار کرنے کو کہا۔ دسونت لوٹ گیا!

عظمت خان ایک فوجی عہدہ دار تھا۔ وہ اکبر کی رعایا میں سے ضرور تھا لیکن بادشاہ کے خیالات سے سخت اختلاف رکھتا تھا حرم شاہی کی راجپوت بیویاں، ظل اللہ کا قشقہ لگانا، درشن دینا یہ سب اس کے نزدیک خرافات تھے۔ وہ پکا مسلمان تھا اور فوجی تھا، اس لئے کچھ اکھڑ بھی تھا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ اکبر کی اس میں کیا مصلحت تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ اکبر کے دل میں ساری انسانیت کا درد سمایا ہوا ہے۔ یاسمن اُسی کی اکلوتی دختر نیک اختر تھی حسین ایسی کہ کہکشاں بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے رنگ ایسا کہ شفق کی سرخیاں، لالۂ ایرانی کی بہار اور قوس قزح کے رنگوں کا حسن سب اس کے آگے ہیچ معلوم ہوں معصومیت کے آگے گنگ وجمن کا نرمل پانی بھی عرق آلود ہو جائے۔ چال ماورائے تشبیہ و استعارہ۔ آنکھوں کو مثل نرگس کہتے دل دھڑکے، ہونٹوں کو مرجان کہتے ہیں تامل ہے۔ غرض سراپا حسن اور حسن بھی ایسا کہ ملکوتی مشہور تھا کہ کبھی غیر مرد کی نگاہ اس پر نہ اُٹھی تھی۔ ورنہ وہ جانبر نہ ہوتا۔ یاسمن بھی اپنے حسن پہ مغرور تھی۔ نہ بات میں شوخی نہ اداؤں میں اچپلاہٹ۔ بلکہ متانت ہر لمحہ ٹپکتی تھی۔ وہ خود اپنے حسن کو کسی کے آگے پیش نہ کرنا چاہتی تھی بلکہ مثل شمع پروانہ کی منتظر تھی۔ اور اب تک کسی پروانے کی ہمت نہ بڑھی تھی یا یہ کہیئے کہ قضا نہ آئی تھی کہ اس پر لپکتا، ورنہ اجل تو حسن کے جلو میں تیشہ بردار کھڑی تھی۔ قسمت کی شوخی تھی یا قسمت کی ستم ظریفی کہ دسونت پر وہ جلوۂ یکتا ایک بار اور صرف ایک بار کھلا، صبح بہاراں تقدیس کے راگوں سے گونج رہی تھی اور یاسمن اپنی سہیلی طلعت کے ساتھ میانے میں لب دریا چل کھڑی ہوئی منظر کچھ ایسا جاذب نظر تھا کہ یہ دونوں سہیلیاں بے خود ہو کر چلمن اُٹھا دینا چاہتی تھیں۔ حجاب روکتا تھا

لیکن طلعت کی شوخی رک نہ سکی اور کہا "اوئی اس وقت یہاں کون بھلا مانس آنے چلا" اسی تردد ہی تردد میں کہار آگے چلے جاتے تھے۔ آخر کو طلعت نے اپنی طرف کی چلمن کو اٹھا دیا اور یاسمن سے نہ رہا گیا اور وہ بھی دوسری جانب کی چلمن کو اٹھا کر سر کو ذرا باہر نکالا تو سامنے وسونت تھا!! چلمن گر گئی۔ ایک ہلکی سی چیخ نکلی کہار بھاگنے لگے۔ دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ لیکن یاسمن کا ذرا زور زور سے "ہائے طلعت مر گئی میں تو! کسی نے دیکھ لیا ہے مجھے"

"تو پھر اچھا ہی ہوا نا شہزادی۔ پروانہ آخر کو مل ہی گیا"

"مذاق نہ کرو نہیں معلوم کونسی گھڑی ہے۔ مجھے تو کچھ عجیب سا لگ رہا ہے" یاسمن یہ کہکر سوچنے لگی۔ وہ جس پروانہ کی تلاش میں تھی، وہ یہی تو نہیں! اور اس کے دماغ میں لاکھ لاکھ وسوسے آئے اور غایب ہو گئے۔ وسونت حقیقت میں پروانہ تھا جو شمع رو ہو کر جل گیا تھا۔ اسی دن سے اس کی تصویر نامکمل رہ گئی۔ رنگ سوکھ گئے اور ہیئت بدل گئی۔ وہ روز وہاں جاتا، لیکن وہ صورت پھر نظر نہ آسکی۔ محض اس کا پتہ پانے کے لئے شوخ طلعت نے اپنا ایک رازدار بھیجا کہ اس مصور کی خبر لائے۔ بھیجا ہوا رازدار لوٹا اور "دل مفتون" کی ایک بولتی ہوئی تصویر لے آیا۔ یاسمن کو علم ہوا کہ یہ وہی مصور وسونت ہے جس کے چرچے اس نے عرصہ سے سن رکھے ہیں۔ وہ ہندو تھا لیکن اس کے حسن کا قدردان وہ لاکھ چاہتی کہ اس قدر دان کو اس کا حق مل جائے لیکن مذہب کی خلیج اسے روکتی تھی، باپ کے خوف سے لرز جاتی تھی اور بدنامی کے خیال سے کپکپا اٹھتی تھی!

انہی دنوں دربار میں یہ صلاح ٹھیری کہ "جلوۂ محبوب" کو جو مصور آئے گا وہ انعام قیمتی کا مستحق ہوگا۔ "جلوہ محبوب" پر کون طبع آزمائی نہ کرتا لیکن جو دل چوٹ کی لذت سے آشنا ہو، وہی اس کی سچی تصویر کھینچ سکتا تھا۔ تمام مصوروں کے دل نئی نئی امنگوں سے دھڑکنے لگے۔ سبھوں نے تخیل کی پرواز کو وہ مہمیز دی کہ آسمان کے تارے توڑ لانے کی فکر کرنے لگے عبد الصمد شیریں قلم نے اس تصویر کے انعام کی پیشین گوئی وسونت کے نام کر رکھی تھی۔ لیکن وسونت ان دنوں اتنا خاموش اور بے کل سا رہتا تھا کہ استاد کو بعض دفعہ ڈر ہوتا کہ کہیں وہ اس کی خواہش کو رد نہ کر دے۔ لیکن ہمت کر کے ایک دن وسونت سے اس مقابلہ کی تیاری کو کہا۔ وسونت نے پہلے انکار کیا اور استاد کو اپنا حکم یاد دلایا۔ عبد الصمد نے کہا "

"لیکن اب وہ وقت آ چکا ہے کہ تم اپنے احساس و مشاہدے کو رنگ دیدو۔ اور ایسا مرقع بناؤ جو مشہور عالم ہو جائے"

"لیکن استاد مشفق! زندگی میں اب تک میں نے کسی ایسے جلوۂ شب تاب کا مشاہدہ نہیں کیا، احساس کیسا؟"

استاد کی نظر چوکی نہ تھی، کہا "وسونت، تم خود فریبی میں مبتلا ہو سکتے ہو، لیکن میری آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے سینہ میں ایک مفتون دل مصروف آہ و بکا ہے اور یہ وہ مقام ہے جو فن حقیقی کا منبع ہے۔ تم اس تڑپ کو دکھا دو تو فن میں خلوص کا رنگ آ جائے گا"

"مگر استاد، میں اس گھاؤ سے جاں بلب ہو جاؤں گا"

"ایسا نہیں ہو سکتا بیٹا دسونت" استاد نے شفقت میں ڈوبے ہوئے الفاظ سے کہے

"نہیں، استاد نہیں" وہ تڑپ اٹھا "میں اس سوزِ دروں کو باہر نہیں لا سکتا، وہ شمعِ حرم ہے، میں اُسے سرِ بازار کیسے جلاؤں، وہ ایک چھپی ہوئی آہ ہے، میں اُسے بزمِ عام میں نہیں لگاؤں گا، یہ پیکانِ حسرت خیز دل ہی میں رہے تو اچھا ہے۔ اس کو نکالوں گا تو دل بھی نکل جائے گا مہربان!"

"تم بھولتے ہو، وارداتِ قلبی کو کوئی نہیں جان سکتا مصور اور تصویر دونوں ہمراز ہوتے ہیں، تم اس کی غمازی نہ کرو وہ بھی تمہارا راز چھپا کر رکھے گی"

"لیکن اِس سے وہ حسنِ دلآرام فنا کی سرحدوں کو چھو لے گا"

"دسونت! تم اپنے استاد کی خواہش کو ٹھکرا رہے ہو۔ تم نہیں جانتے میرے سینہ میں کیا آرزو ہے۔ تم نہیں جانتے وہ کیا جذبہ ہے جو اس خواہش میں چھپا ہوا ہے۔ دسونت مجھے تم پر ہمیشہ سے فخر رہا ہے۔ اپنے فن کے بل بوتے پر ہی نہیں بلکہ تمہاری شہرت پر بھی جینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اپنا فن پورے کا پورا میں نے تمہیں دے دیا ہے"۔

"بہت اچھا استاد، بہت اچھا۔ میں ضرور اس مقابلہ کی تیاری کروں گا" اور دسونت وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ مقابلہ کو ابھی چار دن باقی تھے۔ استاد سے جس دن باتیں ہوئی تھیں، بس اُس دن سے دسونت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ عبدالصمد شیریں قلم کی آرزو پامال ہو گئی۔ ہو سکتا تھا کہ اُس کا کوئی اور شاگرد ہی اس انعام کا مستحق قرار پاتا لیکن جس بات کی اُمید دسونت سے تھی، کسی اور شاگرد سے نہ تھی۔ مقابلہ کا دن بھی آ گیا۔ عبدالصمد کا دل ٹوٹ گیا۔ تصویر خانے میں تمام مصور اپنا اپنا کمالِ فن پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہے تھے۔ اور سب تصویریں نظرِ اشرف سے گذر رہی تھیں۔ فکرِ ہمایونی کچھ دیر مستغرق رہی۔ اتنے میں ایک غلغلہ مچا کہ دسونت آ رہا ہے، دسونت آ رہا ہے۔ عبدالصمد کا دل پھر امید سے مالا مال ہو گیا۔ اور باقی تمام شاگرد جل اُٹھے۔ عبدالصمد نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ دسونت مردِ بیمار بنا ہوا تھا۔ آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں، گال پچکے ہوئے، بال پریشان اور داڑھی بڑھی ہوئی۔ استاد نے نیلے مخمل میں لپٹی ہوئی ایک تصویر حضورِ اکبری میں رکھ دی۔ تصویر کی نقاب کشائی ہوئی تو سب فرطِ حیرت سے ہائیں کر کے رہ گئے۔ اور دسونت کے جسم میں ایک ہچکی پیدا ہوئی۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ بے ہوش ہو کر گرا ہی چاہتا تھا کہ عبدالصمد نے اُسے تھام لیا۔ تصویریں قوٹ کر لی گئیں۔ انعام کا دن اگلا تھا۔ شہر میں آناً فاناً "جلوہ محبوب" کے چرچے ہونے لگے۔ گھر گھر اور گلی گلی اسی کا ذکر تھا۔ یہ بات اڑتے اڑتے یاسمن تک بھی پہونچی کہ تصویر وہ پہلی اچانک مڈبھیڑ کی ہی صورت گری تھی۔ یاسمن کے دل سے اِک آہ نکلی کہ اس غمازِ محبت نے سوزِ دروں کو چھپا نہ رکھا اور اس کو کسی نہ کسی طرح ظاہر ہی کر ڈالا۔ یاسمن کو بہت ہی قلق ہوا۔ کھانا حرام ہوا، خدا کی یاد دل سے جاتی رہی اور دل ہی دل میں خود کو بدنام ٹھہراتی۔ دسونت سے عشق ہوا جو اس رہتی دنیا تک تو ناممکن الحصول تھا۔ وہ ہزار بار چاہتی کہ اس خیال سے چھٹکارا ملے لیکن کسی صورت اُس کا خیال جاتا نہ

تھا. کوئی چارہ بھی تو نہ تھا کہ زندہ رہتی۔ بدنامی کی زندگی سے موت کو ترجیح دینے لگی۔ دسونت کی بھیجی ہوئی "دلِ مفتون" کی چھوٹی سی تصویر کو طلعت کے حوالے کیا اور کہا " زندگی اب وبالِ جان ہے " طلعت نے لاکھ سمجھایا مگر نہ مانا۔ جس جلوۂ بے محابا کو سترہ سال سے مردوں سے چھپائے رکھا تھا، آج پردۂ عام پر آچکا تھا۔ اب اُسے کون سمجھاتا۔

انعام کا دن آیا۔ دسونت کی تصویر کو ہی انعام قیمتی کا مستحق قرار دیا گیا۔ خلعت و جاگیر اور منصبِ شاہی سے نوازا گیا۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے انعام دیا۔ استاد پر غرور ہو اُٹھا۔ لیکن دسونت کے چہرہ پر وہی پژمردگی تھی۔ اور اُسی دن یاسمن نے ہیرا چوسا اور جان دیدی۔ شہر بھر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ شاہ زمان خود حسرت و استعجاب میں تھے لیکن طلعت کو سب حال معلوم تھا۔ لیکن خاموشی ہی میں امان تھی۔ البتہ دسونت کو ایک چٹھی لکھی اور اُس کی بھیجی ہوئی تصویر اُسے واپس کردی۔ دسونت پہلے ہی سے دیوانہ ہوچکا تھا، اب جو یہ چٹھی ملی تو اور پاگل ہوگیا۔ شاہی تصویر خانہ گیا اور تصویر کو کچھ دن اپنے پاس رکھنے کی اجازت مانگی اور سیدھے استاد کے پاس پہونچا۔ اور سب حال کہہ سنایا۔ عبدالصمد سے رہا نہ گیا اور روتے ہوئے اُسے گلے لگا کر کہنے لگے " کاش میں نے تم سے یہ خواہش نہ کی ہوتی "! استاد کے پاس سے دسونت اُٹھا اور جانے لگا۔ استاد نے لاکھ روکا لیکن مجنونِ محبت خاکِ راہ گذر بن چکا تھا۔

جب یاسمن کو دفن کیا گیا تو اُس وقت شہر سے دور دسونت نے اپنی تصویر کو آگ لگادی۔ جس فن کی تخلیق ایسے کرب و اضطراب کے عالم میں ہوئی تھی، اُس کی یوں بے قدری ہوئی۔ کئی دنوں تک دسونت دیوانوں کی طرح اپنی اُنگلی سے خلاؤں میں تصویریں بناتا پھرتا اور گلیوں کے لونڈے اُس پر پتھر برساتے اور وہ قہقہے لگاتا ہوا بھاگ جاتا۔ کبھی محمل نشینوں کے پیچھے پیچھے میلوں تک نکل جاتا، کبھی پیس کاروان رہ جاتا، کبھی گنگا کے کنارے بہتے ہوئے پانی پر لکیریں کھینچتا اور کبھی دھاڑیں مار کر رونے لگتا۔ لیکن آفریں ہے کہ اُس نے اپنی زبان سے یاسمن کا نام انتہائے دیوانگی میں تک نہ لیا۔ خود اس عفت پیکر کا حکم تھا جب بادشاہ سلامت کے کانوں تک یہ بات پہونچی عبدالصمد پر کچھ دنوں تک عتاب رہا کہ اُس نے بادشاہ کے عنایت کردہ درِ یتیم کی قدردانی نہ کی۔ حکمِ شاہی سے دسونت کا علاج کروایا گیا لیکن کسی حکیم کے پاس ہی سے زہر کھا کر وہ فنا کی گود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوگیا۔ اب اُس کا وہ لاثانی نقش نہ رہا، صرف نام زندہ ہے۔

یوسف احمد صدیقی

متعلم ام۔ اے (ابتدائی)

---

# عورت

زندگی کا حسن اور کیف عورت کے دم قدم سے ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو پھر فطرت کی ہر رنگینی بے لطف ہوتی، تاروں کا نور، بہار کا حسن، پھول کی لطافت یہ سب بیکار محض معلوم ہوتے، اور انسان کشمکش حیات کی تلخیوں کو نا قابلِ برداشت محسوس کرتا، کوئی تعجب نہیں جو تنگ آکر دنیا چھوڑ جنگلوں میں نکل جاتا، پھر کہاں کا تمدن اور کہاں کی تہذیب، آج جہاں زندگی کی گھما گھمی ہے وہاں قبرستان کا سا سکوت ہوتا، آج جہاں گلستاں کی بہار ہے وہاں جنگل کی وحشت ہوتی، درندوں کا راج ہوتا، خلاصہ یہ کہ آدمی سب کچھ ہوتا مگر انسان نہ ہو سکتا۔

ایک طرف انسانی حیات میں عورت کا وجود، وجہ رونق ہونا مسلم، دوسری طرف انسان کا سلوک عورت سے ایسا ظالمانہ اور بہیمانہ کہ الاماں و الحفیظ۔ ساری تاریخ دیکھ ڈالیئے۔ چند ادوار کو چھوڑ کر بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت سے ایسا سلوک کیا جاتا رہا گویا کہ وہ انسان ہے ہی نہیں۔ اور مسیحی دنیا میں آئے دن اس امر پر بحث ہوتی تھی کہ آیا اس ناپاک وجود میں روح کا وجود ہے؟۔ اور کم از کم سترھویں صدی تک تو علما اس کو ماننے تیار نہ تھے۔ انسانی تمدن کو سمجھنے کیلئے یہ دیکھنے کے لئے کہ بالکل ابتدا میں انسان کیسے زندگی گذارا کرتے تھے۔ اور اس مفروضہ کے تحت کہ ابتدائی انسان کی زندگی فطرت سے قریب تر ہوگی، آج کل خام متمدن انسانوں کی تحقیقات کا رجحان عام ہے۔ لیکن انسانیت ( Anthropology ) کی روز افزوں تحقیقات نے بھی عورت کے مقام کو روشن نہیں بتایا۔ بلکہ بعض مقامات پر تو بیچاری کی حالت حد درجہ قابل رحم معلوم ہوتی ہے اس کو تقریباً ہر قبیلہ میں جائداد کے مماثل سمجھا جاتا ہے اس سے غلام کا سا سلوک کیا جاتا ہے کوئی اس کو کھلونا کہتا ہے تو کوئی کتے کا نام دیتا ہے[۱] بعض قبیلوں میں مرد اپنی بیوی کو گالی دے سکتا ہے، مار سکتا ہے، جان لے سکتا ہے مگر کوئی معترض نہیں ہو سکتا۔[۲]

ان بیچاری عورتوں کو اس قدر محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے کہ ان کا شباب بہت جلد رخصت ہو جاتا ہے، بیویوں کا تبادلہ یا مہمان کی تواضع میں بیوی کو پیش کرنا تو ایک عام بات ہے[۳]

---

۱، ۲ " Whilther woman " Y. M: Rege. p. 10–11.

۳ " Whilther woman " بحوالہ مضمون "شادی" معنفہ ماہر انسانیات میلی نوسکی شائع شدہ "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا"

بعض لوگوں نے طریق "مادر سری" کو دیکھکر خیال کیا تھا کہ عورت کو اعلیٰ مقام دیا گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں جیسا ہو ورنڈ، کرالے Crawly اور ویسٹر مارک نے بتایا ہے کہ یہ طریق صرف اس حد تک ہے کہ بجائے باپ کے ماں سے سلسلہ نسب جاری رہے، ورنہ خاندان کی بزرگی تو کسی مرد ہی کا حصہ ہوتی ہے، خواہ وہ مرد ماں کی طرف کا ہو یا باپ کی طرف کا[1]۔ اور جب ڈاکٹر رون ھار Dr. Runhar تازہ ترین محقق نے ہی بتایا ہے کہ طریق مادر سری میں بھی بہر حال عورت اپنے مرد رشتہ داروں ہی کے تابع فرمان رہتی ہے[2]۔

متمدن و مہذب کہلانے والی دنیا کا حال اس سے جدا نہیں۔ کہتے ہیں اہل یونان نے تہذیب و تمدن کے آسمان سے بڑے بڑے تارے توڑے تھے، وہ بھی عورت کا دل توڑنے میں پیچھے نہیں رہے۔ افلاطون اہل یونان کا شاکی ہے کہ انھوں نے عورتوں کو بچوں اور غلاموں کی صف میں رکھا ہے۔ سائمونیڈس یہاں تک کہتا ہے کہ "عورت وہ بدترین برائی ہے جو خدا نے کبھی پیدا کی"

چین اور جاپان میں عورت وہ اچھوت تھی جو مندروں میں داخل نہ ہو سکتی تھی، اہل عرب کہتے تھے کہ وراثت کا حقدار وہ ہے جو تلوار چلاتا ہے۔ لہٰذا بچہ اور عورت دونوں وراثت سے محروم تھے، باپ کے انتقال پر بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو اسی طرح بیوی بنا لیتا جس طرح وہ اس کی جائیداد پر قابض ہوتا تھا۔ فرانس کا ایک شاعر شکوہ کرتا ہے کہ "قدرت نے آخر کیوں اس کمینہ جانور (یعنی عورت) کو پیدا کیا کہ دنیا کے محاسن کو ملیا میٹ کر دے"۔ اطالیوں کا مقولہ تھا کہ "گھوڑا اچھا ہو یا برا، مہمیز کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح عورت کو بھی مار کی ضرورت ہوتی ہے"!

**مذہب اور عورت** کوئی مذہب فی نفسہٖ خلاف فطرت حکم نہیں دیتا۔ لیکن بعد والوں کی کمی بیشی اس کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ منو نے پہلے پہل عورت کے قانونی موقف کا تعین کیا۔ اسکی باتوں میں ہمیں تضاد نظر آتا ہے۔ جس کو "ہندو ازم" کے مصنف پروفیسر گوونددا اس نے بھی تسلیم کیا ہے۔ منو نے کہا کہ ماں کا مقام ہزاروں باپ سے بلند ہے۔ لیکن عملی حیثیت سے جو مقام خود منو نے دیا ہے، وہ شودروں کے مماثل ہے[3]۔ اس نے لکھا ہے کہ کسی مذہبی رسم میں عورت شرکت نہ کرے۔ اس کو نجات صرف شوہر کی خدمت ہی سے مل سکتی ہے۔ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کو بمنزلہ خدا سمجھے خواہ وہ "عیاش اور بدترین انسان ہی کیوں نہ ہو"[4]

---

[1] بحوالہ "معرفۃ شادی" مصنفہ ماہر انسانیات میلی نوسکی شائع شدہ "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا"۔

[2] Frieda Hansworth "Purdah" " صفحہ ۲۱

[3] "Hinduism" از پروفیسر گوونددا اس صفحہ ۲۷، ۲۸

[4] "Be he debancher or devoid of all virtues" Purdah صفحہ ۲۸

اس سلسلے میں سکند اپرانا[51] کی تحریر تو ایک قدم آگے ہے اس نے لکھا ہے:" اگر عورت یہ چاہتی ہے کہ مذہبی رسم انجام دے تو وہ اپنے شوہر کے پاؤں دھوئے اور پانی پئے"[52]

منو نے لکھا ہے کہ " نوکروں، شودروں، اور عورتوں کو وید سننے کا بھی موقع نہ دیا جائے، جب تک شوہر اور اور مرد افرادِ مکان کھانا نہ کھالیں، عورت کھانا نہیں کھا سکتی، زچگی کے زمانے میں وہ سخت ناپاک سمجھی جاتی ہے اور اس کے پاس بجز ادنیٰ عورتوں کے کوئی نہیں جانا چاہتا۔ منو نے طلاق یا شادی کے فسخ کرنے کو بہت برا کہا ہے اور شوہر کے فاتر العقل، ناکارہ یا کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہونے کی صورت میں عورت کو اجازت دی ہے کہ وہ دوسرے مرد سے جنسی تعلقات رکھے۔ اگر شوہر شرابی ہو یا بیوی کی جانب توجہ نہ دے" اور ایسی صورت میں عورت زنا کی مرتکب ہو، تو مرد اس کو چھوڑنے کا حق تو بہرحال نہیں رکھتا۔ البتہ تین مہینے کے لئے ترک تعلق کر سکتا ہے۔ اس طرح شادی کا بندھن تو کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا۔ البتہ شوہر کو رکھتے ہوئے ہی خاص حالات میں دوسرے مرد سے آشنائی کی اجازت دی گئی ہے[53]

عورت کے حقوق وراثت برائے نام ہیں۔ عورت کی جائداد میں صرف وہی چیزیں شامل ہیں جو اسکو مختلف اوقات جیسے شادی یا کسی خاص موقع پر اس کو تحفہ کے طور پر دی جائیں، لیکن ایک مقام پر منو نے لکھا ہے کہ " غلام، بچے اور عورت کی کوئی جائیداد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ جو کماتے ہیں، اُن کا حق ہوتا ہے، جن سے وہ متعلق ہیں"[54] کسی صورت عورت کو دوبارہ شادی کا اختیار نہیں۔ شوہر کے بعد بیوہ کی زندگی دردناک جہنم کی زندگی بن جاتی ہے۔ زندگی کی ساری مسرتوں سے وہ محروم کردی جاتی ہے، وہ خواہ کتنی ہی نو عمر ہو، مجبور ہے کہ جنسی جذبہ کو کچل دے، ورنہ جنسی بازار کا رُخ کرے۔ شدائد کے خوف سے عورتیں ستی ہونے پر مجبور رہتی ہونگی لیکن جو عورتیں بہرحال زندگی چاہتی تھیں، ان کو اس طرح کس کر باندھ دیا جاتا کہ چتا سے بھاگنے نہ پائیں، اور زور و شور سے ڈھول بجائے جاتے کہ جلنے والی کی دردناک چیخیں رحم دل انسانوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں

ہندومت کے کلاسیکل لٹریچر سے" پردہ" نامی کتاب کی مصنفہ نے ایک جملہ نقل کیا ہے جو عورت سے متعلق قدیم ہندوستان کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔

" خطرناک زہر، اور پر شور طوفان سے زیادہ، ہیبت ناک ہاتھی اور بھوکے شیر سے زیادہ چور، وحشی اور

---

[51] Skanda Purana

[52] ایضاً

[53] " صفحہ ۳۵

[54] " صفحہ ۳۶، ۳۷

قاتل سے زیادہ عورت اس قابل ہے کہ اس سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ جو اس پر بھروسہ کرے وہ کہیں کا نہ رہے"[1]

جیسا کہ ہم نے ابتدا میں لکھا ہے کہ کسی مذہب کی اصلی تعلیمات راہ اعتدال سے منحرف نہیں رہ سکتیں، البتہ بعد کے اضافوں سے نقائص پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ آجکل عقد بیوگان، کمسنی کی شادی کے انسداد اور دیوداسی طریق کو برخاست کرنے سے متعلق جو قوانین ہندوستان کے مختلف صوبہ جات میں نافذ کئے جا رہے ہیں ان سے یہ خوش آئند بات ظاہر ہوتی ہے کہ پھر سے ہندو عورت اپنا وہ اعلیٰ مقام حاصل کرے گی، اس کو کسی زمانے میں حاصل تھا۔ ہر انسانیت دوست اس دن کا بے چینی سے انتظار کرے گا۔

تاریخ کا یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ عیسائیت، جس نے دعویٰ کیا کہ وہ انسانوں کو نجات دلانے والا مذہب ہے، جس کے پیغامبر، دنیا کو بچانے کے لئے خود صلیب پر چڑھ گئے، اس مذہب نے انسانیت کے نصف بہتر کو جیتے جی عذاب جہنم کا مزہ چکھا دیا۔ جس طرح خون صد ہزار انجم پر آفتاب کا ابھرنا موقوف ہے اس طرح مطلع عالم پر نیر عیسائیت کیا طلوع ہوا، افق نسوانیت اپنے تاروں کے خون ناحق سے لالہ زار ہو گئی، شروع ہی سے عیسائیت کا یہ تصور رہا کہ کائنات انسانی گناہ کا نتیجہ ہے کیونکہ اس گناہ عظیم کی محرک عورت کی ذات شریف ہے۔ لہٰذا اس سے انتقام یوں لیا جانا چاہیئے کہ جتنا ہو سکے اس کو ذلیل کیا جائے۔ جنسی جذبہ کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ اس طرح انسان اس گناہ کی دیوی سے دور رہ سکیگا، چنانچہ سینٹ پال نے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ عورت کو چھوا تک نہ جائے، لیکن اگر مردوں سے صبر نہ ہو سکے تو پھر مجبوراً شادی کر سکتے ہیں اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے جنسی جذبہ کو دبانے کے لئے فطرت سے جنگ شروع کر دی، مگر اس سے بڑے بڑے اخلاقی اور معاشرتی فتنے پیدا ہوئے ترتولیاں نے عورت کے متعلق مسیحی تصور کی ترجمانی یوں کی ہے۔

"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے، وہ شجر ممنوعہ کی طرف لیجانے والی، خدائی قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر ——— مرد کو غارت کرنے والی ہے"[2]

اور تو اور، لارڈ چیسٹر فیلڈ نے اپنے بچے کو جو مشہور خطوط لکھے ہیں، اس میں عورت کو بچے کے مماثل کیا ہے" جس سے لوگ کھیلتے اور دل بہلاتے ہیں لیکن جس سے کسی سنجیدہ معاملہ میں رائے نہیں لیتے اور نہ بھروسہ کرتے ہیں"

---

[1] واضح رہے کہ "پردہ" نامی کتاب کی مصنفہ .Frieda Hansworth انگریزی نژاد ہے اور ایک ہندو اسکالر کی بیوی ہے اس نے اپنے ذاتی مشاہدہ اور مطالعہ کو کام میں لاتے ہوئے، ہندوستانی عورت پر یہ کتاب لکھی ہے۔ اور کتاب کی عام تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ تعصبات سے دور ہے کہ ہندوستانی عورتوں کی ہمدرد، بلکہ کسی حد تک مداح بھی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو "پردہ" از ابو الاعلیٰ مودودی

عورت کے متعلق اس غلط بنیادی عقیدے نے جو گل کھلائے ہیں وہ تاریخ مسیحیت کا افسوسناک باب ہے اس مقام پر بخوف طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے، ورنہ طلاق اور خلع کی حرمت، عورت کو بے روح اور بے عقل سمجھنے کی بنیادی غلطیوں نے عورت پر وہ ظلم کرائے ہیں کہ ان کے تصور ہی سے انسانیت کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ مظالم کے پہاڑ صنف نازک پر ان لوگوں نے توڑے، جو مسیح کی اس تعلیم پر ایمان لاتے تھے کہ کوئی تم کو ایک گال پر تھپڑ مارے تو اپنا دوسرا گال بھی پیش کردو۔

اور ممالک کا حال چھوڑیئے، انیسویں صدی کے آخر تک خود انگلستان میں یہ حال تھا کہ بیوی کی جائداد اس کی آمدنی، اس کی انفرادی آزادی اور حتیٰ کہ اس کا ضمیر بھی شوہر کے مقبوضات میں سمجھے جاتے تھے ۱۸۹۱ء تک تو شوہر کو حق تھا کہ چاہے تو بیوی کو قید کردے!

بہتر تو یہی ہے کہ اس افسوسناک داستانِ جور و تظلم کو طول نہ دیا جائے[1]، اب یہ جائزہ لینا چاہیئے کہ اس بہیمیت کا ردِ عمل کیا ہوا۔ اور انتہاپسندی کے جواب میں حریت نسوان کی جو تحریک چلی، وہ اب کہاں آکر ٹکی ہے، آیا عورت نے صحیح راہ پالی ہے؟ یا اب بھی وہ انتہاپسندی کے دشت زاری میں سرگرداں ہے۔ مغرب میں عورتوں سے جو شدید غیر منصفانہ برتاؤ کیا جاتا تھا، اس کے ردِ عمل کی پہلی ترجمان میری وول اسٹون کرافٹ ہے جس نے اپنی کتاب A vindication of the rights of women. (شائع شدہ ۱۷۹۲ء) میں پہلی مرتبہ عورتوں کے جذبات رنج والم کی ترجمانی کی اور اس نے مطالبہ کیا کہ عورتوں کو تعلیم کے مساوی مواقع حاصل رہیں، اخلاق کے جداگانہ معیار ختم ہوں اور پارلیمنٹ میں بھی عورتوں کی نمائندگی ہو،

---

[1] یہاں پر اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ سلطنت روما کے عروج کے زمانے میں جب عورت گھر سے نکل کر شمع محفل بنی اور ملک کے بڑے بڑے معاملات اسی کے اشارہ چشم وابرو کے محتاج ہوگئے، تو اس سے عظیم فسادات رونما ہوئے، بالآخر جب سلطنت روما کو زوال ہوا تو اس کا باعث غریب عورت کو قرار دیا گیا، جیسا کہ مصری عالم، فرید وجدی "المرأة المسلمة" میں لکھا ہے (مولانا ابوالکلام آزاد نے "مسلمان عورت" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا ہے) مردوں نے سارا غصہ عورتوں پر نکالا عورتوں پر گوشت کھانا، ہنسنا بولنا، اور بات چیت کرنا بھی حرام قرار دے دیا گیا" جن عورتوں کو کسی الزام میں ماخوذ کیا جاتا" ان کو گھوڑوں سے باندھا جاتا، گھوڑوں کو بھگایا جاتا کہ عورت کی ہڈیاں پسلیاں چکنا چور ہوجاتیں۔ عورتوں کو باندھ دیا جاتا۔ نیچے سے آگ دھکائی جاتی۔ جس کی سوزش سے ان کا گوشت گل گل کر گرتا جاتا اور ایسی دردناک حالت میں ان کی جان جاتی کہ تصور کرنے سے کلیجہ تھرا اٹھتا ہے اور دل پھٹنے لگتا ہے" ص ۱۳۷

جوشیلے شاعر کو لاکھوں کی تلاش میں ایک بھی "عورت" نہیں ملی، بلکہ اس مردانی تعلیم نے عورت کی جسمانی حالت پر تباہ کن اثر مترتب کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ بلوغ کے زمانے میں اور خصوصاً ایام ماہواری میں لڑکی پر جو بار پڑتا ہے، اس کے پیش نظر آرام کی بے حد ضرورت رہتی ہے۔ لیکن ہماری تعلیم کا بار جو لڑکی کی مخصوص حالتوں کا لحاظ نہیں رکھتا، اس پر گہرے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ ہیولاک ایلس Havelock Ellis کے الفاظ میں " لڑکی کے بلوغ کے زمانے میں اگر اس پر کسی قسم کا بار پڑے تو وہ مستقل تکالیف میں مبتلا ہو جاتی ہے[1]

(Dr. Cyrns Edron) نے لکھا ہے کہ بہت سی تعلیم یافتہ لڑکیاں شادی سے قبل ہی اتنی تباہ حال ہو جاتی ہیں کہ ایک دو بچوں کے بعد ان کی صحت کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

مختلف زنانہ کالجوں کی لڑکیوں کے احوال کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں میں نصف تو شادی نہیں کرتیں، جو شادی کرتی ہیں ان میں بہت سی بانجھ رہتی ہیں، اور جو صاحب اولاد ہوتی ہیں انھیں مشکل ہی سے دو تین بچے ہوتے ہیں[2]

ڈاکٹر گیلوڈ تھامس نے اندازہ لگایا کہ امریکہ میں صرف ۴ فیصد عورتیں جسمانی نقطہ نظر سے اس قابل ہیں کہ بیوی یا ماں بننے کے فرائض انجام دے سکیں[3]

لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح تعلیم دینے سے جو تباہ کن اثرات مترتب ہوئے، ان کے پیش نظر ڈنمارک، اسکاٹ لینڈ اور جرمنی نے لڑکیوں کے لئے خاص مدارس قائم کئے ہیں جہاں کا نصاب لڑکیوں کے احوال اور ضروریات کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے۔ وہاں اس چیز کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ زیادہ تر لڑکیوں کو آگے چل کر بیویاں اور مائیں بننا ہے۔ لہٰذا ان کو تعلیم ایسی دی جائے کہ وہ اچھی بیویاں اور بہتر مائیں بن سکیں اور اس طرح آنے والی نسلوں کو بہترین تربیت دے سکیں۔

لڑکیوں پر لڑکوں کی طرح تعلیم دینے کے جو اثرات ہوتے ہیں ان کو بالاجمال پیش کیا گیا۔ اس پر غور کیا جائے تو پھر مخلوط تعلیم کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اب آگے بڑھئیے۔ کارخانوں میں عورتوں پر اس سے زیادہ تباہ کن اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ معاشی آزادی کی دھن میں عورت شوہر سے بے نیاز ہو کر نکلتی ہے، اور در کار زمانہ پر سر نیاز رکھ کر سرمایہ دار کی غلامی قبول کر لیتی ہے۔ اور سرمایہ دار کم اجرتوں پر کام لے کر دل کھول کر

[1] اس سلسلے میں مختلف ڈاکٹروں نے اپنی تحقیق میں بتایا ہے کہ ایام کی بے قاعدگی، تکلیف وغیرہ اسی بار کے نتائج ہیں۔

[2] (Whither woman) میں امریکہ کی مشہور زنانہ کالج (Wellcsly) کے حالات پیش کر کے انہی نتائج کی تفصیل دی گئی ہے جس کا خلاصہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ اور ان پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر کیرولین نے لکھا ہے کہ جبری تعلیم ما تھی اندیشوں کو صدیوں کے لئے باطل کر دیگی ص ۲۳۶

[3] ایضاً ص ۲۳۹

استعمال کرتا ہے۔ ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ عورت اظہارِ ذات کیلئے کارخانہ کو جاتی ہے، صرف بیہ کھانے یا پنیوں کی منڈیاں بنانے میں سارا وقت صرف کردیتی ہے، کیا اس سے اسکے دماغی قوی ترقی کرتے ہیں کیا اس سے اس کی صلاحیتیں نکھرتی ہیں؟ کیا اس خشک اور بے مزہ کام کے مقابلے میں آنیوالی نسل کی تربیت، اپنے لخت جگر اور نور نظر کی دیکھ بھال زیادہ دلچسپ اور اعلیٰ کام نہیں؟ کیا کارخانوں میں ہوس رانوں کا آلہ کار بننا بہتر ہے یا گھر کی ملکہ بنے رہنا زیادہ مناسب ہے؟ کیا کارخانہ میں کام کرنے یا دفتری کلرکی کرنے سے عورت کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے؟ ہماری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ عورت اپنے جسم کو زنگ اور صنعتی کشش کے جوہر اور دماغی صلاحیتوں کو تباہ کر رہی ہے اور دوسری طرف ڈاکٹر ایشلی کے الفاظ ہیں۔

"عورتوں کے کارخانوں میں کام کرنے کی وجہ سے بچوں کی شرح اموات میں بے حد اضافہ ہوگیا ہے۔ ان مقامات میں جہاں عورتیں کارخانوں میں کام کرتی ہیں شرح اموات زیادہ ہے بمقابلہ ان مقامات کے جہاں عورتیں گھروں میں رہتی ہیں"[1]

اب ہم پر یہ بات واضح ہوئی ہے کہ تمدن و تہذیب کے دیگر بہت سے معاملات کی طرح، عورت کے مقام کے تعین کرنے میں بھی فکر انسانی نے افراط و تفریط کی وادیوں میں ٹھوکریں کھائی ہیں، ایک طرف تو عورت کی زندگی دائمی غلامی کی افسوسناک جہنم ہے، وہ بچپن میں والدین کی تابع فرمان، شادی ہونے پر شوہر کی باندی، بیوہ ہونے پر گھر کے دیگر مرد افراد کی کنیز بنی رہتی ہے گویا وہ غلام پیدا ہوتی ہے، غلامی کی حالتیں زندگی کے دن گذارنے کی صبر آزما کوشش کرتی ہے اور بالآخر غلامی کی حالت میں مرجاتی ہے تو بھی اس کی روح کرم کے چکر سے نجات نہیں پاسکتی، اس کے برخلاف دوسری انتہا یہ ہے کہ عورت مرد کا مثنیٰ بن جائے، اور چونکہ مکمل مرد نہیں بن سکتی کہ مجبور فطرت ہے، اس لئے وہ ایک تیسری صنف کا ایسا مضحکہ خیز نمونہ بن جاتی ہے جس سے نسوانیت شرماتی ہے اور مردانیت جس کو اپنی ہوس رانیوں کا آلہ کار بناتی ہے، جو بھی شخص عورت اور مرد کے فطری فرق پر غور کرے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان دونوں کا دائرہ عمل اس عظیم فرق کے ساتھ ایک کبھی نہیں ہوسکتا۔

اس مقام پر یہ امر ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ طے کیا جائے کہ اس عالم رنگ و بو کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟

51

---

[1] (Whilther Ibia) کے لکھنے والے نے اس سلسلے میں بیسیوں ماہرین کے بیانات جمع کر دئے ہیں۔ اس موقع کو دیکھنے سے بڑی آسانی سے نتائج نکالے جاسکتے ہیں مثلاً اس نے ایک ڈاکٹر کے بیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ "صنعتی شہر بریڈ فورڈ میں فلاح اطفال کی حکمت عملیاں جو ترقی یافتہ دنیا سے ممکن ہیں، اختیار کی گئیں لیکن اس کے باوجود یہاں بچے کم پیدا ہوتے ہیں اور جلدی مرجاتے ہیں"۔ اس کے برخلاف آئرلینڈ کے شہر کناٹ میں، جہاں بریڈ فورڈ کی خوشحالی کے برخلاف غربت، جہالت اور غلاظت سب کچھ ہے، مگر شرح اموات اطفال ۵۰ ہے جبکہ بریڈ فورڈ کی ۱۴۲ ہے وجہ یہ ہے کہ کناٹ کی تندرست مائیں گھر ہی پر رہتی ہیں اور بچوں کو اپنے سینے کی وہ غذا دیتی ہیں جس کا کوئی بدل نہیں"۔ ص ۲۶۲ تلخیص

آیا انسان آخرت کی فکر کرے یا اسی زندگی سے مسرت کا آخری قطرہ نچوڑنے کی کوشش کرے؟ لیکن یہ مسئلہ یہاں قابلِ ذکر ہے اور یقیناً اس میں دو یا دو سے زیادہ رایوں کا امکان نہیں کہ انسانوں کو ایک کام بہرحال کرنا ہے، اور وہ بقائے نوعِ انسانی کے لئے مصروفِ سعی رہنا ہے تاکہ یہ سازِ ہستی بے نوا نہ ہو جائے اور اس محفل میں حیات کی شمع گل ہونے نہ پائے اب دیکھیے کہ نوعِ انسانی کی بقاء کے سلسلے میں مرد کا کام صرف تخم ریزی ہے جنین کو اٹھائے اٹھائے پھرنا، ایک طویل مدت مبتلائے مصیبت رہنا، پھر زچگی کا صعوبت انگیز زمانہ اور رضاعت اور تربیت کا صبر آزما وقت طلب کام، یہ سب عورت کے ذمہ ہے۔ اگرچہ یہ بار بہت ہے تو فطرت اس ظلم کی ذمہ دار ہے۔ مرد تو زر دوش ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ عین انصاف ہے کہ عورت سے اس قدر کٹھن کام لینے کے ساتھ ساتھ آپ اس پر بیرونِ خانہ کی ان ذمہ داریوں کو بھی عائد کر دیں جو محنت اور مسلسل محنت کے طلبگار ہیں؟ اور پھر ایک حالتِ حمل میں کشمکشِ روزگار کی سختیوں کو سہے پارلیمنٹ کے انتخابات لڑے، تند و تلخ بحثوں کی کوفت اور تھکن برداشت کرے، کامیابی کے لئے جان توڑ کوشش کرے، یا ناکامی کا صدمہ برداشت کرے، افسر بالادست کی گھڑکیاں یا کارخانہ دار کی جھڑکیاں سنے یا پھر کسی نئے شکار کی تلاش میں عیش کی وادیوں میں بھٹکتی پھرے تو اس کے جنین پر کیسے نفسیاتی اثرات مترتب ہوں گے [1]

۵۲

اور پھر جیسا کہ اوپر بتایا گیا، لڑکوں کے نصاب کی تعلیم لڑکیوں کے لئے تباہ کن ہے اس سے نہ صرف ان کی صحت تباہ ہوتی ہے بلکہ شرحِ پیدائش پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح کارخانہ میں کام کرنے والی عورتوں سے بھی ایسا ہی شدید قومی نقصان پہنچتا ہے۔

ان حالات میں عورت کے مقام کا تعین کرنے میں ہمیں ان دونوں انتہا پسندیوں سے بچتے ہوئے راہِ اعتدال اختیار کرنی چاہیئے، ویسے بھی اس وقت اس مسئلہ کو حل کرنے کی شدید ضرورت اس لئے ہے کہ نئی تعلیم پائی ہوئی بعض لڑکیاں ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہی ہیں کہ

"عورت اپنا راستہ خود منتخب کرلے گی، اس کی آنکھوں کی پٹی اتر گئی ہے، وہ اپنا کام بھی کر سکتی ہے، اور مرد کا بھی، اسے اب بھی اپنی نسائی خوبیوں کا احساس ہے، مگر وہ چاہتی ہے کہ ڈبل رول بولنے والا مرد، جسے مشکل

---

[1] حالتِ حمل کے نفسیاتی اثرات کی گہرائی کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے جس کو مصری عالم فرید وجدی نے اپنی کتاب المراۃ المسلمۃ میں درج کیا ہے۔ ایک دفعہ فرانس میں خوبصورت والدین کا بچہ جب سیاہ رنگ کا حبشیوں کی سی صورت کا پیدا ہوا تو تحقیق سے معلوم ہوا کہ زمانۂ حمل میں ماں کی نشست کے سامنے میز پر ایک حبشی کا مجسمہ رہا کرتا تھا۔ جس کی شباہت اور رنگ کا اثر نگاہوں کے ذریعہ دماغ میں پہنچا، اور اس طرف ذہن کو غیر معمولی توجہ ہو گئی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچہ والدین کی صورتوں کے بالکل مختلف حبشی کے مجسمہ کی شکل میں پیدا ہوا۔ صفحہ ۱۹

کام کرنے کا دعویٰ تھا۔ اب کچھ دنوں تک آرام لے، مرد چیختے رہ جائیں کہ عورت کدھر؟ مگر وہ اپنی منزل پر جا کر ہی دم لے گی ؏ ۔

گویا مغربی عورتیں جس راہ آزادی پر چل کر بھٹک گئی ہیں اور ٹامک ٹوئیاں مارتی پھر رہی ہیں، ٹھیک اسی راہ پر اسی جوش کے ساتھ یہاں کی بعض جوشیلی خواتین نے بھی عزم سفر کیا ہے۔ یہ عزم سفر مبارک ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ اس ہٹ کی مزاحمت بیکار ہے، مگر پھر وہ حال نہو کہ کوئی کہدے،

؏ پڑے پھرتے ہو آخر یوسف بے کارواں ہو کر ؏

بہر حال آج اہل مشرق کے لئے یہ مسئلہ کافی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ عورت کے صحیح مقام کا تعین کیا جائے اور اس کے جائز وقار کا قانونی تحفظ کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ ہمارے تمدن کا بوسیدہ سفینہ طوفان مغرب کے تھپیڑوں کی زد میں آکر پاش پاش ہو جائے۔ عورت کے مقام کا تعین یا کسی اور تمدنی مسئلہ کے حل کرنے سے قبل ایک بنیادی حقیقت ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ انسان بہر حال انسان ہے نہ وہ فرشتہ ہے کہ معصوم بن سکے۔ نہ وہ حیوان ہے کہ اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے جانوروں کی دنیا سے نمونے تلاش کئے جائیں اور بجروں، اگر مچھوں کو دیکھ کر کہدیا جائے کہ آزاد شہوت رانی عین فطری طریقہ ہے کہ جانوروں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس بنیادی حقیقت کو ماننے کے بعد عورت بحیثیت انسان ہر لحاظ سے مرد کے مساوی درجہ پانے کا مستحق ہے۔ لیکن اس کا فطری دائرہ عمل مرد سے الگ ہے۔ ایام ماہواری، حمل، وضع حمل، اور رضاعت یہ ایسے امور ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ عورت تمدن کی خدمت، مرد سے مختلف نوعیت اور جدا طریقے پر کرتی ہے۔ چونکہ عورت تمدن کا اس قدر دشوار ترین کام انجام دیتی ہے۔ لہٰذا اس کو فکر معاش سے بے نیاز کیا جانا چاہیئے۔ اس کے معاشی موقف کو کافی مستحکم کر دینا چاہیئے تاکہ ایک طرف تو وہ نئی نسل کی تربیت کا صبر طلب کام دلجمعی اور سکون خاطر سے انجام دے سکے

ؐ "منسٹرل" ہفتہ وار ۱۹ ر آبان ۱۳۵۶ ف حیدرآباد دکن

ؐ مرد سے بے نیاز ہوکر، خاندانی نظام کو توڑ پھوڑ کر، مغربی عورت جو باہر نکل پڑی تو بیچاری اپنے کئے پر آپ پریشان ہے۔ ادھر ہر مرد نئی عورت کی تلاش میں ہے اور ہر عورت نئے مرد کی فکر میں غلطاں۔ مردوں کو لبھانے کے لئے بننے سنورنے کا شوق جنون کی حد تک بڑھ گیا ہے چنانچہ امریکہ کی عورتیں کہا جاتا ہے کہ سالانہ ۲۱ کروڑ ڈالر صرف سنگھار کے سامان پر خرچ کرتی ہیں۔ دوسری طرف جو عورتیں مردوں سے متنفر تھیں انھوں نے جذبات جنسی کو بجھانے کے لئے جانوروں سے مدد لینے کی کوشش کی۔ ان افسوسناک کوششوں کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو Cloven Hoat جس کے کچھ اقتباسات مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "مضامین عبدالماجد" کے مضمون "تہذیب" سمندن کی کہانی ایک لندنی کی زبانی" میں مل سکتے ہیں۔

دوسری طرف اس کی معاشی حالت، کی کمزوری، مرد کے آگے اس کو بے بس نہ بنا سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ باپ، بھائی، شوہر اور دیگر قریبی رشتہ داروں کی جائیدادوں سے عورت کو وراثت میں مناسب حصہ ملے۔ اور اپنی اس جائیداد کو وہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔ چاہے تو اس کو تجارت میں لگائے، چاہے بیچ دے، چاہے جمع کرے۔ شوہر یا کسی اور مرد کو اس کی مرضی کے خلاف اس کے معاملہ میں مداخلت کا حق نہ ہو[1]

بہرحال بیوی جب تک حقوق زوجیت ادا کرتی رہے، شوہر کا بہرحال فرض رہے کہ وہ بیوی اور بچوں کے سارے اخراجات برداشت کرے۔ گو یہ ترجیح ہے کہ گھر کے انتظام کے لئے بحیثیت محافظ کے مرد کا ایک درجہ بلند رہے اور وہ گھر کے معاملات کا نگران رہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورت کے جائز حقوق اس سے متاثر ہوں گے اور اگر ایسا ہو تو اس کو قانون سے مدد لینے کا کھلا حق ہونا چاہیئے۔

نئی نسل کی تربیت جیسا اہم کام چونکہ عورت کے سپرد ہے لہذا اس کا تعلیم یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم میں ان کے مخصوص احوال و ضروریات کو پیش نظر رکھا جانا چاہیئے تاکہ وہ بہترین بیٹیاں، بہترین بیویاں اور بہترین مائیں بن سکیں، لیکن ساتھ ہی ان کو ایسی تعلیم بھی ملنی چاہیئے کہ ان کی نظر وسیع ہو سکے اور وہ اپنے بچوں کو انسانیت کا صحیح درس دے سکیں



واضح ہو کہ تمدن کے استحکام اور بہتری کے لئے یہ امر ضروری تو ہے کہ خاندانی نظام مستحکم رہے۔ لیکن عملی دنیا میں ایسے ہزاروں واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ میاں بیوی میں میل ناممکن ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں دونوں کی زندگیوں کو ابتر بنا دینے یا ناجائز راہوں پر چلنے کے لئے مجبور کرنا سماج کا بدترین ظلم ہوگا۔ اگر ایسی سختیاں عائد ہوں تو سب سے زیادہ عورت کا نقصان ہوگا، لہذا نکاح یا شادی کے بندھن سے آزاد ہونے کا عورت کو پورا پورا حق ملنا چاہیئے،

اگر شوہر بیوی سے برا برتاؤ کرے، اس کے اخراجات برداشت نہ کرے، وہ مجنون[2] ہو یا ایسے عوارض میں مبتلا ہو جو مانع تعلقات زن و شوہر ہوں جیسے جذام، برص، گندہ دہنی، امراض خبیثہ وغیرہ اور ایسے عوارض جو مانع قربت ہوں یا وہ فعل مباشرت پر قادر نہ ہو، تو عورت کو نکاح کی گرہ کھول دینے کا پورا قانونی اختیار ملنا چاہیئے۔

ایک اور بات، جس کو پیش نظر رکھنے سے، شاذ شادیوں کے فسخ ہونے کے واقعات کم پیش آئیں گے، یہ ہے کہ

---

[1] یہ سن کر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ فرانس میں حال حال تک ابھی عورت کو یہ حق نہیں ملا تھا۔

[2] واضح رہے کہ اگر شوہر دیوانہ ہو جائے تو جرمنی، سوئزرلینڈ اور سوئیڈن کے قوانین کی رو سے عورت کو ۳ سال تک انتظار کرنا چاہیئے کہ ممکن ہے وہ اچھا ہو جائے۔ لیکن راقم الحروف کی رائے میں عورت پر ایسی پابندی نارو ا ہے۔ گویا وہ چاہے تو اس سے زیادہ مدت اپنی خوشی سے ٹھیر جائے۔

گو شادی کے موقع پر والدین کی رضامندی کو اہمیت دی جانی چاہیئے تاکہ ان کا تجربہ رہنمائی کرے لیکن آخری فیصلہ بہرحال لڑکی کو کرنا چاہیئے، وہ چاہے تو والدین کے پیش کردہ رشتہ کو ناپسند کرے اور شادی سے انکار کر دے۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یورپ نے کورٹ شپ کے طریقے پر ایک زمانہ تک عمل کیا۔ لیکن آج طلاقوں کی روز افزوں بھرمار[1]، اس امر کی شاہد ہے کہ اس طریقہ سے پائیدار نکاح کی ضمانت نہیں ملتی۔ وجہ ظاہر ہے جوانی کی محبت صرف شہوانی محبت ہوتی ہے۔ ادھر شباب کا نشہ ہرن ہوا، ادھر کائنات بدل گئی۔ محبت اور نفرت کے معیار بدل گئے۔ اس لئے یہ طریقہ تو پسندیدہ نہیں البتہ شادی سے قبل ایسے مواقع پیدا کئے جانے چاہئیں کہ لڑکی، لڑکے کو دیکھ لے سکے۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد پہلی نظر ہی میں کراہیت پیدا ہو جائے۔

خلع کے ساتھ ہی دوبارہ شادی کا غیر مشروط حق بھی عورت کو ملنا چاہیئے، اس حق سے بیوہ بھی محروم نہ رہے۔ ساتھ ہی عورت کا ایک اہم حق یہ بھی ہے کہ دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں بھی عورت اور مرد کے درمیان مساوات قائم کی جائے۔ جان و مال اور عزت کے تحفظ کے معاملات میں بھی عورت اور مرد کے درمیان قانون کوئی امتیاز روا نہ رکھے۔

عورت اور مرد کے ان جداگانہ دائرہ ہائے عمل کے ساتھ عورت کا موقف اس قدر مستحکم بنا دیا جائے تو پھر عورت اور مرد بڑے اطمینان سے اپنے اپنے دائرہ ہائے عمل میں تمدن کی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں مغرب میں پیدا شدہ بہت سے فتنوں کا احتمال ہی نہیں رہے گا۔ عورت آنے والی النسل کی تربیت کرے گی مرد پرورش کے سامان بہم پہنچائے گا۔ ایسی صورت میں پردہ کا سوال، یا غیر ضروری اختلاط باہمی کا سوال پیدا ہی نہ ہوگا کیونکہ عورت اگر اپنے فرائض انجام دیتی رہے تو پھر اس کو اتنا وقت ہی کہاں ملے گا کہ محفلوں میں آکر بوالہوس اور عیاش مردوں کی ہوس رانیوں کا شکار رہے۔ البتہ حسب ضرورت وہ باہر جانا چاہے، یا کسی وجہ سے کوئی پیشہ

---

[1] طلاقوں کی کثرت مغرب میں خاندانی نظام کو پارہ پارہ کئے دے رہی ہے۔ ۱۲ مئی ۱۹۴۵ء کے لندنی اخبار "نیوز" نے "مجلس ہدایات نکاح (Marriage Guide)" کے صدر کا یہ بیان شائع کیا

"ہمارے ہاں ہر دو شادیوں میں ایک شادی یقیناً ناکامی پر ختم ہوتی ہے، بلکہ عجب نہیں کہ ناکامی کی شرح ۷۰ فیصد تک پہنچ گئی ہو (صدق ۱۶ جون ۱۹۴۵ء)

۱۱ نومبر ۱۹۴۵ء کے لندنی رسالہ "نیوز آف دی ورلڈ" نے یہ اطلاع شائع کی،

"امریکہ بھر میں اب تک نیواڈا کا علاقہ اپنی کثرت طلاق کے لئے مشہور تھا۔ جس میں ہر مہینہ طلاقوں کا اوسط (۵۰۰) رہتا تھا۔ اب ڈیٹرائٹ نیا ریکارڈ قائم کر کے امریکہ کا طلاقی دارالسلطنت بن گیا ہے۔ یہاں پچھلے مہینے نومبر میں طلاق کے (۱۵،۹۹) مقدمے پیش ہوئے" (صدق ۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء)

اختیار کرنا چاہے ، یا کوئی علمی خدمت انجام دینا چاہے یا ملک کی خدمت کے جوش میں دفاعی سروس میں حصہ لینا چاہے تو ہمارے خیال میں اس کو خواہ مخواہ روکنا نامناسب ہوگا۔

اس اعتدال اور رواداری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت میں وہ شدید ردِ عمل پیدا نہ ہوگا جس نے فحاشی اور جنسی طوائف الملوکی کا وہ سیلاب بہایا کہ خاندانی زندگی کی دیواریں پاش پاش ہوگئیں۔

عورت کے صحیح موقف کے تعین کی جو کوشش اس مضمون میں کی گئی ہے، اگر اس کو شاعر کی زبان میں آپ سننا چاہتے ہیں تو حضرت اقبالؒ سے سنئے جو ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ عورت سے تصویر کائنات کا رنگ قائم ہے تو دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ عورت خود افلاطون تو نہیں بن سکتی مگر ہزاروں افلاطون کو وہ پیدا کرسکتی ہے وہ حکومت تو نہیں کرسکتی لیکن بلند مرتبت اور عالی حوصلہ حکمرانوں کو جنم دے سکتی ہے، اور کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ انسانیت کی اعلیٰ ترین خدمت نہیں ہے؟

دانائے رازؒ نے ان الفاظ میں عورت کی بارگاہ میں خراج تحسین پیش کیا ہے،

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سازِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں

مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

سید خلیل اللہ حسینی ام اے (آخری)

# جواہرات کے خصوصیات اور فوائد

**تمہید** تجربہ سے ثابت ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہند میں ہزار میں ایک یا دو ایسے اشخاص ملتے ہیں جو جواہرات کے بعض ہی خصوصیات سے واقف ہوتے ہیں۔ جوہری بھی جو اسی کاروبار میں دن رات مشغول رہتے ہیں ان کو جواہرات کے ایک یا دو عام خصوصیات معلوم رہتے ہیں مثلاً رنگ چمک اور سختی۔ میرے خیال میں ہر تعلیم یافتہ شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو جواہرات عام طور پر استعمال میں آتے ہیں ان کے طبعی خصوصیات سے ضرور واقف ہو۔ حیدرآباد کے تعلیم یافتہ طبقہ کیلئے خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے سائنس کے طلبہ کیلئے عام معلومات کی خاطر چند قیمتی جواہرات اور نیم جواہرات کے خصوصیات و فوائد لکھے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ چند اُن دھاتوں کے بھی خصوصیات لکھے جاتے ہیں جو انسانی زندگی میں بہت زیادہ استعمال میں آتے ہیں۔

٥٧

## ہیرا

ہیرے کو انگریزی میں Diamond اور فرانسیسی۔ جرمنی۔ اطالوی۔ ہسپانوی زبانوں میں DIAMANT لاطینی میں ADIMAS عربی میں ماس اور الماس کہتے ہیں چینیوں کے نزدیک اس کا نام چوشماک ہے۔ لنکا میں بجرم کے نام سے موسوم ہے اور سنسکرت میں اس کو بجر کہتے ہیں۔

اکثروں کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ ماہرین کیمیا کی نظر میں ہیرے اور کوئلے کے اجزائے ترکیبی میں کوئی فرق نہیں۔ ان ماہرین نے اپنے تجربوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہیرے اور کوئلہ دونوں میں کاربن ہوتا ہے۔ ہیرا اپنی آب و تاب کے لحاظ سے ضرب المثل ہے تو کوئلہ اپنی ناشفاف حالت کی وجہ سے سیاہی میں۔ لیکن آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے کی صناعی ہر ایک کی ترتیب اپنے منشاء کے تحت جُدا جدا اور مخصوص ماحول میں کرتی ہے یہاں تک کہ ایک ہیرا اور دوسرا کوئلے کی شکل اختیار کرتا ہے۔

روئے زمین کی ساری معلومہ اشیاء میں ہیرے سے زیادہ سخت تر چیز آج تک دریافت نہیں ہوئی اسی لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اگر اس کو سندان پر رکھ کر ہتھوڑے سے ضرب لگائیں تو ہتھوڑا کانپ اٹھتا ہے اور سندان ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہے۔ اس کے باوجود سائنس دانوں نے چند طریقے اس کو توڑنے کے دریافت

کرتے ہیں۔ ہیرے کی اسی صلاحیت اور سختی کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں سال کے ہیرے آج ہم تک پہنچتے چلے آتے ہیں چنانچہ کوہ نور کا وجود اس کا گواہ ہے۔

**ہیرے کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ترکیب :۔ خالص کاربن۔

رنگ سفید یا بے رنگ بعض اوقات زرد، سرخ، نارنجی، سبز، نیلا یا بادامی۔ بہت کم ہیرے، گہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات سیاہ رنگ کا ہیرا بھی ملتا ہے۔

**کس یعنی سفوف کا رنگ** | اس کے معلوم کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی تختی استعمال کی جاتی ہے جس کو "کس تختی" (STREAK PLATE) کہتے ہیں۔ اس تختی پر جب ہیرے سے لکیر کی جاتی ہے تو تختی پر کسی قسم کا سفوف نہیں نکلتا بلکہ اس پر گہری لکیر پڑ جاتی ہے۔

**چمک** | اطلسی چمک یا روغنی۔ اس کی چمک کو ہیرے کی چمک بھی کہا جاتا ہے۔

**سختی** | یہ خصوصیت بھی "کس تختی" کی مدد سے معلوم کی جاتی ہے۔ چونکہ ہیرا سخت ترین ہے اس لئے وہ کس تختی کو کھروچتا ہے۔ اس کی سختی کی وجہ یہ ہیرا اور کانچ کاٹنے کے لئے استعمال میں آتا ہے ناخن، پیسہ اور چاقو کی مدد سے عام طور پر سختی معلوم کی جاتی ہے۔



**قلمی شکل** | اگر اس کی مکمل قلمیں مل جائیں تو وہ مکعبی (CUBIC) ہوتی ہیں جن کے رخ گول ہوتے ہیں اور ان پر باریک لکیریں پائی جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات سکونی نشانات پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر بے قلمی اور گول ٹکڑے ملتے ہیں۔

**ترکیدگی** | یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں سے کوئی جماد آسانی سے ٹوٹ سکتا ہے۔ ہیرے میں مکمل ترکیدگی پائی جاتی ہے۔ یعنی اس کو باریک سے باریک تختی میں توڑا جا سکتا ہے۔

**شکستگی** | کسی جماد کو توڑنے کے بعد جو سطح حاصل ہوتی ہے اس کو شکستگی کی سطح کہتے ہیں۔ یہ ترکیدگی کی سطح سے علی القوائم ہوتی ہے۔ ہیرے کی شکستگی کی سطح مدوری یا غیر ہموار ہوتی ہے۔

**کثافت اضافی** :۔ ۳ء۵ یعنی وزنی ہے۔

**معاشی اہمیت** :۔ ہیرا بطور نگینہ کے استعمال میں آتا ہے اور بطور رخراش کے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کنارہ دار ٹکڑے کانچ کاٹنے کے لئے استعمال میں آتے ہیں

**وقوع** :۔ ہیرا عام طور پر آبی ذخیرگی میں جو ریت یا مٹی وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے ملتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے جمادات بھی ملتے ہیں۔ یہ رسوبی ٹکڑے دار حجرات میں بھی ملتا ہے۔ دنیا کا یہ عزیز ترین جوہر پہاڑوں کی چٹانوں میں یا زمین کے اندر بنتا ہے، اور دریاؤں کی گہرائیوں میں بھی دستیاب ہوا کرتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر

اوقات بارش کی وجہ سے جب چٹانوں اور پہاڑوں پر سے پانی بہہ نکلتا ہے تو یہ بھی اپنے اصلی مقام سے پانی کی رو کے ساتھ دریاؤں میں جاگرتا ہے یا کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ریت میں بھی ملتا ہے جس مقام پر پیدا ہوتا ہے عموماً وہاں کئی طرح کی مٹی اور پتھروں کے طبقات ہوتے ہیں۔

**معدن** :۔ سب سے پہلے ہندوستان کو اس جوہر بے بہا کا علم ہوا اور پہلے پہل یہیں سے ہیرے برآمد ہوئے جبکہ کسی ملک میں الماس کا شان وگمان بھی نہ تھا اور نہ لوگوں کو اس کے متعلق کچھ معلومات بھی حاصل تھے۔ روما کا مشہور فاضل پلی نے جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے (۷۹) سال بعد کا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس کے زمانے سے چند سال قبل رومتہ الکبریٰ میں ہیرا ہندوستان سے پہنچا ہے۔ ٹیورنیر نے اپنے سفرنامہ میں "گولکنڈہ معدنوں" کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ کانیں اس قلعہ سے کافی فاصلہ پر واقع تھیں لیکن گولکنڈہ کو یہ شہرت حاصل ہونا لازمی تھا کیونکہ نہ صرف قطب شاہی سلاطین بلکہ ہندو حکمرانوں کے زمانہ میں بھی گولکنڈہ ہیروں کی تجارت کا مرکز تھا۔ اور اس کے تاجر اور فن کار جس مقام پر رہا کرتے تھے اس کو اب بھی کاروان کہا جاتا ہے جو گولکنڈہ کے راستہ میں ہے ہیرے کی کانیں دریائے کرشنا سے متصل علاقہ میں واقع تھیں جو اب اضلاع کڑپا، کرنول، بلاری اور گوداوری پر مشتمل ہیں۔ مسولی پٹم کے قریب اور کورور میں بھی ہیرے کی کانیں تھیں دریائے کرشنا سے متصل علاقوں میں جو مشہور ہیرے نکلے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) پٹ یا ریجنٹ :۔ یہ ۱۷۰۱ء میں ممالک محروسہ کے ایک مقام پرتیال میں ملا تھا۔ ابتداً اس کا وزن ۴۱۰ کیرٹ تھا بعدازاں ۱۳۷ کیرٹ رہ گیا۔ جو اس وقت فرانسیسی جمہوریہ کی ملک ہے اور اپولو گیلری میں موجود ہے اس کی قیمت کا اندازہ ۴۸۰۴ پونڈ تھا۔

(۲) نظام نور :۔ یہ ۱۸۳۵ء میں ملا تھا اس کا وزن ۴۴۰ کیرٹ تھا۔

(۳) کوہ نور :۔ یہ کولور کی کان جو دریائے کرشنا کے کنارے واقع ہے ۱۶۵۶ء میں ملا تھا۔ یہ میر جملہ کا معدن سے حاصل کردہ اور شاہجہاں کو نذر دیا ہوا ہیرا ہے۔ ناتراشیدہ حالت میں اس کا وزن (۱۹۳) کیرٹ تھا لیکن بعدازاں (۱۸۶) کیرٹ رہ گیا یہ ہیرا اس وقت شہنشاہ انگلستان کے قبضہ میں ہے۔

(۴) دی ہوپ ڈائمنڈ :۔ یہ ہیرا بھی کولور کی کان سے حاصل کیا گیا۔ اس ہیرے کو ٹیورنیر فرانس لے گیا جہاں اس نے ۱۶۴۲ء میں اسے لوئی چہاردہم کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

ہیرا دوسرے ممالک میں بھی ملتا ہے مثلاً برازل۔ امریکہ میں شمالی کیارولینا۔ جارجیا۔ ورجینا کالوراڈو۔ کیلیفورنیا اور وسکانسن۔ جنوبی افریقہ میں کمبرلی اور بورنیو میں۔ آسٹریلیا میں بھی ملتا ہے۔

حیدرآباد دکن میں ضلع رائچور میں چند ہیرے دستیاب ہوئے ہیں۔

**نوٹ** :۔ عام طور پر ہیرے کا وزن قیراط۔ کیرٹ یا ماشوں میں معلوم کیا جاتا ہے۔

قیراط کو انگریزی میں کیرٹ کہتے ہیں۔

ایک کیرٹ = ۳ گرین یا ۳/۴ رتی

۸ رتی = ایک ماشہ

۵۲ قیراط کا ایک تولہ

**فوائد** :۔ ہیرے کو گلے میں لٹکانے یا نزدیک رکھنے سے دل کو قوت پہنچتی ہے۔ خوف اور جھجک دور ہوتا ہے۔ اگر ہیرا عورت کے نزدیک ہو تو بچہ جلد تولد ہوتا ہے۔ اس کو اپنے نزدیک رکھنے سے دشمن پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ شش پہلو ہیرا مرگی کے مرض کو دفع کرتا ہے۔ صاف کیا ہوا ہیرا سب امراض کو دور کرتا ہے۔ اور بغیر صاف کئے ہوئے ہیرے کو کھانے سے کوڑھ، پسلی کا درد، یرقان، سوزش بدن کا بھاری پن، سل وغیرہ بہت عوارض پیدا ہوتے ہیں اور اکثر مہلک بھی ثابت ہوتا ہے۔ تیلیا ہیرا اور وہ ہیرا جس پر سرخ یا سیاہ دھبے ہوں وہ منحوس خیال کیا جاتا ہے۔



# زمرّد

زمرّد کو انگریزی میں EMERALD کہا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا معدنی جماد ہے اس میں بہ نسبت دوسرے جواہرات کے سختی کم ہوتی ہے اس کی کان علٰحدہ بھی ہوتی ہیں اور سونے کی کان میں سے بھی نکلتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اکیس سال کی مدت میں یہ تیار ہوتا ہے۔ زبرجد بھی اسی قسم سے ہے۔ فرق یہ ہے کہ زمرد کا رنگ سبز ہوتا ہے اور زبرجد زرد و سبز ہوتا ہے۔ پرانی کان کا زمرد زیادہ سخت اور سیاہی مائل ہوتا ہے لیکن نئی کان سے جو زمرد نکالا جاتا ہے وہ سبز اور نرم ہوتا ہے۔

## زمرّد کے طبعی خصوصیات

کیمیائی ضابطہ :۔ $Be_3Al_2(SiO_3)_6$

رنگ :۔ گہرا سبز۔ یہ رنگ کرومیم کی موجودگی کی وجہ ہے زمرد اور بھی کئی رنگ کا ہوتا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) سبز مکھی کی طرح (۲) ریحان کے پتوں کی طرح سبزی مائل یا بزردی مائل۔
(۳) سبزی مائل یا سیاہی پستے کی طرح (۴) چقندر کے پتوں کا رنگ۔
(۵) زنگاری رنگ (۶) صابن کی طرح سبزی مائل یا سفید رنگ۔

پہلی قسم یعنی سبز بہت عمدہ ہوتا ہے کیونکہ یہ نہایت صاف آبدار اور شفاف ہوتا ہے اس میں دیکھیں تو چہرے کا ہلکا سا عکس دکھائی دیتا ہے اچھے زمرد کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ سخت ہو اور اس میں کسی دوسرے جماد کے ریزے نہ ہوں اور نہ کوئی حصہ اس کا ابرک کی طرح چمکدار ہو۔ اگرچہ دھان فرنگ جس کو انگریزی میں MALACHITE کہتے ہیں سبز ہوتا ہے مگر زمرد کی سی چمک دمک نہیں رکھتا۔

کس :۔ کس تختی کو کھروچتا ہے

چمک :۔ کانچ کی چمک

سختی :۔ (۸) چاقو سے لکیر نہیں پڑتی۔

قلمی شکل :۔ ٹھوس یا شش پہلو قلمیں۔

ترکیدگی :۔ موجود نہیں

شکستگی :۔ غیر ہموار

کثافت اضافی :۔ ۲٫۵ ہلکا۔

معاشی اہمیت :۔ بطور نگینہ استعمال میں آتا ہے

**وقوع** اکثر مقامات میں زمرد رسوبی اور کایا بدل حجرات میں ملتا ہے۔

**معدن** قدیم زمانے میں زمرد شمالی مصر کی کانوں سے حاصل کیا جاتا تھا جہاں اب بھی ان کانوں کے آثار موجود ہیں۔ اب بہترین قسم کا زمرد کولمبیا میں موزو کے قریب کے کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ ان کانوں میں یہ سیاہ چونا پتھر میں سے نکلتا ہے۔ یورال کی پہاڑیوں میں ابرکی پرت دار حجرات میں سے نکلتا ہے شمالی کیارولینا میں بھی ملتا ہے۔ ٹرانسوال اور مڈگاسکر میں بھی پایا جاتا ہے۔

**فوائد** :۔ فرحت بخشتا ہے۔ حرارت عزیزی اور ارواح ودل ودماغ وجگر ومعدہ کو قوت دیتا ہے مرگی کا عارضہ دفع کرتا ہے۔ غم اور رنج کو دور کرتا ہے۔ ذات الجنب اور ذات الریہ کو مفید ہے۔ نزف الدم اور اسہال دموی، اور سخت زہروں اور کیڑے مکوڑوں کے زہروں کو نافع ہے۔ حبس بولی و استسقا کو رفع کرتا ہے۔ جنون۔ خفقان اور یرقان کو دور کرتا ہے۔ سنگ گردہ ومثانہ کو خارج کرتا ہے۔ جس نے زہر کھایا ہو یا زہریلے جانور نے کاٹا ہو تو زہر کے سرایت کرنے کے قبل آٹھ جو برابر خوب پیس کر مریض کو کھلائیں تو زہر اثر نہیں کرتا۔ زمرد کو پیس کر آنکھ میں لگانے سے بینائی کو قوت پہنچتی ہے اسکی انگوٹھی پہننا مرگی کے لئے مفید ہے۔ سونے کی انگوٹھی پر اس کا نگ جڑ کر پہننے سے طاعون کا مرض نہیں ہوتا بچوں کے گلے میں لٹکانے سے ام الصبیان کا عارضہ پیدا نہیں ہوتا اس کو دوسری دواؤں میں ملا کر سر پر لگانے سے گنج اور سر کی بھوسی دفع ہوتی ہے۔ مرہم میں اس کو شریک کرنے سے خراب زخم بھر جاتے ہیں۔ متقدمین نے

لکھا ہے کہ اگر افعی کے سامنے رکھیں تو اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگے اور اگر بالکل آنکھ کے قریب رکھیں تو اندھا ہو جائے۔

# یاقوت

یاقوت کو انگریزی میں (GARNET) کہا جاتا ہے یہ مشہور جواہرات میں سے ہے۔ یہ کئی رنگ کا ہوتا ہے مثلاً سرخ، زرد، سبز، پستی، سفید و نیلا۔ سیاہ یاقوت کو کحلی کہتے ہیں۔ سرخ رنگ سب میں بہتر ہے کہا جاتا ہے کہ نوشیروان کے خزانے میں ایک یاقوت "شب افروز" تھا اس کو کوکب کے لقب سے ملقب کیا گیا تھا شب تاریک میں یہ چراغ کی طرح نظر آتا تھا۔ سلطان ابراہیم کے پاس بھی ایسے یاقوت تھے۔ سرخ کو ہندی میں مانک اور زرد کو پکھراج اور نیلے کو نیلم کہتے ہیں۔ زیتونی سبز رنگ کو (OLIVINE) آلیوین کہتے ہیں سرخ اور قرمزی کو (CAPE RUBY) کیپ روبی کہتے ہیں۔

یاقوت کے طبعی خصوصیات | کیمیائی ضابطہ $3FeO.Al_2O_3.3SiO_2$

رنگ :- سرخ، بادامی، زرد، سفید، سبز، سیاہ

کس :- سفید

چمک :- شیشے کی چمک

سختی :- ۶/۵ - چاقو سے کھرچا جا سکتا ہے۔

قلمی شکل :- عام طور پر بے قلمی۔ بعض اوقات مکعبی قلم

ترکیدگی :- بعض ہی نمونوں میں پائی جاتی ہے۔

شکستگی :- غیر ہموار

کثافت اضافی :- ۳/۱۵



معاشی اہمیت :- مختلف رنگ کے یاقوت بحیثیت نیم جواہر کے نگینوں میں استعمال میں آتے ہیں۔ بعض اوقات اس کو بحیثیت فراش کے استعمال کرتے ہیں۔ گھٹیا قلمیں گھڑیوں میں جڑے جاتے ہیں۔ اس کا باریک سفوف نرم پتھر اور شیشہ صاف کرنے اور پالش کے لئے استعمال میں آتا ہے۔

**وقوع** | یاقوت بہت ہی عام ہے۔ یہ عام طور پر بحیثیت حجر ساز جماد مختلف حجرات میں ملتا ہے۔ خاص طور پر کایا بدل حجرات میں ملتا ہے۔ اور قلیاتی چونا پتھر میں بھی ملتا ہے اور دوسرے آتشی حجرات میں بھی ملتا ہے۔

**معدن** | حیدرآباد دکن میں غریب پیٹھ کے علاقہ میں سرخ رنگ کا یاقوت ملتا ہے۔ عرصہ دراز سے اس مقام کا

یاقوت نگینہ سازی کی صنعت میں استعمال میں آتا ہے۔ ضلع ورنگل میں کھمم سنگرگڑھ۔ یلندو اور پالونچہ میں بھی ملتا ہے بعض سیاہ یاقوت ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں ملتا ہے۔ جے پور میں اس کی پرانی کانیں پائی جاتی ہیں اراولی پہاڑ کی پرت دار چٹانیں اور اس کی دریا بھی یاقوت کی ماخذ ہیں ریاست کشن گڑھ میں سرور کے مقام سے ہندوستان کا بہترین یاقوت نکلتا ہے۔ یہ کانیں اراولی پہاڑ میں ایک میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تقریباً اسی سال قبل ان کانوں سے اس ریاست کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ ۱۹۱۵ء کے بعد یہاں سے یاقوت نکلنا بند ہوگیا۔ امریکہ کے اکثر مقامات میں یاقوت ملتا ہے۔

**فوائد** :۔ یاقوت دل کو قوت اور تفریح پہونچاتا ہے اور زہروں کا اثر دور کرتا ہے۔ یاقوت کو نزدیک رکھنے اور منہ میں لینے سے بھی تفریح پیدا ہوتی ہے۔ خون کو روکتا ہے۔ اگر بچے کے پاس رکھیں تو اسے ام الصبیان کا عارضہ واقع نہ ہو۔ بڑے آدمی کے پاس رکھنے سے مرگی کا مرض دور ہوتا ہے۔ اور جس کو مرگی کا عارضہ نہ ہو اس کے پاس رکھنے سے وہ اس سے محفوظ رہتا ہے۔ منہ کی بدبو اور پیاس بجھاتا ہے۔ پسینے کی بدبو دور کرتا ہے۔ اس کو ورم پر باندھنے سے تحلیل ہوجاتا ہے دوسرے اعضائے رئیسہ کو بھی قوت پہونچاتا ہے۔ وسواس خفقان اور طاعون کے دفع کرنے کے لئے اس کو پیس کر کھانا چاہیئے۔ اگر پیٹ کے اندر خون جم جائے تو یاقوت بالخاصہ اس جمے ہوئے خون کو تحلیل کر دیتا ہے، کسی عضو سے خون آتا ہو تو اسے روک دیتا ہے۔ خون کو صاف کرتا ہے۔ وبائی ہوا کے امراض کو دفع کرتا ہے۔ اس کو سرمے میں ملا کر آنکھ میں لگانے سے نگاہ کو قوت حاصل ہوتی ہے اور آنکھ کی صحت قائم رہتی ہے۔ اس کو انگوٹھی میں لگا کر پہننے سے صاعقہ اور طاعون سے محفوظ رہتے ہیں۔

# لعل

لعل کو انگریزی میں ( Ruby ) کہا جاتا ہے۔ یہ کئی قسم کا ہوتا ہے مثلاً رمانی، پیازی، ثمری، لحمی، عنابی، ادریسی، دوشالی، پیکانی، عقربی اور قطبی، اس کا رنگ یاقوت کے رنگ سے کم سرخ ہوتا ہے۔ اور نرم بھی ہوتا ہے۔ اس کا شمار قیمتی جواہرات میں ہوتا ہے۔ خوش رنگ اور بے عیب ٹکڑے قیمتی ہوتے ہیں۔

لعل کے طبعی خصوصیات | کیمیائی ضابطہ :۔ $Al_2O_3$

اس میں سرخی کرومیم دھات کی تھوڑی سی مقدار میں موجودگی کی وجہ ہے۔

رنگ :۔ سرخ

کس :- بیرنگ
چمک :- اطلسی یا کانچ کی چمک
سختی :- سخت ہے چاقو سے کھرو جا سکتا ہے.
قلمی شکل :- دانہ دار
ترکیدگی :- موجود نہیں
شکستگی :- غیر ہموار
کثافت اضافی :- ۳٫۹
معاشی اہمیت :- بطور نگینہ کے استعمال میں آتا ہے۔

وقوع | لعل اکثر کایابدلی حجرات میں ملتا ہے۔ مثلاً GNEISS SCHIST یا سنگ مرمر۔ آتشی حجرات میں بھی ملتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے جمادات بھی موجود ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پر ریت میں بھی ملتا ہے۔

معدن | لعل کی سب سے مشہور کان مقام موگاک ( MOGOK ) برما میں ہے۔ سیام میں بانگ کاک ( BANG KOK ) کے مقام پر بھی اچھے لعل ملتے ہیں لنکا میں بہت کم ملتا ہے۔ یہ افغانستان، ہندوستان چین۔ یورال کی پہاڑیاں کوئینس لینڈ اور شمالی کیارولینا میں ملتا ہے یہ دکن میں بھی ملتا ہے۔ بدخشاں میں دوسرے ملکوں سے لایا جاتا ہے بدخشانی لعل میں سرخی و سختی و چمک دوسرے سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی یاقوت کی ایک قسم ہے۔

فوائد :- لعل روح کو فرحت دیتا ہے، دل و دماغ اور قوائے نفسانی وطبعی کو اور اعصاب اور نظر کو قوت دیتا ہے۔ یہ یاقوت سے زیادہ قوی الاثر ہے۔ کسی عضو سے خون جاری ہو تو یہ بند کر دیتا ہے۔ بواسیر کا خون بھی رک جاتا ہے۔ جملہ سوداوی امراض میں مفید ہے۔ اکثر سمیات کا تریاق ہے۔ مرگی اور خفقان کو نافع ہے۔ حرارت غریزی کی محافظت کرتا ہے۔

# نیلم

نیلم کو انگریزی میں Sapphire کہتے ہیں۔ یہ ایک قیمتی جماد ہے جو سخت ہوتا ہے۔

نیلم کے طبعی خصوصیات | کیمیائی ضابطہ :- $Al_2O_3$
رنگ نیلا، یہ رنگ ٹائٹینیم ( Titanium ) کی موجودگی کی وجہ سے ہے۔
اس کے دوسرے تمام خصوصیات بالکل لعل کے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی انھیں حجرات میں ملتا ہے جن

میں مل جاتا ہے اکثر مقامات پر دونوں ایک ہی جگہ ملتے ہیں۔

**معدن** | نیلم حیدرآباد میں امرآباد اور فرخ آباد ضلع محبوب نگر میں ملتا ہے، اس کی کانیں کشمیر میں پاڈر کے مقام پر پائی جاتی ہیں جو سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ بلند ہے ۱۸۸۱ء میں یہ کانیں اتفاقیہ طور پر گڈریوں نے دریافت کیں۔ پانچ سال تک کھدائی ہوتی رہی اور نیلم نکلتے رہے۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک کسی نے ادھر توجہ نہ کی۔ ۱۹۰۶ء میں حکومت کشمیر نے دوبارہ کان کنی شروع کی۔ اس کان سے دو انچ لانبے نیلم نکلے ہیں۔ قدرتی حالت میں یہ نیلم مٹی کی ایک پتلی پرت سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ کشمیر کے نیلم کا رنگ ہلکے نیلگوں رنگ سے گہرے آسمانی رنگ تک ہوتا ہے۔ لیکن یہ نیلم بڑھیا قسم کا اور قیمتی نہیں ہوتا۔ اچھے قسم کا نیلم سیام اور لنکا میں ملتا ہے۔ دوسرے ممالک مثلاً جاپان۔ امریکہ اور افریقہ میں بھی ملتا ہے۔

**فوائد** :۔ نیلم تفریح پیدا کرتا ہے۔ اور دماغ کو قوت دیتا ہے۔ وسواس اور خفقان کو نافع ہے۔ خاص طور پر آنکھ کو قوت دیتا ہے۔ فساد زہر اور پھوڑے پھنسی کو دفع کرتا ہے۔ دمہ۔ کھانسی۔ صفرا۔ بخار اور بواسیر کو دور کرتا ہے۔

# پکھراج

۵

پکھراج کو انگریزی میں ( Topaz ) کہتے ہیں۔ یہ ایک قیمتی پتھر ہے۔ اور یہ یاقوت زرد کا نام ہے

**پکھراج کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :۔ $(AlF)_2SiO_4$

رنگ :۔ پیلا، سفید، ہلکا خاکی، ہلکا سبز، ہلکا نیلا یا ہلکا سرخ ۔

کس :۔ بیرنگ ۔

چمک :۔ کانچ کی چمک ۔

سختی :۔ ۸ بیحد سخت ۔ چاقو کا کوئی اثر نہیں ۔

قلمی شکل :۔ لانبی قلمیں جن پر لکیریں پائی جاتی ہیں یا باریک اور کھردرے دانہ دار

ترکیدگی :۔ موجود ہے ۔

شکستگی :۔ غیر ہموار

کثافت اضافی :۔ ۴ء۳

**معاشی اہمیت** | جوہری زرد یا ہلکے رنگ کا پکھراج پسند کرتے ہیں، زمانہ قدیم میں بہت پسند کیا جاتا تھا، اب اس کی وہ قدر و قیمت نہیں رہی۔ اب صرف گھڑیاں یا کم قیمت زیورات میں جڑا جاتا ہے۔

**وقوع** | پکھراج عام طور پر ترشائی آتشی حجرات میں ملتا ہے۔ مثلاً گرانٹ۔ یہ یا تو رگ کی شکل میں ملتا ہے یا جوف میں ملتا ہے۔

**معدن** | پکھراج، روس۔ لنکا۔ جنوبی ویلس۔ جاپان اور امریکہ میں ملتا ہے۔ برازیلی پکھراج وزن دار۔ سخت اور بڑھیا قسم کا ہوتا ہے۔ رگڑنے سے برقایا جا سکتا ہے۔ پکھراج رانگے کی کچ دھات کے ساتھ ملتا ہے۔

**فوائد**:۔ پکھراج حرارت معدہ و غریزی کو بڑھاتا ہے۔ زہر، قے، بلغم۔ ضعف ہاضمہ و اشتہا، جذام، فساد خون اور بواسیر کے لئے مفید ہے۔ بدن کی طاقت کا محافظ ہے۔ اور قوت دیتا ہے۔ عقل بڑھا کر عمر اور زندگی کو دراز کرتا ہے۔

# فیروزہ

فیروزہ کو انگریزی میں ( TURQUOISE ) کہتے ہیں۔ یہ ایک معدنی جماد ہے جس کا رنگ سبز زردی مائل ہوتا ہے جس کے عام طور پر نگینے بنائے جاتے ہیں۔ اس کے حسب ذیل اقسام ہوتے ہیں:۔

(۱) سب میں بہتر وہ ہے جس کا رنگ صاف ہو۔ قدیم اور بڑا ہو۔ ہوا صاف ہو تو صاف نظر آئے اور ہوا مکدر ہو تو وہ بھی مکدر نظر آئے۔ یہ خوبی نیشاپوری فیروزہ میں ہے۔ جس کو بو اسحاقی کہتے ہیں۔ یہ نام ایک کان کے نام سے موسوم ہے۔

(۲) فتحی (۳) زہری (۴) سلیمانی (۵) درتوئی (۶) آسمانی یا خاکی (۷) عبدالحمیدی (۸) اندلسی (۹) گنجینہ جو سب سے بدتر ہے۔ یہ قسم ہندوستان میں بھٹنڈے کے پہاڑوں میں ملتا ہے۔

**فیروزہ کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ:۔ $CuO, 3Al_2O_3, 2P_2O_5, 9H_2O.$

رنگ:۔ آسمانی نیلا یا نیلگوں سبز یا سیبی سبز یا سبزی مائل خاکی

کسل:۔ سفید یا سبز

چمک:۔ روغنی اور غیر شفاف

سختی:۔ ۵ تا ۶ سخت لیکن پھونک۔ چاقو سے لکیر پڑتی ہے

قلمی شکل:۔ چھوٹے زاویہ دار قلمیں یا گردہ نما قلمیں یا نقلمی۔

ترکیدگی:۔ قلمی صورت میں موجود ہے۔

شکستگی:۔ غیر ہموار یا صدفی یا مرغول دار

کثافت اضافی:۔ ۲،۶

**معاشی اہمیت**:- بطور نگینہ کے استعمال میں آتا ہے یہ قدیم زمانہ کا جواہر ہے بڑا خوشنما ہوتا ہے جواہرات میں دوسرے درجہ پر شمار ہوتا ہے اور پائدار نہیں۔ گرم کرنے پر پانی خشک ہو جانے سے بدرنگ ہو کر سیاہ پڑ جاتا ہے مگر پگھلتا نہیں۔ ترشہ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

**وقوع**: مختلف قسم کے حجرات میں باریک رگوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ عموماً اُن حجرات میں زیادہ ملتا ہے جن پر کایا بدلی کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

**معدن**: کئی مقامات میں فیروزہ کی کانیں پائی جاتی ہیں مثلاً نیشاپور، مجند۔ شیاوک۔ کرمان۔ آذربائیجان کوہستان۔ شیرازہ اور ہندوستان میں جھنڈے کے پہاڑوں میں ملتا ہے۔ خراسان۔ سائبریا۔ ثمرقند ترکستان فرانس اور امریکہ میں بھی ملتا ہے۔ کانوں سے نکلا ہوا فیروزہ اگر نیلا ہو تو اس کا یہ رنگ اس وقت اس وقت تک قائم رہتا ہے۔ جب تک کہ وہ سرد رکھا جاتا ہے۔ جونہی یہ خشک ہو جاتا ہے رنگ ہلکا ہو جاتا ہے۔ آجکل ایران میں نیشاپور کے پہاڑیوں سے نکالا جاتا ہے یہ نیشاپوری فیروزہ بھی کہلاتا ہے فیروزہ کی کٹائی مشہد میں ہوتی ہے۔ یہاں سے ہرات اور قندھار کے راستے ہندوستان آتا ہے۔ کچھ فیروزہ تبت اور لداخ سے براہ کشمیر ہندوستان آتا ہے زمانہ قدیم میں فیروزہ ہندوستان میں نکلتا تھا۔ اصلی خوش رنگ فیروزہ قیمتی ہوتا ہے۔ شیرازہ اور کرمان کی کانوں سے جو فیروزہ نکلتا ہے اس کا رنگ سفیدی مائل ہوتا ہے جس کو شیانی اور شیر بوم کہتے ہیں اور نیشاپور کے فیروزہ میں نیلاپن ہوتا ہے اس لئے اس کو نیل بوم کہتے ہیں کرمان کا فیروزہ نرم ہلکا اور کمزور ہوتا ہے جو جلد خراب ہو جاتا ہے۔

**فوائد**:- فرحت اور روح کو قوت بخشتا ہے۔ اس کو آنکھ میں لگانے سے بصارت میں قوت آتی ہے آنکھ کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے اور آنکھ کی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ دل، دماغ اور معدہ کو قوت دیتا ہے اجابتوں کو بند کر دیتا ہے۔ آنتوں کے زخم کو دور کرتا ہے اس کو گلے میں لٹکانے سے خاص طور پر دل کو قوت پہنچتی ہے۔ اور خوف دور ہوتا ہے۔ دشمن پر فتحمندی کا باعث ہوتا ہے۔ مرگی اور تاپ تلی کو فائدہ ہوتا ہے۔ ۲ ½ ماشہ فیروزہ شراب کے ساتھ کھانے سے ہر قسم کے زہر کو دور کرتا ہے اور نورتی فیروزہ کی انگوٹھی پہننے سے کوئی شخص خوش و خرم رہتا ہے اور کسی شخص کو یہ غریب سے غریب کر دیتا ہے۔

## یشب

یشب کو انگریزی میں ( JASPER ) کہا جاتا ہے۔ یہ جماد خورد بینی قلمیاتی سلیکا کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کئی رنگ کا ہوتا ہے سب سے بہتر سبز زیتونی ہے۔ اس کے بعد سبز زردی مائل۔ اور سبز سفیدی مائل اور

اور سرخ۔ غرض کہ جتنا صاف سخت اور شفاف ہو بہتر ہے۔ یشب پٹہ دار بھی ہوتا ہے اور ہر ایک پٹہ مختلف رنگ کا ہوتا ہے جب یشب میں رنگین چوڑے پٹے یا دھاریاں ہوتی ہیں تو اس کو Ribband Jasper یا دھاری دار یشب کہتے ہیں مصری یشب زرد یا بادامی رنگ کا ہوتا ہے اور اس کی دھاریں کسی خاص ترتیب میں نہیں پائی جاتیں۔

**یشب کے طبعی خصوصیات** - کیمیائی ضابطہ :- $SiO_2$

| | | |
|---|---|---|
| رنگ | :- | سبز، زردی مائل سبز، سفیدی مائل سبز یا سرخ |
| کس | :- | بیرنگ |
| چمک | :- | کانچ کی چمک |
| سختی | :- | سخت اس پر چاقو کا کوئی اثر نہیں۔ |
| قلمی شکل | :- | پٹہ دار یا علٰحدہ علٰحدہ قلمیں جن میں سے دھوئیں کی بو آتی ہے |
| ترکیدگی | :- | موجود نہیں |
| شکستگی | :- | غیر ہموار |
| کثافت اضافی | :- | ۲٫۶ |

**معاشی اہمیت** اس کی انگوٹھیاں۔ پیالے اور دیگر قسم کے ظروف تیار ہوتے ہیں۔

**وقوع** آتشی حجرات میں رگوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

**معدن** دنیا کے اکثر ممالک میں یہ دستیاب ہوتا ہے۔

**فوائد** :- یشب کو پیس کر پینے سے دل اور معدہ کو قوت پہنچتی ہے۔ معدہ کے درد اور ضعف کو دور کرنے کے لئے بے نظیر چیز ہے پیچش اور پیشاب کی سوزش اور سنگ گردہ و مثانہ کو مفید ہے۔ باطنی زخموں کو دور کرتا ہے اگر منہ سے خون آئے تو اس کو بند کردیتا ہے۔ اس کو دل پر لٹکانے سے خفقان اور وسواس دور ہوتا ہے معدہ پر لٹکانے سے معدہ کو قوت آتی ہے۔ گلے میں لٹکانے سے خناق کو تحلیل کرتا ہے۔ زچہ کی ران میں باندھنے سے بچہ پیدا ہونے میں سہولت ہوتی ہے انگوٹھی میں رکھنے سے بجلی کے گرنے اور نظر بد سے امن میں رہتے ہیں۔ اس کو منہ میں رکھنے سے پیاس کو تسکین ہوتی ہے۔

## عقیق

عقیق کو انگریزی میں ( AGATE ) کہتے ہیں یہ ایک مشہور رنگین چمکدار جماد ہے۔ یہ کئی رنگ کا ہوتا

ہے مثلاً سُرخ ۔ زرد ۔ سفید اور سیاہ ۔ عقیق جس وقت کان سے نکلتا ہے ہلکے رنگ کا ہوتا ہے لیکن جب اس کو گرم کیا جاتا ہے تو یہ گہرا رنگ اختیار کرتا ہے ۔ جو قلمیں صاف گہرے رنگین اور یک رنگ ہوتے ہیں وہ عمدہ ہوتے ہیں اس میں اعلیٰ قسم وہ ہے جو بہت سرخ یا زرد اور شفاف ہو ۔ جن قلموں کے جسم میں شاخ درخت یا پہاڑ وغیرہ کی شکل موجود ہو تو اس کو شجری کہتے ہیں ۔ اور جس قلم میں مختلف رنگ کے پرت ہوتے ہیں اس کو جزع کہتے ہیں ۔ عقیق کو تراشنے سے بعد سطح پر مدور یا غیر مدور خطوط نظر آئیں تو اس کو سنگ سلیمانی ( ONYX ) کہتے ہیں اس میں صرف سفید و سیاہ دو ہی رنگ کے پرت ہوتے ہیں ۔ اور جب سبز اور زرد رنگ کے پرت یا خطوط ہوتے ہیں تو اس کو ہندی میں لہسنیا ( CATS EYE ) کہا جاتا ہے ۔

**عقیق کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :- $SiO_2$ نیلگوں ۔

رنگ :- باریک متوازی حسب ذیل رنگوں کی پرتیں یا دھاریاں ' سفید ' ہلکا یا گہرا بادامی '

کس :- بیرنگ

چمک :- کانچ کی چمک

سختی :- ( ۷ ) اس پر چاقو کا کوئی اثر نہیں ۔

قلمی شکل :- پٹی دار یا دھاری دار یا گروہ نما پٹیاں اور دھاریاں سیدھے یا ٹیڑھے یا مدوری ہوتے ہیں ۔ جب آنکھ کی شکل کا قلم ہو تو اس کو آنکھ نما عقیق کہتے ہیں ۔

ترکیدگی :- موجود ہے ۔

شکستگی :- غیر ہموار

کثافت اضافی :- ۲۶۶

**معاشی اہمیت** | بطور نگینہ استعمال میں آتا ہے عقیق پر کئی قسم کی گلکاری ہوتی ہے ۔ اس کی مہریں ۔ چاقو اور تلوار کے دستے بنتے ہیں ۔ پیالیاں بنائی جاتی ہیں ۔ کیمیائی تجربہ خانوں میں جمادات پیسنے کے لئے چھوٹے چھوٹے ہاون دستے بنائے جاتے ہیں ۔

**وقوع** | چونکہ یہ سیلیکا کے محلول سے تیار ہوتا ہے اس لئے عام طور پر حجرات کے خلاؤں میں ملتا ہے ۔

**معدن** | اس کی کان یمن میں ہے ۔ دریائے روم کے کنارے پر بھی ملتا ہے ۔ گریمنی بہترین ہے جو عقیق صاف ہو شفاف ہو وہ صرف یمنی ہی ہو سکتا ہے ۔ جس عقیق میں پٹے ہوں اس کو پٹہ دار عقیق کہتے ہیں ۔ جرمنی میں اس کی بہترین تراش ہوتی ہے ۔ یہ ہندوستان میں گجرات میں راج پپلی کے مقام پر ملتا ہے ۔ حیدرآباد دکن میں بھی اکثر مقامات میں ملتا ہے ۔

**فوائد:** عقیق عام طور پر دواؤں میں استعمال میں آتا ہے اور انگوٹھیوں میں بھی لگایا جاتا ہے عقیق بارہ رتی پیس کر تنہا یا شربت سیب کے ساتھ کھائیں تو تقویت دل اور خفقان کو دور کرنے کے لئے مفید ہے۔ اس کو سرمے میں شریک کرنا یا تنہا استعمال کرنا بینائی کو قوت دیتا ہے۔ اس کو ملا کر دانتوں پر ملنے سے دانتوں کی جڑوں سے خون نکلنا بند ہوجاتا ہے اور مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کی راکھ کو زخم پر ڈالنے سے فوراً خون رک جاتا ہے۔ اس کی انگوٹھی پہننے سے غضب و غصہ کم ہوجاتا ہے اور غم دور ہوتا ہے۔ اور دشمن کی نظر میں ہیبت وقار پیدا ہوتا ہے۔

# دودھیا پتھر

دودھیا پتھر کو انگریزی میں OPAL کہتے ہیں۔ اس میں تقریباً نوے فیصد سلیکا اور دس فیصد پانی ہوتا ہے۔ یہ نقلمی ہوتا ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں روشنی کے تداخل سے رنگدار جھلک پیدا ہوتی ہے۔ اس کی سطح کا انعطاف پانی کی مختلف مقدار ہونے کی وجہ مختلف ہوتا ہے اس لئے انعکاس شعاع سے بالکل ایسے رنگ پیدا ہوتے ہیں جیسے کہ صابن کے بلبلے میں

**دودھیا پتھر کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ $SiO_2 n H_2O$

رنگ :- سفید، زرد، سرخ، بادامی، سبز، خاکی یا نیلا، عام طور پر ہلکے رنگ کا ہوتا ہے اور بعض ہی اوقات گہرے رنگ کا۔ اور بعض نمونوں میں مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔

کس :- سفید

چمک :- کانچ یا موتی کی چمک

سختی :- ۵٫۵

قلمی شکل :- نقلمی یا چھوٹے چھوٹے گردہ نما ٹکڑے۔

ترکیدگی :- موجود نہیں

شکستگی :- صدفی۔

کثافت اضافی :- ۱٫۹

**معاشی اہمیت** | رنگین اقسام بطور نگینے کے استعمال میں آتے ہیں۔

**وقوع** | یہ ایک نقلمی جماد ہے جو کم درجہ حرارت پر ایسے پانی سے تیار ہوتا ہے جس میں سلیکا ملا ہوا ہوتا ہے۔ یہ

آتشی رسوبی اور کایا بدل حجرات میں ملتا ہے یہ عام طور پر آتشی حجرات کے شگافوں میں ملتا ہے اور دوسرے جمادات کی رگوں میں بھی ملتا ہے۔ گرم پانی کے چشموں سے بھی دھانے کے قریب تیار ہوتا ہے۔

**معدن** | پہلے پہل دودھیا پتھر صرف ہنگری میں ملتا تھا۔ جہاں یہ ثالثی لاوا کے جوف میں سلیکا بھرنے سے تیار ہوا تھا۔ اب آسٹریلیا میں نیو ساوتھ ویلز کے مقام پر کانوں سے نکالا جاتا ہے یہ بہت خوش رنگ ہوتا ہے اور قیمتی بھی ہوتا ہے۔ میکسیکو کا دودھیا پتھر بھی بہت خوشنما ہوتا ہے لیکن مسامدار ہونے کی وجہ سے جلد خراب ہوجاتا ہے اور سردی سے بدرنگ ہوجاتا ہے۔ اور کثرت استعمال سے اس کا رنگ اور چمک ومک جاتی ہے۔

**فوائد** :- بچوں کے گردن میں لٹکانے سے یہ ڈرتے نہیں۔

# زبرجد

زبرجد کو انگریزی میں BERYL کہتے ہیں۔ یہ زمرد کی ایک قسم ہے اور اسی کے ساتھ ملتا ہے بونے کی کان میں سے بھی نکلتا ہے۔ سبز اور زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ سبز رنگ کا شفاف۔ صاف اور سخت بہترین ہوتا ہے زرد رنگ کا بہت ہلکا ہوتا ہے اور حرارت سے خراب بھی ہوجاتا ہے۔ زبرجد کا رنگ زردی مائل سبز اور زردی مائل سرخ بھی ہوتا ہے۔ ہلکے سبز کو مصری اور زردی مائل سبز کو قبرسی اور زردی مائل سرخ کو ہندی کہتے ہیں۔ ہر قسم کا زبرجد زمرد سے کم قیمت ہوتا ہے۔

**زبرجد کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :- $3BeO \cdot Al_2O_3 \cdot 6SiO_2$

رنگ :- زمردی سبز۔ ہلکا سبز۔ ہلکا نیلا۔ پیلا۔ سفید اور ہلکا سرخ

کس :- سفید

چمک :- کانچ یا گوند کی چمک۔

سختی :- (۷) چاقو کا اس پر کوئی اثر نہیں۔

قلمی شکل :- مسدس پہلو

ترکیدگی :- نامکمل

شکستگی :- غیر ہموار

کثافت اضافی :- ۲،۶

**معاشی اہمیت** | شفاف نمونے بطور نگینہ کے استعمال کئے جاتے ہیں۔

**وقوع** | آتشی حجر گرانٹ میں کثرت سے ملتا ہے۔ ٹین کی کچدھات کے ساتھ بھی ملتا ہے۔

معدن | آسٹریلیا۔ بوریا۔ آسٹریا اور جنوب مغربی آفریقہ میں ملتا ہے۔ امریکہ میں البنی کے مقام پر اٹھارہ فٹ لانبا اور چار فٹ قطر اور اٹھارہ ٹن وزن کا ایک قلم دستیاب ہوا تھا۔ اور گرافٹن کے مقام پر چار فٹ لانبا اور تین ہزار پونڈ وزن کا ایک قلم ملا تھا۔

**فوائد** :- اس کے خواص و فوائد زمرد کی طرح ہیں۔ مفرح ہے اور خون کو روکتا ہے۔ اگر پیشاب رک جائے تو اس سے جاری ہو جاتا ہے۔ پتھری کو توڑ کر نکال دیتا ہے۔ بینائی کو قوت دیتا ہے۔ کوڑھ کو دفع کرتا ہے اس کو گلے میں لٹکانے سے مرگی کا مرض دور ہوتا ہے۔ عورت کو بچہ تولد ہونے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کو انگوٹھی میں پہننے سے تفریح حاصل ہوتی ہے اور رنج و خوف دور ہوتا ہے جن کے آسیب اور نظر کے لگنے کو بھی یہ انگوٹھی دفع کرتی ہے۔ اس کے برتن میں شراب رکھ کر پینے سے نشہ نہیں ہوتی۔ اگر اس کو ہمیشہ دیکھتے رہیں تو بینائی تیز ہوتی ہے۔ اس کو پیس کر کھانے سے دل میں طاقت آتی ہے۔ اگر کسی نے زہر کھا لیا ہو یا کوئی زہریلا کیڑا کاٹا ہو تو اس کے پینے سے زہر دور ہو جاتا ہے۔ اگر مار گزیدہ کو کرنڈ ( Corundum ) کے پتھر بکری کے دودھ میں گھس کر پلادیں تو زہر اتر جاتا ہے۔

۴۲

# لہسنیا

لہسنیا کو انگریزی میں ( CATS EYE ) کہتے ہیں کیونکہ یہ بلی کی آنکھ سے بہت ملتا جلتا ہے یہ ایک نادر صفت جوہر ہے جس کو عربی میں عین الہر کہتے ہیں۔ اس کے اندر ایک تار دھاری ہوتی ہے۔ اصل جواد کا رنگ کچھ بھی ہو اس دھاری کا رنگ ہمیشہ سفید ہوتا ہے اور یہ دھاری دھوپ میں خوب چمکتی ہے۔ اور گھمانے سے لہروں کی طرح چمکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے اندر ایک بے قرار بھوت مقید ہے اس لئے قدیم زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا کہ اس کے اندر ایک جن مقید ہے۔ لہسنیا کا رنگ سرخ۔ سبز سیاہ یا بھورا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لہسن کی پتی کی طرح ہوتا ہے اس لئے لہسنیا کہلاتا ہے۔ سخت اور شفاف عمدہ ہوتا ہے اور ہندو اس کو مبارک سمجھتے ہیں۔

**لہسنیا کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :- $SiO_2$

رنگ :- سرخ۔ سبز یا سیاہ

کس :- بیرنگ

چمک :- کانچ کی چمک

سختی :- (۷) چاقو سے لکیر نہیں پڑتی۔

قلمی شکل :- بے قلمی

ترکیدگی :- موجود نہیں
شکستگی :- غیر ہموار یا صدفی
کثافت اضافی :- ۲۱۶

معاشی اہمیت | بطور نگینہ کے استعمال میں آتا ہے۔
وقوع | اکثر آتشی حجرات کی رگوں میں ملتا ہے۔
معدن | یہ یاقوت کی معدن میں ملتا ہے اور کبھی بھی عقیق کے ساتھ نہیں ملتا جیسا کہ اکثر سائنس دانوں کا خیال ہے کہ لسنیا ہندوستان میں مغربی گھاٹ اور لنکا سے آتا ہے کوہ یورال میں بھی اچھا لسنیا ملتا ہے۔ اس کی قیمت کا انحصار اس کے رنگ اور دھاری کی چمک پر ہے عموماً سبز یا زیتونی رنگ کا لسنیا پسند کیا جاتا ہے۔ یورپ میں اس کا بہت رواج ہے۔
فوائد :- قولنج دفع کرتا ہے۔ خشکی پیدا کرتا ہے۔ جمالی بھی ہے یرقان کو مفید ہے۔ اس کو پیس کر آنکھ میں لگانے سے نزول کی بیماری دفع ہوتی ہے۔ صفراوی خون۔ صفراوی درد۔ پیٹ کے امراض۔ بلغم اور بادی کو دور کرتا ہے۔ عقل۔ عمر طاقت اور اشتہا کو بڑھاتا ہے۔ ہاضمہ کو درست کرتا ہے۔ معدہ کو قوت پہنچاتا ہے اور آنکھ کے زخموں کے لئے بھی مفید ہے۔

۳

# دھان فرنگ

دھان فرنگ کو انگریزی میں MALACHITE کہتے ہیں۔ اس کو زنگار فرنگی اور زنگار معدنی بھی کہتے ہیں۔ یہ سونے۔ چاندی۔ تانبے اور لوہے کی کان میں سے نکلتا ہے۔ طلائی۔ نقرئی۔ مسی اور آہنی میں فرق یہ ہے کہ لیمو کے رس کے ساتھ صیقل دار لوہے مثلاً چھری یا تلوار پر گھسیں اگر زرد رنگ دے تو طلائی۔ سفید تو نقرئی۔ تانبے کا رنگ ہو تو مسی لوہے کا رنگ ہو تو آہنی کہتے ہیں۔ طلائی سب میں بہتر ہے۔ یہ کئی رنگ کا ہوتا ہے مثلاً سبز کہ جب ہوا صاف ہو تو صاف نظر آتے اور اگر ہوا میں گرد و غبار ہو تو میلا دکھائی دیتا ہے (۲) طاوسی سرخی مائل اور شفاف (۳) طاوسی زردی مائل (۴) طاوسی سیاہی مائل۔

دھان فرنگ کے طبعی خصوصیات | عام کیمیائی ضابطہ :- CuCO Cu-(OH)

رنگ :- گہرا سبز
کس :- ہلکا سبز
چمک :- کانچ یا اطلسی چمک یا مدھم

سختی :- ۵ ء ۳ - پیسے سے لکیر پڑتی ہے۔

قلمی شکل :- بعض ہی اوقات قلمیں نمایاں ہوتی ہیں عموماً مجموعی شکل میں ہوتا ہے جس کی سطح پر گول دائرے نظر آئے ہیں یا ریشہ دار یا رنگین پرت دار ہوتا ہے۔

ترکیدگی :- بعض ہی اوقات مکمل

شکستگی :- غیر ہموار

**معاشی اہمیت** | بطور نگینہ استعمال میں آتا ہے۔

**وقوع** | سونے، چاندی۔ تانبے اور لوہے کی کانوں میں ملتا ہے۔

**معدن** | یورال کی پہاڑیوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ رومانیہ، فرانس، جنوب مغربی افریقہ۔ آسٹریلیا اور امریکہ میں ملتا ہے روس۔ قبرس۔ خراسان۔ فارس اور شیراز میں بھی ملتا ہے مشہور و معروف فرنگی ہے یا کرمانی۔ فرنگی کو فرندی بھی کہتے ہیں کیونکہ اس پر تلوار کے سے جوہر ہوتے ہیں۔

**فوائد** :- اکثر زہروں کا تریاق ہے۔ اگر تانبے کے دھان فرنگ کو لیمو کے رس میں گھس کر اس شخص کو کھلائیں جس نے افیون کھائی ہو تو سمیت کو رفع کرتا ہے۔ لیکن سوائے دفع کرنے زہر کے اور کبھی نہ کھانا چاہیے کیونکہ وہ خود زہر قاتل ہے اور معالجہ پذیر نہیں۔ اس کو منہ میں رکھ کر تھوک کا نگلنا بھی زہر کا اثر رکھتا ہے۔ جس نے زہر کھایا ہو اس کو اگر کھلایا جائے تو زہر کا اثر دور ہو جاتا ہے اور اگر زہر نہ کھایا ہو وہ اگر کھالے تو مرجائے، خشک کے ساتھ پیس کر سونگھنے سے مرگی کا مرض دور ہوتا ہے۔ اور اس کو پیس کر آنکھ میں لگانے سے بینائی کو قوت حاصل ہوتی ہے جالا کٹ جاتا ہے خصوصاً موتی اور نیلے تھوتھے کے ساتھ باریک پیس کر ریشمی کپڑے میں چھان کر آنکھ میں لگانے سے قوت باصرہ بڑھتی ہے۔ اور جالا کٹنے کے لئے نہایت موثر ہے۔ اگر چوپائے کا پیشاب بند ہو تو پیس کر اس کی آنکھ میں لگائیں تو پیشاب آجاتا ہے۔ بچھو کاٹ لے تو اس مقام پر لگانے سے بھی نفع ہوتا ہے۔ اس کے لیپ سے برص اور بہق کے داغ جاتے رہتے ہیں۔ اگر سرکے میں گھس کر داد اور سر کے گنج پر ملیں تو فائدہ ہو۔ اگر اس کی انگوٹھی پہنیں تو گردوں میں پتھر تیار نہ ہو اور درد گردہ کم ہو جائے۔

# لاجورد

لاجورد کو انگریزی میں LAZURITE یا LAPIS-LAZULI کہتے ہیں یہ ایک قیمتی جماد ہے۔ سب سے بہتر وہ ہے جو سخت۔ صاف۔ نیلا اور چمکدار ہو اور اس پر طلائی نقطے ہوں اور اس کی نیلاہٹ میں سرخی و سبزی کی جھلک ہو اور اس کی رگوں میں خاک نہ ہو۔ جو لاجورد سونے کی کان سے نکلتا ہے

اس قدر عمدہ نہیں ہوتا۔ زمانہ قدیم میں قیمتی خیال کیا جاتا تھا۔ تاتاری اور چینی سوداگر اسے یورپ کے ملکوں میں فروخت کیا کرتے تھے۔

**لاجورد کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :- $3Na\,Al\,si\,o_4 . Na_2 s$

رنگ :- گہرا نیلا۔ سبزی مائل نیلا

کس :- سفید

چمک :- کانچ کی چمک

سختی :- (۵) چاقو سے کھروچا جا سکتا ہے۔

قلمی شکل :- بعض اوقات قلمی لیکن عام طور پر مجموعہ کی شکل میں۔

ترکیدگی :- ناکمل

شکستگی :- غیر ہموار

کثافت اضافی :- ۲٫۴

**معاشی اہمیت** | گہرے رنگ کے لاجورد کے نگینے انگوٹھیوں اور زیورات میں جڑے جاتے ہیں۔ اس کے شمعدان، بالیاں، چھری اور چاقو کے دستے بنتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اس پر اُبھرے ہوئے نقش و نگار کئے جاتے تھے۔

**وقوع** | یہ ہمیشہ کایابدل حجرات میں ملتا ہے خصوصاً جن مقامات پر چونا پتھر اور گرانٹ باہم ملے ہوتے ہیں اس کے ساتھ لوہے یا تانبے کے ٹکڑے بھی ملتے ہیں۔

**معدن** | لاجورد افغانستان سے آتا ہے۔ سائبریا بھی اس کا ماخذ ہے۔ بخارا، ترکی، ایران اور روم میں بھی ملتا ہے۔

**فوائد** :- فالج کو نفع کرتا ہے۔ مفرح ہے دل کو قوت بخشتا ہے اس کو پیس کر نا س کے طور پر سونگھنے سے نکسیر بند ہو جاتی ہے اس کو آنکھ میں لگانے سے آنکھ کے امراض دور ہوتے ہیں۔ اگر پلکوں کے بال گر رہے ہوں تو اس کو لگانے سے گرنا موقوف ہو جاتا ہے۔ اور ان کو قوت دیتا ہے اور زیادہ کرتا ہے۔ اس کو سرکے کے ساتھ لگانے سے مسّے گر جاتے ہیں۔ بہق اور برص کو نافع ہے۔ بالوں کو گھونگروالا بناتا ہے۔ لاجورد لوہے کو اس طرح کھینچتا ہے جیسے مقناطیس۔ اس میں جلانے اور زخم ڈالنے کی قوت پائی جاتی ہے اور بدبو بھی پیدا کرتا ہے۔

## ترملی یا تامڑا

ترملی کو انگریزی میں TOURMALINE کہتے ہیں یہ جواہرات میں سے ہے۔

ترملی کے طبعی خصوصیات | کیمیائی ضابطہ :- $H_9 Al_3 (B.OH)_2 Si_4 O_{19}$

رنگ :- سیاہ۔ بادامی سیاہ۔ نیلگوں سیاہ۔ نیلا۔ سبز۔ سرخ بہت کم نمونے سفید یا بیرنگ۔ بعض نمونوں کے اندرونی حصے سرخ اور بیرونی حصے سبز ہوتے ہیں اور بعض نمونوں کا ایک کنارہ سرخ اور دوسرا کنارہ سبز یا نیلا یا سیاہ ہوتا ہے۔

کس :- بیرنگ۔

چمک :- کانچ یا گوند کی چمک اور شفاف۔

سختی :- (۷) چاقو سے کھرچا نہیں جاتا۔

قلمی تشکل :- لانبی قلمیں جن کے رخوں پر لانبی اور متوازی لکیریں پائی جاتی ہیں۔

ترکیدگی :- ظاہر نہیں۔

شکستگی :- غیر ہموار

کثافت اضافی :- ۲٫۹

معاشی اہمیت | رنگین اقسام بطور نگینہ استعمال میں آتے ہیں۔

وقوع | عام طور پر گرانٹ یا دوسرے کایا بدل حجرات میں ملتا ہے اس کے ساتھ ALBITE QUARTZ یا MUSCOVITE جیسے جمادات پائے جاتے ہیں چونا پتھر میں جو ترملی ملتا ہے وہ عموماً بادامی رنگ کا ہوتا ہے۔ اور ٹین کے کچدھات کے ساتھ جو ترملی ملتا ہے اس کا رنگ نیلگوں سیاہ ہوتا ہے۔

معدن | یلندو کے اسٹیشن سے پالونچہ جاتے ہوئے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک موضع بیتم پوڑی واقع ہے۔ اس موضع کے آگے جو ندی ہے اس میں تامڑا ملتا ہے برازیل اور سائبیریا میں گہرا سرخ چیسٹر فیلڈ میں ہلکا سرخ۔ فرانس میں سرخ ناروے اور گرین لینڈ میں سیاہ۔ یوگوسلیویہ میں بادامی۔ سوئٹزرلینڈ میں سبز۔ لنکا میں بادامی اور امریکہ میں مختلف رنگ کا ملتا ہے۔

فوائد :- نظر بد سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس لئے قدیم زمانہ میں چاند بالی میں لگایا جاتا تھا۔

# ارغوانی نیلم

ارغوانی نیلم کو انگریزی میں AMETHYST کہتے ہیں یہ QUARTZ کی ایک رنگین قسم ہے قدیم زمانہ میں اس کو بہت استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ قدیم مصری قبروں میں سے اس کے زیورات اور ہیرے دستیاب ہوئی ہیں قدیم انگریزی پادری اس کی بہت عزت کیا کرتے تھے اور یہ صدر پادری کی انگوٹھی میں لگایا جاتا تھا۔

**ارغوانی نیلم کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :- $SiO_2$

رنگ :- ارغوانی یا بنفشی، یہ رنگ $MN$ کی موجودگی کی وجہ ہے۔

کس :- کانچ کی چمک

سختی :- (۷) چاقو سے کھرچا نہیں جا سکتا۔

قلمی شکل :- شش پہلو۔ عام طور پر جڑواں قلم ملتے ہیں۔

ترکیدگی :- موجود نہیں

شکستگی :- غیر ہموار

کثافت اضافی :- ۲۶۶

**معاشی اہمیت** | بطور نگینہ استعمال میں آتا ہے۔

**وقوع** | عام طور پر گرانٹ اور دوسرے آتشی حجرات کے شگافوں اور خلاؤں میں ملتا ہے۔ گہرائی میں یہ زیادہ گہرے رنگ کا ہوتا ہے اور جب ہلکے سرخ رنگ کے قلم پر گہرے سرخ رنگ کے نقطے ہوتے ہیں تو اس کو BLOOD STONE کہتے ہیں۔

**معدن** | حیدرآباد دکن میں تعلقہ یلاریڈی۔ آرمور۔ دیورکنڈہ اور بھونگیر میں ملتا ہے۔ حدود جامعہ میں بھی ریلوے اسٹیشن کے قریب ملتا ہے۔ آسٹریا۔ سلواکیا۔ چیکوسلواکیا۔ کمبرلینڈ۔ امریکہ۔ روس۔ مدراس۔ لنکا برازیل۔ اور جاپان میں ملتا ہے۔

**فوائد** :- خیال کیا جاتا ہے کہ اگر ارغوانی نیلم کی انگوٹھی پہنی جائے تو شراب سے مدہوش نہو۔ اور جنگ کے زمانہ میں زخمی نہ ہو۔

# کسوٹی

کسوٹی کو انگریزی میں TOUCHSTONE کہتے ہیں یہ ایک سلیکائی پتھر ہے جو سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ بہتر وہ ہے جس پر متواتر منہ کی بھانپ دی جائے تو اس سے زعفران کی سی بو آنے لگے۔ اور جب اس کو بدن پر ملیں تو میل صاف کر دے۔

**کسوٹی کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :- $SiO_2$

رنگ :- سیاہ یا خاکی

کس :- کوئی رنگ حاصل نہیں ہوتا بلکہ پلیٹ کو کھرچتا ہے۔

چمک :۔ مثیالا
سختی :۔ ۶ یعنی سختی سے چاقو سے کھرچا جاتا ہے۔
قلمی شکل :۔ ٹھوس۔
ترکیدگی :۔ موجود نہیں۔
مخلکستگی :۔ غیر ہموار
کثافت اضافی :۔ ۲.۶

**معاشی اہمیت** سونے کو اس پر رگڑ کر جو کس حاصل ہوتا ہے اس سے معلوم کیا جاتا ہے کہ سونا خالص ہے یا غیر خالص۔

**وقوع** آتشی حجرات شگافوں میں ملتا ہے۔

**معدن** زیادہ تر دجلے میں ملتا ہے اور شہر قابوس میں بھی پایا جاتا ہے۔

**فوائد** :۔ سانس کی تنگی اور درد گردہ کے لئے اس کا کھانا مفید ہے۔ عورت کے دودھ میں گھس کر آنکھ میں لگانے سے جالے اور آنکھ کے پھوڑے کم ہوجاتے ہیں۔

## زہر مہرہ

زہر مہرہ کو انگریزی میں BEZOAR یا PEGMATITES کہتے ہیں یہ ایک ہلکا معدنی پتھر ہے یہ خوشبودار۔ خوش مزہ۔ چکنا۔ اور خوش رنگ ہوتا ہے۔

**زہر مہرہ کے طبعی خصوصیات** کیمیائی ضابطہ :۔

رنگ :۔ چونکہ اسمیں تین جماد ہوتے ہیں اس لئے اس میں سفید۔ ہلکا سرخ اور ہلکا سبز رنگ پایا جاتا ہے یہ جماد نہیں ہے بلکہ ایک حجر ہے جس میں سفید Quartz اور فرسودہ سرخ FELSPAR اور فرسودہ EPIDOTE پایا جاتا ہے۔

**معاشی اہمیت** بطور دوا کے استعمال میں آتا ہے۔

**وقوع** عام طور پر آتشی حجرات کے شگافوں میں پایا جاتا ہے اور علاوہ بھی ملتا ہے۔

**معدن** اس کی کانیں۔ چین۔ تبت۔ قندھار۔ خراسان۔ کرمان۔ توران۔ خلیج نواح مدینہ طیبہ میں پایا جاتا ہے ہندوستان میں اجمیر۔ کوئٹہ اور دکن میں ملتا ہے۔

**فوائد** :۔ اگر اس کی انگوٹھی پہننے والے کو زہر اثر نہ کرے تو وہ اصلی ہے جب چاند برج عقرب میں

ہو اس وقت زہر مہرے کے نگینے پر بچھو کی صورت تراش کر سونے کی انگوٹھی میں جڑدیں تو اس کے پہننے والے کو بچھو نہیں کاٹتا۔ ہوائی وبا کے لئے نافع ہے مقوی باہ ہے۔ ارماح اعضائے رئیسہ اور پٹھوں کو قوت بخشتا ہے۔ صحت کا نگہبان ہے۔ ورم کو تحلیل کرتا ہے۔ مالیخولیا اور دِقّ کے لئے مفید ہے۔ غم وہم اور خفقان کو زائل کرتا ہے۔ اگر اس کو پیس کر اس مقام پر چھڑکیں جہاں زہریلے کیڑے وغیرہ نے کاٹا ہو تو زہر دور ہوتا ہے اور وہ زہر کو جذب کر لیتا ہے۔ اور بدن کی تمام رگوں سے زہر کو صاف کرتا ہے۔ خون کو سمیت سے پاک کرتا ہے۔ بچوں کو قے ہوں تو اس کو گھس کر چٹانے سے قے رک جاتی ہے۔

---

# دھاتیں

صرف اُن چھ دھاتوں کے خصوصیات لکھے جاتے ہیں جو زیادہ تر استعمال میں آتے ہیں اور جن کے متعلق بہت کچھ سنا جاتا ہے۔



## سونا

سونے کو انگریزی میں GOLD کہا جاتا ہے۔ یہ سوائے پلاٹینم کے اور سب دھاتوں سے بھاری ہے۔ اس کے ذرے آپس میں نہایت پیوست ہوتے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ وزنی سونے کا ملمع خوب ہو سکتا ہے۔ ایک چاندی کے تار پر سونا لپیٹ کر اس کو بڑھانا شروع کریں تو وہ جس قدر لانبا ہوتا جائیگا سونا بھی اس پر پھیلتا جائے گا یہاں تک کہ ۵ میل لانبے تار کے لئے ایک تولہ سونا کافی ہے۔ سونے میں ایک یہ بھی وصف ہے کہ وہ بہت سخت نہیں ہوتا لیکن سیسے کی طرح بہت نرم بھی نہیں ہوتا وہ نرمی اور سختی میں معتدل ہے۔

**سونے کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ :- سونا

رنگ :- زرد ( سونے کا رنگ )

کس :- زرد

چمک :- دھاتی

سختی :- ۲،۵ ناخن سے کھرو چا جاسکتا ہے۔
قلمی شکل :- عام طور پر قلمیں نہیں پائی جاتیں لیکن جب یہ ملتی ہیں تو وہ لانبی ہوتی ہے یا چپٹی تختیاں۔ بعض اوقات قلموں کے ڈھانچے ملتے ہیں جن کے کنارے گول یا کچھ نوکدار ہوتے ہیں ٹھوس اور چھوٹے چھوٹے دانہ دار شکل میں بھی ملتا ہے۔
ترکیدگی :- موجود نہیں۔
شکستگی :- دندانہ دار
کثافت اضافی :- ۱۹،۳

**معاشی اہمیت** | زیورات کی تیاری میں بہت زیادہ استعمال میں آتا ہے۔

**خاص خصوصیت** | اگرچہ سونے اور تانبے کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے لیکن دوسرے خصوصیات میں فرق کے علاوہ اگر سونے کو جلایا جائے تو وہ پیلا ہی رہے گا لیکن اگر تانبے کو جلایا جائے تو یہ سیاہ ہو جائے گا۔ تانبے کو بے وقوفوں کا سونا کہا جاتا ہے۔

**وقوع** :- یہ عام طور پر آتشی حجرات میں ملتا ہے۔ لیکن رسوبی اور کایا بدلی حجرات میں بھی بعض اوقات دستیاب ہوتا ہے لیکن بہت زیادہ سونا سلیکا کے ساتھ رگوں کی شکل میں ملتا ہے۔ اس کے ذرات آنکھ سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

**معدن** | ریاست حیدرآباد دکن میں سونے کی کان کنی کی جدید تاریخ ۱۸۸۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ حیدرآباد دکن کمپنی نے اپنے تحقیقات سے ضلع رائچور میں مقام ہٹی وندلی۔ مسکی۔ تپل دوڈی اور بدھنی پر اور ضلع گلبرگہ کے تعلقہ شورا پور میں مقام منگلور کے علاقہ پر مختلف جگہ سونے کی قدیم کان کنی کے تین سو سے زیادہ کانوں کا پتہ چلایا۔ ۱۸۹۵ء میں وندلی کی کانوں سے اور ۱۹۰۱ء سے ہٹی کی کانوں سے سونا نکالا جانے لگا مسکی کے جنوبی میدان میں مقام ابدل کوٹ اور تعلقہ دیودرگ میں مقام ہنگنی کے قریب بھی پرانے کانوں کو معلوم کیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سونے کی کان کنی کا کام بالکل بند کر دیا گیا۔ میسور میں بہت زیادہ سونا نکلتا ہے

**فوائد** :- روح میں لطافت اور طبیعت میں فرحت پیدا کرتا ہے۔ دل و دماغ اور حرارت غریزی کو قوی کرتا ہے۔ فکر و غم اور رنج و خفقان کو مٹاتا ہے۔ فہم کو تیز کرتا ہے۔ بدن کو فربہ کرتا ہے۔ اس کو آنکھ میں لگانے سے بینائی میں قوت آتی ہے۔ پلکوں اور آنکھ کے جالوں کے لئے مفید ہے۔ سونے کو منہ میں رکھنے سے منہ کی بدبو دور ہوتی ہے۔ جس پانی میں سونے کو بجھایا جائے وہ پانی حرارت غریزی اور دل و دماغ کو قوت دیتا ہے۔ دستوں کو روکتا ہے۔ اس کی انگوٹھی ام الصبیان اور درد مفاصل کو نافع ہے اس کو زیادہ

دیکھنے سے غم دفع ہوتا ہے دل میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ ہنسی زیادہ آتی ہے۔ جس بچے کو سونے کے برتن میں دودھ اور کھانا وغیرہ کھلایا جائے تو وہ جلد باتیں کرتا ہے۔ فربہ۔ قوی اور بہادر ہوتا ہے۔ اُم الصبیان سے محفوظ رہتا ہے سونا باہ کو بھی قوت دیتا ہے۔ اور زہر کے لئے نافع ہے۔ پرانا دل کا درد اس سے دور ہوتا ہے اس کی سلائی بنا کر آنکھ میں پھیرتے سے بینائی میں قوت اور آنکھوں میں چمک ہوتی ہے سونے کا ورق کھانے سے تفریح اور دل وجگر۔ دماغ۔ معدہ وباہ میں طاقت پیدا ہوتی ہے حرارت غریزی قوی ہوتی ہے۔ بواسیر دفع ہوتی ہے۔ سورج کے دیکھنے سے جس کی نظر خراب ہو جاتی ہے سونے کو گھی میں گھس کر لگائیں تو فائدہ ہوگا۔

# چاندی

چاندی کو انگریزی میں Silver کہا جاتا ہے۔ یہ تیسرے درجے کی دھات ہے کیونکہ اول پلاٹینم۔ دوم سونا اور سوم چاندی ہے۔ چاندی سفید اور چمکدار تو ہے لیکن سونے کی صفات پائداری اور چمک دمک کو نہیں پہنچتی۔ کوٹنے سے بڑھ سکتی ہے۔ اس کا وزن سونے سے بہت ہلکا ہے۔

**چاندی کے طبعی خصوصیات**

کیمیائی ضابطہ :- چاندی
رنگ : سفید۔ بعض اوقات خاکی یا سیاہ
کس : سفید چاندی کی طرح
چمک : دھاتی
سختی : ۲،۵ پیسے سے کھرچا جا سکتا ہے
قلمی شکل : بعض ہی اوقات مکعبی قلمیں۔ لیکن عام طور پر بے ترتیب قلمیں یا ٹھوس یا تختیاں یا چپٹے باریک ٹکڑے۔
ترکیدگی : موجود نہیں
شکستگی : دندانہ دار
کثافت اضافی : ۱۰،۵

**معاشی اہمیت** چاندی کی کچھ دھات۔ اس کے زیورات اور نمائشی سامان تیار ہوتا ہے۔

چاندی کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ صرف زیورات میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیمتی دھاتیں اتنی زیورات کے لئے استعمال نہیں ہوتی جتنی صنعتوں میں استعمال ہوتی ہیں چنانچہ ۱۹۳۹ء سے برطانیہ میں صنعتی ضرورتوں کے

کے لئے اس دھات کو وسیع پیمانہ پر استعمال کیا جا رہا ہے اور اس نے صنعتوں میں استعمال میں ہونے والی مشنری تیار کرنے کے لئے انجینیرنگ کے ایک خاص شعبہ کو ترقی دی گئی ہے۔ جنگ کے زمانے میں چاندی کو بے شمار چیزوں میں استعمال کیا گیا مثال کے طور پر پنی سلین تیار کرنے میں، سمندر کے پانی کو پینے کے قابل بنانے میں اور پلاسٹکس وغیرہ میں یہ دھات استعمال کی گئی۔ شیشہ۔ دوائیوں اور آتش گیر مادوں میں بھی اسے استعمال کیا گیا۔ ریڈیو اور ہوائی جہازوں کا پتہ لگانے والے آلات تیار کرنے والی صنعتوں نے بھی اس دھات کو بھاری مقدار میں استعمال کیا ہے۔ برطانیہ میں پنی سلین کے وسیع پیمانہ پر تیار کئے جانے کی بھی یہی وجہ ہے کہ پنی سلین بنانے کے لئے جن آلات سے کام لیا جاتا ہے وہ چاندی اور پلاٹینم کے بنے ہوئے ہیں۔

چاندی کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ پانی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے چنانچہ سمندر کے پانی کو پینے کے قابل بنانے کے لئے برطانیہ میں جو آلہ ایجاد کیا گیا ہے اس کے برتن اور نل چاندی کے بنے ہوئے ہیں۔ سمندر کے پانی کو کشید کے طریقے سے پینے کے قابل بنانے میں یہ نقص ہے کہ اس کے لئے ایندھن کی بھاری مقدار کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں ایسا پانی تیار کرنا ہو وہاں ایندھن بالعموم دستیاب نہیں ہوتا۔ خیال ہے کہ یہ آلہ جہازوں کے بائلروں میں بھی استعمال ہو سکے گا۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ چاندی کو جراثیم کش مادے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تازہ پانی میں اگر چاندی کو حل کر دیا جائے تو اس سے کیڑے مکوڑے پیدا نہیں ہوتے جن پلاسٹک مادوں میں چاندی ملی ہوتی ہے ان میں چاندی کی حیثیت عاملانہ (ایسا مادہ جو خود تو اثر کرے لیکن اس پر خود کوئی اثر نہ ہو) ہوتی ہے۔ فارمل ڈی ہائیڈ ملے ہوئے پلاسٹک مادوں پر چاندی کیمیائی عمل کرتی ہے لیکن خود اس پر کوئی کیمیائی عمل نہیں ہوتا۔ کئی مرکب دھاتیں بہت کم درجہ حرارت پر پگھل جاتی ہیں چاندی ان کا ایک اہم جزو ہے۔ راڈر کے نازک آلہ کی تیاری میں چاندی کے جھال نے بڑا کام کیا ہے۔ چاندی اعلیٰ حرارتی اور برقی خاصیتیں بھی رکھتی ہے اور ٹانکا وغیرہ لگانے کے لئے یہ بہترین دھات ہے۔ چاندی کی مرکب دھات کی رگڑ کی شرح بہت کم ہوتی ہے۔ برطانوی طیاروں کے انجنوں میں جو بیرنگ استعمال ہوتے ہیں ان میں یہ مرکب دھات وسیع پیمانہ پر کام میں لائی جاتی ہے۔ اپنی خاصیتوں کی وجہ سے چاندی کو کیسو ٹیٹر فیس۔ سوچ بلیڈ سگریٹ ریکر اور رو پلے بنانے میں استعمال

چونکہ چاندی کو سکے یا کھانے کے برتن اور زیورات بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس لئے کئی سالوں تک اسے کسی اور کام میں لایا نہیں جا سکتا۔ چاندی کے صنعتی امکانات کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا۔ چاندی چڑھی ہوئی دھاتوں کے سروں کو جوڑنے کے طریقے حال ہی میں معلوم ہوئے ہیں۔ اس ٹکنیک کی وجہ سے کیمیاوی مشنری بنانے میں بہت مدد ملی ہے کیونکہ بہت زیادہ درجہ حرارت پر بھی چاندی آکسیجن کی مدافعت کرتی ہے۔ اس میں جراثیم اور پھپھوند کے کیڑے مارنے والی خاصیتیں موجود ہیں اور یہ بڑی آسانی سے کام میں لائی جا سکتی ہے۔

چاندی کی بصری خاصیتیں بہت عرصہ سے معلوم ہیں اور نقروی شیشے تو کوئی نئی بات نہیں۔ شیشہ پر چاندی کی بالکل ہلکی سی تہہ چڑھانے کے کام میں کافی ترقی ہو چکی ہے۔ اس طرح انعکاس اچھا ہوتا ہے اور پھر پشت پر مناسب روغن مل کر اس چمکدار سطح کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ جنگ میں کام آنے والے بہت سے جدید ترین آلات میں جو پیچیدہ "دیدبان" لگے ہوئے ہیں ان کی تیاری میں جو نہایت اعلیٰ اور نفیس آئینے کام آتے۔ زمانہ امن میں ان کی قدر و قیمت بہت بڑھ جائے گی۔

چاندی کے مرکبات جدید فوٹو گرافی کا ایک راز ہیں اور فوٹو گرافی کی صنعت اس وقت تک چاندی کی سب سے بڑی گاہک رہی ہے۔ پلیٹوں، پیپروں اور فلموں کی تیاری کے سلسلے میں ہر سال سینکڑوں ٹن چاندی درکار ہوتی ہے حالانکہ اس کی کافی مقدار ہے دوبارہ کام میں لائی جاتی ہے۔ فوٹو گرافی کی بنیاد اس بات پر ہے کہ چاندی کے مختلف مرکبات روشنی سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہمیں جو کچھ فوٹو میں نظر آتا ہے وہ دراصل سیلولائیڈ کے ایک تہہ پر چاندی کے لاکھوں ذرات کا عکس ہوتا ہے اب چونکہ چاندی کے سکے بنانا ایک بڑی حد تک ترک کر دیا گیا ہے۔ صرف ایشیا میں چاندی کو سکہ سازی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا امید ہے کہ چاندی کے مرکبات کے استعمال میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔

ممکن ایک بات یہ ہے کہ اکثر لوگ محسوس نہیں کرتے لیکن وہ تھوڑی بہت چاندی اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو بوڑھے ہونے سے پہلے ہی دانتوں میں بھرائی کرانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو چیز دانتوں میں بھری جاتی ہے وہ چاندی کا مرکب ہوتی ہے۔ چاندی اپنی بے مثل صفات کی بناء پر کھانے پینے کے برتن وغیرہ کی تیاری کے سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور عنقریب دیکھا جائے گا کہ برطانیہ کی جدید چاندی میں جو اصلاحیں ہوں گی وہ اسے پرانی چاندی سے بہت برتر بنا دے گی۔ طوالت اور سیرت کے ایسے طریقے بھی معلوم کئے گئے ہیں جن میں چاندی کے خواص باقی رہیں اور مزید سختی بھی پیدا ہو جائے اور اس طرح چاندی کے نئے نئے قسم کے سامان بننے کا امکان پایا جاتا ہے۔

**وقوع** کا یا بدلی حجرات کے رگوں میں ملتی ہے اور بعض اوقات رسوبی اور برکانی حجرات میں بھی ملتی ہے۔
**معدن** ملگنڈہ میں تھوڑی مقدار میں چاندی ملتی ہے جس کے ساتھ دوسرے دھات پائے جاتے ہیں۔ چاندی ناروے۔ چیکوسلواکیا۔ نیو جنوبی ویلس اور امریکہ میں ملتی ہے۔

**فوائد** :۔ تفریح میں یاقوت کے قریب ہے۔ دل۔ معدہ اور جگر کو قوی کرتی ہے۔ قوت حیوانی کی نگہبان ہے۔ جنون اور وسواس کو نافع ہے۔ استسقار۔ ورم طحال۔ سنگ گردہ و مثانہ اور پیشاب کے رک جانے کو بھی نافع ہے۔ اس کی سلائی سے سرمہ لگانا بصارت کو قوی کرتا ہے اور جالے کاٹتا ہے۔ چاندی کے برتنوں میں کھانا اور پانی پینا تفریح کا باعث ہے۔ چاندی کے برتن میں شراب پینے سے بہت جلد نشہ ہوتی ہے اور سونے کے برتن میں شراب پینے سے دیر سے نشہ ہوتی ہے۔ خالص چاندی کو منہ میں رکھنے سے پیاس کم ہوجاتی ہے لیکن یہ قابض ہے۔ چاندی حد سے زیادہ موٹاپن کی اصلاح کرتی ہے بار اور صفرا کے فساد کو مناتی ہے۔ اعصاب کی طاقت بڑھانے کے لئے دواؤں میں چاندی کے ورق ملائے جاتے ہیں۔ بدن کی معمولی کمزوری دور کرنے کے لئے چاندی کے ورقوں کو مکھن اور مصری کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا کشتہ بھی تیار کیا جاتا ہے۔



# لوہا

لوہے کو انگریزی میں Iron کہتے ہیں۔ دور جدید کی روزافزوں صنعتی ترقی میں لوہا غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اور صنعتی اغراض کے لئے اس کی قدر سونے سے کم نہیں۔

**لوہے کے طبعی خصوصیات** کیمیائی ضابطہ :۔ لوہا۔

رنگ : فولاد کی طرح خاکی یا بھورے کی طرح سیاہ
کس : سیاہ
چمک : دھاتی
سختی : ۴۔ چاقو سے کھرچا جا سکتا ہے
قلمی شکل : مکعبی یا ٹھوس اور مقناطیسی خاصیت رکھتا ہے
ترکیدگی : موجود ہے
شکستگی : غیر ہموار
کثافت اضافی : ۳ء ۷

**معاشی اہمیت** | ہتیار اور مشنری وغیرہ تیار کی جاتی ہے۔

**وقوع** | ڈلیروں کی شکل میں ملتا ہے اور دوسرے حجرات میں بھی ملتا ہے۔ شہاب ثاقب میں بھی لوہا پایا جاتا ہے

**معدن** | ممالک محروسہ کے مختلف حصوں میں خام لوہا صاف کرنے کے جو آلات برآمد ہوئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آخر حجری دور میں دکن کے باشندے لوہا صاف کرنے کے فن سے واقف تھے۔ نرمل ضلع عادل آباد اور دوسرے مقامات کے خام لوہے سے تیار کردہ فولاد قدیم زمانے میں بھی دوسرے ممالک کو بھیجی جاتی تھی۔ چنانچہ درسہ کا تو یہ بیان ہے کہ دمشق کی مشہور و معروف تلواروں کے لئے جو فولاد استعمال کی جاتی تھی وہ ایرانی تاجر دکن کے ایک مقام کوناسمدرم سے لیجاتے تھے اور یہ فولاد تمام دنیا میں مشہور تھی۔ کوناسمدرم کی مشہور و معروف فولاد کے لئے ضلع نظام آباد کے ایک مقام تارے پلی کا لوہا استعمال کیا جاتا تھا۔ ضلع عادل آباد کے تعلقہ جات نرمل۔ یلغزپ۔ اوٹنور۔ لکشی پیٹھ۔ چنور اور سرپور۔ ضلع نظام آباد کے تعلقہ جات آرمور۔ کاماریڈی اور یلاریڈی اور گندھاری جاگیر۔ ضلع رائچور کے تعلقہ کشٹگی اور ضلع کریم نگر کے تعلقہ جات پرکال۔ جگتیال اور سرسلہ میں خام لوہے کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ گرین لینڈ۔ جرمنی۔ نیوزیلنڈ وغیرہ میں بھی لوہا ملتا ہے۔ ریاست حیدرآباد میں ہنر کا فولادی کام آپ اپنی نظیر رکھتا ہے اس سے لوہے کی تلواریں تیار کی جاتی تھیں اور بندوق اور توپیں ڈھالی جاتی تھیں۔ خود حیدرآباد شہر میں توپ کا سانچہ اس کی یادگار ہے۔ اس کی کانیں نانڈیڑ۔ گلبرگہ۔ رائچور۔ عثمان آباد بیدر اور ورنگل میں بھی پائی جاتی ہیں۔

۸۵

**فوائد**:۔ مقوی معدہ ہے اور ریاحی بواسیر کو نافع ہے۔ اس کا خضاب بالوں کو خوب سیاہ کرتا ہے۔ گرم کئے ہوئے لوہے کا پانی بجھا ہوا نہایت مقوی باہ ہے اور قابض ہے یہ پانی آنتوں کے زخم اور پرانے دستوں اور بواسیر اور ہیضہ۔ تاپ تلی۔ قوت معدہ۔ سلس البول۔ درد معدہ اور دیوانے کتے کے کاٹنے کے لئے نافع ہے۔ اس کا عرق اعضا کو مضبوط کرتا ہے۔ صفرا کی حدت اور خون کے جوش کو دفع کرتا ہے۔ لوہے کا برادہ زہریلے ہوئے کھانے یا شراب میں ڈال دیں تو تمام زہر جذب کرلے یہاں تک کہ اس کے کھانے والے کو کچھ ضرر نہو۔ اور اس برادہ کو جب کسی شخص کے جسم پر باندھ دیں تو خواب میں بولنے اور دانت پیسنے کی عادت جاتی رہتی ہے۔ لوہے کو سرکے میں جوش کرکر اس سرکے کو کان میں ڈالیں تو میل صاف ہو جاتا ہے۔ لوہا قاتل بھی ہے۔ بعض تالابوں اور باولیوں کے پانی میں لوہا موجود ہوتا ہے اس لئے یہ پانی پینے یا غسل کرنے سے طاقت آتی ہے۔ لوہے کے تمام مرکبات مقوی خون اور اس کو سرخ کرتے ہیں۔ ان کا کھلانا صرف اس حالت میں مفید ہوتا ہے جب مریض کے خون سے سرخی کم ہو جائے اور اس کا رنگ زرد ہو جائے۔ فولاد کے مرکبات کے استعمال کے وقت ترشی سے بالکل پرہیز کرنا چاہیئے۔ لوہے کے استعمال سے پاخانہ سیاہ اور بدبودار ہو جاتا ہے۔ وید کہتے ہیں کہ صاف کئے ہوئے لوہے کے

کھاتے سے پیٹ کے کیڑے مرکر نکل جاتے ہیں۔ یرقان دفع ہوتا ہے۔ صفرا اور خون کا فساد دور ہوتا ہے۔ قربھی کی اصلاح ہوتی ہے۔ اگر پیٹ بڑا ہوگیا ہو تو کم ہوجاتا ہے۔ بلغم اور ورم کم ہوجاتا ہے۔ قولنج جاتا رہتا ہے۔ بڑھی ہوئی تلی گھٹ جاتی ہے۔ کوزہ جاتا رہتا ہے۔ بالوں کی سفیدی او۔ بدن کی کھال میں جھریاں پڑنا بند ہوجاتا ہے۔ سل کو دور کرتا ہے۔ لوہے کی انگوٹھی بناکر پہننے سے پتھری دفع ہوتی ہے۔ لوہے کا کشتہ بھی تیار ہوتا ہے۔

# تانبا

تانبے کو انگریزی میں Copper کہا جاتا ہے۔ یہ ایک معدنی دھات ہے۔

**تانبا کے طبعی خصوصیات** | کیمیائی ضابطہ : کاپر

| | |
|---|---|
| رنگ | : تانبا سرخ |
| کس | : سیاہ اور چمکدار |
| چمک | : دھاتی |
| سختی | : ۵٫۷ پیسے سے کھرو چا جا سکتا ہے۔ |
| قلمی شکل | : مکعبی یا تختی یا ٹھوس |
| ترکیدگی | : موجود نہیں |
| شکستگی | : دندانہ دار |
| کثافت اضافی | : ۸٫۸ |

**معاشی اہمیت** | تانبے کی کچھ دھات اور اس کے برتن بھی تیار کئے جاتے ہیں۔

**وقوع** | دوسرے دھاتوں کے کانوں میں پرت یا رگ کی شکل میں تانبا ملتا ہے۔ ریت پتھر۔ چونا پتھر سلیٹ اور دوسرے آتشی حجرات کے جوفوں میں بھی ملتا ہے۔

**معدن** | ممالک محروسہ میں ضلع رائچور کے مختلف مقامات میں اور ضلع گلبرگہ میں تعلقہ شوراپور اور ضلع محبوب نگر میں گدوال سمستان اور تعلقہ مکتھل میں تانبا ملتا ہے۔ عادل آباد اور ضلع نظام آباد میں بھی ملتا ہے۔ روس۔ جنوبی آسٹریلیا اور امریکہ میں تانبا ملتا ہے۔ جزیرہ جاپان اور بعض ممالک یورپ اور ایران وغیرہ میں بھی ملتا ہے لیکن جاپانی تانبا سب سے بہتر ہے۔ جس کی چادریں تیار ہوتی ہیں۔ فرانس کا تانبا سخت ہوتا ہے۔ روم میں جزیرہ قبرس میں عمدہ تانبا نکلتا ہے اس کو نحاس قبرسی کہتے ہیں اس کا رنگ سرخی مائل زرد ہوتا ہے۔ آذربائیجان میں اجنان کے مقام پر بہت تانبا نکلتا ہے۔

**فوائد**:۔ فالج اور لقوہ اور اکثر سردی کی بیماریوں کو مفید ہے۔ سرکہ کے ساتھ اس کا لیپ ورم کو تحلیل کرتا ہے۔ تانبے کو کئی روز سرکے میں تر کریں اور مہندی کو اس سرکے میں ڈال کر لگائیں تو نزلہ کو صحت ہو۔ کھانسی کو دور کرتا ہے اور دمے کو بھی نافع ہے بالوں کو گرنے نہیں دیتا۔ فساد بلغم وصفرے کو دور کرتا ہے۔ یرقان اور کوڑھ کو نافع ہے۔ اس سے قے ہوتی ہے۔ زخم بھر جاتا ہے۔ اس کا سرمہ بینائی کو تیز کرتا ہے۔ پلکوں کی سختی کے لئے مفید ہے تانبے کے بے قلعی دار برتن میں گوشت یا اشیائے ترش یا شیریں یا چکنی غذا کھانا بہت ہی مضر ہے۔ تانبا بواسیر دمے اور کھانسی کو مفید ہے۔

**تانبے سے نقصانات**| قے لاتا ہے۔ سر میں چکر پیدا کرتا ہے۔ گھبراہٹ ہوتی ہے۔ گرمی ہوتی ہے۔ پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ کھجلی ہوجاتی ہے۔ اجابتیں آتی ہیں۔

# جست

جست کو انگریزی میں Zinc کہتے ہیں یہ ایک مشہور دھات ہے جو گندھک وغیرہ کے ساتھ ملتی ہے۔ کبھی خالص نہیں ملتا بلکہ کچ دھات سے حاصل کیا جاتا ہے

**جست کے طبعی خصوصیات**| کیمیائی ضابطہ: جست اور دوسرے دھات

رنگ : سفید

کس : سفید

چمک : دھاتی

سختی : ۲ چاقو سے آسانی سے کھرچا جا سکتا ہے۔

قلمی شکل : مکعبی

ترکیدگی : موجود ہے

شکستگی : دندانہ دار

کثافت اضافی : ۷

**معاشی اہمیت**| چونکہ یہ تانبے کے مقابلہ میں دیر سے گرم ہوتا ہے اس لئے اس کے پانی کے مراحیاں، گلاس حقے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔

**وقوع**| دوسرے دھاتوں کے ساتھ ملتا ہے جو کانوں سے نکالے جاتے ہیں۔

**معدن**| ہندوستان میں مدراس، بنگال، راجپوتانہ اور پنجاب میں ملتا ہے۔

**فوائد**: جست کے برتنوں میں مرق وغیرہ بہ نسبت اور دھاتوں کے برتنوں کے کم خراب ہوتا ہے اس کا خالص برتن بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برتن میں کھانا اور پینا دل اور معدے کو قوت دیتا ہے خفقان کو دور کرتا ہے۔ کاسنی یا سونف کے سبز پتوں کے پانی میں جست پر گھس کر ورم پر لگائیں تو تحلیل ہوجاتا ہے اس کو جلا کر سفیدہ تیار کر کے آنکھ میں لگانے سے آشوب چشم کو صحت ہوتی ہے۔ آنکھوں سے رطوبت موقوف ہو جاتی ہے پلکوں کی سرخی کو دفع کرتا ہے اس کا کشتہ تیار کیا جاتا ہے۔

## سیسہ

سیسہ کو انگریزی میں Lead کہتے ہیں۔ یہ دھات گندک کے ساتھ ملتی ہے اس کو کسی برتن میں رکھ کر جلانے سے گندک جل جاتی ہے اور سیسہ رہ جاتا ہے اسمیں جوہر آبی زیادہ ہے جس کی وجہ پگھل جاتا ہے۔

**سیسہ کے طبعی خصوصیات** | **کیمیائی ضابطہ**: سیسہ بعض اوقات اس کے ساتھ چاندی بھی مل جاتی ہے

رنگ : سیسہ خاکی

کس : خاکی

چمک : دھاتی

سختی : ۱٫۵ - ناخن سے کھروچا جا سکتا ہے۔

قلمی شکل : مکعبی قلمیں مگر بہت کم۔ عام طور پر تپلی تختیاں یا ٹھوس

ترکیدگی : موجود ہے۔

شکستگی : غیر ہموار۔

کثافت اضافی : ۱۱٫۴

**معاشی اہمیت** | بہت ہلکی ضرب سے چپٹا ہو سکتا ہے مگر لوہے کی طرح اس کا تار نہیں بن سکتا۔ قلعی گر اس کو قلعی میں استعمال کرتے ہیں ایسے برتن میں کھانا صحت کے لئے مضر ہے جو بے قلعی ہو۔

**وقوع** | اس کے علحدہ کان ہوتے ہیں۔ جس کے ساتھ دوسرے دھات اور حجرات بھی ملتے ہیں۔

**معدن** | بہتر سیسہ سویڈن میں ملتا ہے۔ امریکہ میں بھی ملتا ہے۔

**فوائد**: اس کے سفیدے کو آنکھ میں لگانے سے جلا پیدا ہوتی ہے۔ جالے اور آشوب چشم کو اس سے نفع ہوتا ہے۔ اگر سیسے کے برتن میں ہمیشہ پانی پیتے رہیں تو دن بدن دُبلا ہو جاتا ہے سیسہ قابض ہے۔ اس کے کل مرکبات کم و بیش زہر ہیں۔ مگر سفیدا بڑا زہر ہے۔ کشتہ ملایا غدود پہ اس

کا ٹکڑا باندھا جائے تو وہ تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس کی ڈلی نگلنا قدیم درد معدہ کو مفید ہے ٭


**لفٹننٹ سید محمد احمد الدین**
بی اے (عثمانیہ) بی ایس سی (مانچسٹر)
صدر شعبہ ارضیات


# رباعیات


از مرزا صفدر علی۔ ایم۔ اے (ابتدائی)




خود حسن سے اپنے تجھے نفرت ہو جائے
ہر سانس تری نالۂ حسرت ہو جائے
اللہ کرے دل کو دکھانے والے
تجھ جیسے ہی سے تجھ کو محبت ہو جائے

اس غم کدہ میں کیا ہے بجز حسرت و غم؟
پامال الم کب سے ہے روح آدم
سمجھا ہے جسے زیست وہ ہے اے نادان!
پیمانۂ دوراں میں چھلکتا ہوا سم

ہر درد کا درماں ہے شراب اے ساقی
ہر سانس ہے اک ہم پہ عذاب اے ساقی
کل خاک میں مل جائیں گے یہ خانہ خراب
دے جام، اٹھا چنگ و رباب اے ساقی

افلاک پہ رقصاں ہے سحاب اے ساقی
پہلو میں مچلتا ہے شباب اے ساقی
اس وقت لب آب جو پینا ہے ثواب
دے جلد کہ ہستی ہے سراب اے ساقی

# پارچہ بافی کے جدید ریشے

انسان ابتداء میں قدرت میں پائے جانے والے ریشہ دار اشیاء سے لباس تیار کرتا تھا۔ اس قسم کے قدرتی ریشے جن سے لباس تیار کیا جاتا تھا۔ روئی، ریشم، اون اور کتان تھے۔ صدیوں تک انہی سے بنے ہوئے کپڑوں کا استعمال رہا۔ لیکن اب جدید اکتشافات کی بدولت جنہیں کیمیا دان اور انجینیرز ہر دو کا بڑا حصہ ہے مصنوعی طور پر پارچہ بافی کے ریشے تیار کئے جا رہے ہیں ان ریشوں کو پارچہ بافی کے ریشے Textile fibres یا تالیفی ریشے Synthetic fibres کے نام سے موسوم کرتے ہیں یہ قدرتی ریشوں کی بہ نسبت بہتر اور مضبوط ہوتے ہیں۔ تالیفی ریشوں کی صنعت کا ارتقاء دراصل پلاسٹک صنعت کی بدولت ہوا ہے ۵۰ سال قبل مصنوعی ریشم کی تیاری تجربہ خانوں میں اپنے ابتدائی مراحل میں تھی لیکن آج مصنوعی ریشم Rayon اور دوسرے ریشے پارچہ بافی کے لئے قدرتی ریشوں سے زیادہ استعمال ہو رہے ہیں۔ ان ممالک میں جہاں جنگ کی وجہ سے روئی اور دیگر ریشہ دار اشیا دستیاب نہ ہو سکتی تھیں مصنوعی ریشم کی صنعت کو بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ اس جنگ عظیم ثانی سے قبل جرمنی میں مصنوعی ریشم ممالک متحدہ امریکہ سے دوگنا تیار کیا جاتا تھا۔ جاپان اور اٹلی میں اگرچہ مصنوعی ریشم کی تیاری جرمنی سے کم تھی۔ لیکن پھر بھی متحدہ امریکہ سے وہاں کی پیداوار زیادہ تھی۔ ۱۹۴۰ء کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی اور جاپان میں تالیفی ریشہ سازی ممالک متحدہ امریکہ سے علی الترتیب ۵، ۸ اور ۶ گنا تھی۔

مصنوعی ریشوں کی تیاری کا خیال سب سے پہلے ۱۶۶۴ء میں رابرٹ ہک (Robert Hooke) کو پیدا ہوا اس نے متعدد تجربات کے بعد بتلایا کہ " ایسا مصنوعی ریشم تیار کیا جا سکتا ہے جو قدرتی ریشم سے بہتر نہیں تو کم از کم اس کے مشابہ تو ہو سکتا ہے " ریومر ( Reumur نامی فرانسی سائنس داں نے ۱۷۳۴ء میں بتلایا کہ مائع گوند کے خشک ہونے سے ریشم نما ریشے حاصل ہوتے ہیں اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم رال، گوند اور دیگر صمغی اشیاء سے ریشم تیار کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ۱۸۵۵ء میں آدمارس Audemars نامی سوئٹزرلینڈ کے سائنس دان نے نائٹروسیلولوز کے محلول سے مصنوعی ریشم تیار کیا Blanzeiter نے ریشم کے کیڑے کی ساخت اور اس کے عادات و خصائل کا خوردبین کے ذریعہ مطالعہ کیا۔ اور شہتوت کے پتے کی تشریح کی۔ اس نے بتلایا کہ ریشم کا کیڑا شہتوت کے پتے کے سیلولوز کو اپنے جسم کے متعاملات کے ذریعہ حل کر لیتا ہے۔ اور پھر ریشے تیار کرتا ہے۔ وہ شہتوت کے پتے سے ریشم کے کیڑے کی طرح مصنوعی ریشم تیار کرنے کے خاص متعاملات کی تلاش

کی تلاش میں تھا۔ بعد ازاں اس نے مصنوعی ریشم کی تیاری میں کامیابی حاصل کی۔ اس کا تیار کردہ ریشہ اگرچہ ریشم نہ تھا کیونکہ اس کی کیمیائی ترکیب ریشم کی سی نہ تھی۔ مگر وہ ریشم سے بہت مشابہ تھا۔ یہ تمام ابتدائی تجربی مراحل تھے۔ مصنوعی ریشم ( Rayon ) کی تجارتی تیاری دراصل کاونٹ شارڈونے Count Chardeunet کی تیس سالہ محنت کا نتیجہ ہے فوٹوگرافی کے دوران میں کولوڈین کے شیشے کے انڈیلے جانے پر تار نما ریشے حاصل ہوئے۔ اس پر اس نے یہ محسوس کیا کہ اس سے مصنوعی طور پر ریشے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ اس نے غور کیا کہ ریشم کا کیڑا شہتوت اور بلوط کی پتیاں کھاتا ہے جس میں سیلولوز موجود ہوتا ہے اور اس سے یہ اپنے جسم کے دو چھوٹے سوراخوں کے ذریعہ جنہیں تار کش سوراخ کہتے ہیں گوند جیسے مادے کو خارج کرتا ہے جو ہوا میں جم کر باریک تار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مصنوعی طور پر روئی کو خاص متعاملات کے ذریعہ حل کر کے لیج مادے میں تبدیل کر لیا جائے تو اس سے بھی ریشم نما ریشے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے روئی کو نائٹرو سیلولوز میں تبدیل کیا اور اسے الکوہل میں حل کیا۔ اور باریک سوراخوں والی پچکاری کے ذریعہ سے گرم ہوا میں خارج کیا جس سے محلول لیج ہونے کے باعث جم کر تاروں کی شکل میں حاصل ہوا۔ لیکن اس طرح تیار کردہ دھاگے میں ایک نقص یہ تھا کہ وہ دھماکو روئی کی طرح جلد آگ پکڑ لیتا تھا، سال کے عرصے میں اس نے اس مشکل پہ قابو پا لیا۔ اس کی اس دریافت نے مصنوعی ریشم کی صنعت کی بنا ڈالی۔ اور آسے ہم بجا طور پر "مصنوعی ریشم کی صنعت کا باپ" کہہ سکتے ہیں۔

سیلولوز دار اشیا مثلاً روئی لکڑی کے گودے سے تیار کردہ تمام تالیفی ریشے مصنوعی ریشم ( Rayon ) کہلاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے دوسرے خام اشیا مثلاً کوئلہ۔ دودھ۔ سویابین۔ اناج اور دوسرے مختلف اشیاء سے بھی تالیفی ریشے تیار کئے جا رہے ہیں، مگر اب بھی Rayon مصنوعی ریشم ایک اہم تالیفی ریشہ ہے۔

مصنوعی ریشم ( Rayon ) کی صنعتی تیاری کے لئے عموماً تین قاعدے استعمال کئے جاتے ہیں۔

(۱) Viscose (۲) سیلولوز اسیٹیٹ قاعدہ (۳) کیوپرامونیم قاعدہ

شارڈونے ( Chardeunet ) کا قاعدہ اب متروک ہے۔ وسکوز اور کیوپرامونیم قاعدوں میں سیلولوز سے آغاز کر کے ایسے کیمیائی متعاملات کے ذریعہ حل کر لیتے ہیں۔ اور بالآخر دوبارہ سیلولوز کو ریشہ دار شکل میں پیدا کرتے ہیں کیمیائی لحاظ سے یہ وہی سیلولوز ہے۔ لیکن طبعی وضع اور خواص میں قابل لحاظ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اگر کیمیا دان کسی شخص سے یہ کہے کہ مصنوعی ریشم کا کپڑا اور سوتی کپڑا دونوں روئی سے بنائے جاتے ہیں تو وہ یقین نہ کرے گا دوسرے قاعدے یعنی سیلولوز اسیٹیٹ قاعدے میں ریشہ بجائے سیلولوز کے سیلولوز اسیٹیٹ کی شکل میں ہوتا ہے۔

مصنوعی ریشم سازی کے یہ قاعدے اگرچہ اپنی تفصیلات میں کافی اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی تیاری کے اصول یکساں ہی ان کی تیاری کے تین مراحل ہیں۔

(۱) سیلولوز کی موزوں لزوجت کے محلول میں تبدیلی
(۲) اس محلول کو باریک سوراخوں میں سے دباؤ کے تحت گزار کر پھوار پیدا کرتے ہیں۔
(۳) اس پھوار کو ٹھوس سیلولوزی ریشوں میں تبدیل کرلیا جاتا ہے
ان قاعدوں میں سب سے زیادہ مراج قاعدہ ( ) وسکوز قاعدہ ہے مصنوعی ریشم کی بیشتر تعداد اس قاعدے سے تیار کی جاتی ہے۔ اسے دو انگریز سائنس دانوں ( C. F. Cross ) سی۔ ایف۔ کراس اور ( E. J. Vevan ) ای۔ جے ویوان نے (۱۸۹۲ء) میں وضع کیا۔ انھوں نے لکڑی کے گودے پر کاوی سوڈا اور کاربن ڈائی سلفائڈ کے عمل سے ایک حل پذیر پلاسٹک مرکب تیار کیا۔ اس مادے کو لزوجت کی بنا پر Viscose اور اسی بنا پر اس قاعدے کو Viscose قاعدے کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس لزج مائع کو ایک خاص مدت تک ساکن رکھا جاتا ہے تاکہ اسمیں مطلوبہ لزوجت پیدا ہو جائے۔ اس وقفہ کے بعد جسے اصطلاحاً ( Ripening period ) کہتے ہیں اسے باریک سوراخدار پچکاریوں کے ذریعہ پھوار کی شکل میں دوسرے سرد مائع میں خارج کرتے ہیں جہاں یہ اپنی لزوجت کے باعث لبستہ ہوکر دھاگہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پچکاری کے سوراخوں کی تعداد ریشوں کی تعداد کو اور قطر ریشوں کی باریکی کو متعین کرتے ہیں۔

سیلولوز اسیٹیٹ قاعدے کو ۱۸۶۹ء میں نانڈو Nandu اور شٹزن برگر Schutzenberger نامی دو جرمن سائنس دان دریافت کئے۔ مگر انھوں نے اس قاعدے سے صرف پلاسٹک تیار کیا۔ بیوان اور کراس نے پہلی مرتبہ اس قاعدے سے مصنوعی ریشم تیار کیا۔ ۱۸۹۹ء میں ایمل برونے Emil Brounet نے اس قاعدے سے مصنوعی ریشم سازی کا کارخانہ قائم کیا۔ اس قاعدے میں بھی روئی سے ابتدا کرتے ہیں۔ اسے ایسٹک ترشہ میں ڈبو کر کچھ عرصے کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پھر اس پر اسٹک انہیڈ رائڈ کا عمل کیا جاتا ہے۔ جن سے سیلولوز اسیٹیٹ حاصل ہوتا ہے جسے اسٹون میں حل کرلیا جاتا ہے۔ اور اس محلول سے حسب طریقہ بالا ریشہ تیار کیا جاتا ہے ۱۸۵۷ء میں کیوپرا مونیم قاعدے کو جرمن کیمیا دان شوئٹزر ( Schweitzer ) نے وضع کیا۔ اس نے کاپر سلفیٹ اور امونیم اکسائیڈ میں سیلولوز کا محلول تیار کیا ۱۸۹۰ء میں Lousi Henri Despaissis نامی فرانسی کیمیا دان نے اس قاعدے سے مصنوعی ریشم تیار کیا۔ ۱۸۹۷ء میں جرمنی میں اس قاعدے سے تجارتی پیمانے پر مصنوعی ریشم تیار کیا جانے لگا۔ اگرچہ کہ یہ قاعدہ بعض لحاظ سے وسکوز قاعدے پر فوقیت رکھتا ہے تاہم وسکوز قاعدے کے مقابلے میں یہ بہت کم مروج ہے۔ اس قاعدے سے تیار کردہ ریشہ وسکوز ریشہ سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ نیز وسکوز قاعدے کی طرح اس قاعدے میں محلول کو رکھ چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر مصنوعی ریشم کی تیاری کے بعد صرف شدہ متعامل سے تانبے کی بازیافت ( Recovery ) کے سہولت بخش قاعدے کو وضع کئے جائیں

تو اس قاعدے سے تیار کردہ مصنوعی ریشم وسکوز قاعدے کی بہ نسبت سستا ہوگا۔

مصنوعی ریشم مضبوط اور قدرتی ریشم سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ قدرتی ریشم رنگنے پر وزنی ہوجاتا ہے۔ لیکن سوائے سیلولوز اسٹیٹ مصنوعی ریشم کے دوسرے مصنوعی ریشم کے ریشے ذکر نے پر پانی کو جذب کرکے کسی قدر پھول جاتے ہیں۔ اس لئے اس سے ان کی مضبوطی پر اثر پڑتا ہے۔ سیلولوز اسیٹیٹ مصنوعی ریشم کیمیائی ترکیب کی بنا پر کم رطوبت جذب کرتا ہے اس طرح اس کی مضبوطی کم ہونے نہیں پاتی، وسکوز اور دوسرے مصنوعی ریشم کے پوشاکوں کو اس نقص کی وجہ سے صابن دار پانی سے دھوتے ہیں پانی کے ساتھ جوش دینے۔ پانی میں دیر تک رکھنے یا کپڑوں کو ایسی بھٹی دھونے سے جہاں قوی مرکبات استعمال ہوتے ہیں مصنوعی ریشم کے تار بعض مقامات سے کھل جاتے ہیں۔

مصنوعی ریشم کی صنعت نے پارچہ بافی کی صنعت میں ایک انقلاب پیدا کردیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ قدرتی ریشم اس قدر قیمتی تھا کہ صرف امرا اور صاحب زر ہی اسے زیب تن کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ مگر اب مصنوعی ریشم کی صنعت کی وجہ سے ہر خاص و عام اسی کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتا ہے۔ جاپان اسی مصنوعی ریشم کی صنعت کے باعث پارچہ ساز ممالک میں سب سے پیش پیش تھا۔ سستے داموں ہندوستان سے روئی حاصل کرکے خوش نما خوش وضع پارچہ جات تیار کرکے بھیجتا تھا۔ اور اسی صنعت کی بدولت جاپان ایک صنعتی ملک بن گیا تھا۔



اس صنعت کے حیدرآباد میں فروغ کے بہت امکانات ہیں۔ بنشہ ۱۳ف میں حیدرآباد میں مصنوعی ریشم کی درآمد ۲۵ لاکھ ہے۔ اگر یہ صنعت ممالک محروسہ میں قائم کی جائے تو دس سال کے اندر پورے اخراجات کی ادائی کے علاوہ بڑی منفعت کا باعث ہوگی۔ ہمارے ملک میں سیلولوز کی پیداوار کچھ کم نہیں ہے۔ یہاں کپاس۔ بانس ساگری۔ سن کا ریزہ۔ انباڑے کا ریشہ۔ کیلے کا ریشہ۔ گھانس کا ریشہ۔ اناج کے ڈنٹھل۔ مکئی کے Cobs شکر سازی کے دوران میں حاصل کردہ راب Begasse جنگلات سے نکلا ہوا چوبینہ جو فرنیچر سازی میں کام آئے اور نہ جلانے کے لئے کام آسکتا ہے۔ سب پائے جاتے ہیں اور اس غرض کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں عادل آباد میں اندوک نامی لکڑی اس صنعت کے لئے بہت مفید پائی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں سیلولوز کا تناسب دیگر لکڑیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس صنعت کے قیام اور فراغ کے لئے ضروری کیمیائی اشیاء درکار ہیں۔ ہمارے پاس تانڈور اور دوسرے مقامات پر آئرن پائرٹیز کی کانیں ہیں۔ جہاں سلفیورک ترشہ کی کے قیام کے امکانات ہیں۔ برق آبی قوت کی پیدائش سے دیگر ضروری کیمیائی اشیاء تیار کی جاسکتی ہیں۔ اب رہا اس صنعت کے قیام کے لئے درکار مشینوں کا حصول اس کے لئے ظاہر ہے ہندوستان یورپ اور امریکہ کا دست نگر ہے۔ اناج کے ڈنٹھل اور دوسرے سیلولوز دار مادے جو یہاں ہر سال ضائع کردئے جاتے ہیں۔ اگر ان فاضل اور بیکار زرعی مادوں کو مصنوعی ریشم کی تیاری میں استعمال کیا جائے تو نہ صرف اس صنعت کا قیام ہوسکتا ہے

جبکہ فاقہ کش زراعت پیشہ نیز مزدور پیشہ طبقہ کو روزی بہ آسانی میسر ہو سکتی ہے۔ کسی بھی صنعت کے معاشی بنیاد پر ترویج کے لئے ضروری ہے کہ خام اشیاء اور کیمیائی متعاملات بہ آسانی دستیاب ہوں۔ ساتھ ہی زائد غیر مستعمل متعاملات کی بازیافت بھی کی جائے۔ متعاملات کی درکار مقدار کا لحاظ بھی ضروری ہے مثال کے طور پر پانی ہی کو لیجئے مصنوعی ریشم کی تیاری میں ہلکے پانی (Soft water) کی ضرورت ہوتی ہے۔ وسکوز قاعدے میں ایک پونڈ ریشہ کی تیاری کے لئے ۱۰۰ - ۲۰۰ گیلن پانی درکار ہوتا ہے۔ توانیت قاعدے میں ... اقلیلن سوتوں سے پاک پانی کا کم قیمت پر حصول بھی ایک دقت طلب امر ہے۔ اس لئے مصنوعی ریشم ساز پلانٹ کے قیام کے وقت ان تمام امور کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

یوں تو ہی پارچہ بافی کے ریشوں کی تیاری کی ابتدائی کوشش جس میں سیلولوز دار اشیاء سے مصنوعی ریشے تیار کئے گئے لیکن انسان کی جدت پسند اور غیر قانع طبع نے اس کی توجہ بعض ایسی اشیاء کی طرف بھی منعطف کرائی جن سے مصنوعی طور پر ریشے تیار کئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے غیر سیلولوزی ریشوں کی ایک معتدبہ تعداد تیار کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض اب تجارتی پیمانے پر تیار ہو رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ریشوں میں ایسی عمدہ خاصیتیں پائی جاتی ہیں جو مصنوعی ریشم یا قدرتی ریشم میں مفقود ہوتی ہیں۔

نیلان :- یہ تالیفی ریشہ پارچہ بافی کی صنعت میں انقلاب انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ ریشم سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ امریکہ کی مشہور ڈیوپانٹ کمپنی Dupout company جس نے امریکہ میں متعدد صنعتیں قائم کی ہیں ایسے تالیفی نامیاتی مرکبات کی تلاش میں تھی جن سے بہ آسانی اور عمدہ ریشہ تیار کیا جا سکے اس مقصد کے لئے اس نے ایک تحقیقاتی شعبہ قائم کیا۔ تحقیقات پر پتہ چلا کہ مصنوعی طور پر ریشہ کی پیدائش کے لئے کسی مرکب میں دو خاصیتیں پائی جانی چاہئیے۔

(۱) مرکب کے سالمات کافی بڑے ہوں (۲) ساختی اکائیاں پوری طور پر ترتیب پائی ہوئی ہوں۔ چنانچہ قدرتی ریشوں روئی۔ ریشم۔ اون کے سالمات کا بغور مطالعہ کیا گیا اور یہ معلوم کیا گیا کہ ان کے سالمات کافی وزنی ہوتے ہیں۔ روئی یا سیلولوز کے سالمات سادہ گلوکوز کے سالمات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سالمات اس طرح ترکیب شدہ ہوتے ہیں کہ ان کی کافی مقدار کے جمع ہو جانے کی وجہ سے ایک زنجیرہ بن جاتا ہے اور اس طرح ریشہ دار ساخت حاصل ہوتی ہے متذکرہ کمپنی تارکول کے حالات سے تالیفی ریشہ تیار کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ کافی تحقیقات کے بعد اس نے نیلان نامی ریشہ تیار کیا۔ نیلان کی تیاری کے لئے تارکول حاصلات ایڈیپک ترشہ (Adipicacid) اور ہکزا متھیلین ڈائی امین استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ترکیبی حاصل پر جب ایڈیپک ترشہ کے ایک اور سالمہ کا عمل کیا جاتا ہے تو حاصل کا سالمی حجم بڑھ جاتا ہے

اس طرح متعدد ایڈیپک ترشہ کے سالمات کے ادخال سے سالمہ کافی بڑھا ہوجاتا ہے۔ اور اس طرح ریشہ ساز خاصیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں پانی کو پیدا ہوتے ہی دور کر دیا جاتا ہے۔ اور محلل کی بازیافت تحویل شدہ دباؤ کے تحت کشید کر کے لی جاتی ہے۔ یہ تمام عمل نائٹروجن کی فضا میں کیا جاتا ہے تاکہ تحلیل واقع نہ ہو۔ اور اس طرح دھاگے میں کوئی نقص پیدا ہونے نہ پائے۔ اس طرح حاصل شدہ ریشوں کو ( Cold Drawing ) کے عمل کے ذریعہ کھینچتے ہیں یعنی سرد حالت میں کھینچ کر پھیلاتے ہیں جس کی وجہ سے سالمات ریشہ کے طولی طور کے متوازی پھیل جاتے ہیں۔ جس سے ریشے باریک اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔

مصنوعی ریشم Rayon اور قدرتی ریشم میں صرف طبعی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور کیمیائی لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔ لیکن نیلان طبعی اور کیمیائی ہر دو لحاظ سے قدرتی ریشم کے مشابہ ہوتا ہے۔ نیلان کے ریشے باریک لچکدار اور قدرتی ریشم سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں مختلف ریشوں کے تناؤ کی طاقت Tensile Strength کا مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نیلان ہی سب سے بہتر ہے۔

تناؤ کی طاقت کیلوگرام فی سمر ۲

روئی — ۲۸
ریشم — ۳۵
نیلان — ۵۰

۹۵

نیلان کی یہ طاقت ۲۰۵ م تک غیر متغیر رہتی ہے۔ یہ ریشے رطوبت کے مزاحم ہوتے ہیں۔ اور اس طرح رطوبت جذب نہیں کرتے۔ جیسا کہ مصنوعی ریشم کی بعض اقسام میں یہ نقص پایا جاتا ہے معمولی رنگ کٹ عامل مثلاً سوڈیم ہائپوکلورائیٹ یا ×۳ بز ہیڈروجن پر اکسائیڈ کے ساتھ ۲ گھنٹہ تک تماس میں رکھنے پر بھی عمل نہیں ہوتا معمولی مستعمل محللوں ( Solvents ) میں سے کوئی بھی اسے حل نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں عام کیمیائی متعاملات گرم قلیوں اور رصابی مائعات کا بہت کم عمل ہوتا ہے نیلان کے ریشے بہ آسانی کسی بھی خضاب سے رنگے جاتے ہیں۔ البتہ مختلف قسم کے خضابوں سے رنگ کے سایہ ( Shade ) اور رنگ کی پختگی میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ مصنوعی ریشم ( Rayon ) کو جلا کر قدرتی ریشم سے امتیاز کیا جا سکتا ہے لیکن نیلان اور قدرتی ریشم میں امتیاز مشکل امر ہے۔ دونوں مشکل سے جلتے ہیں جس سے منکہ نما ثقل حاصل ہوتا ہے۔

نیلان کی دریافت نے قدرتی ریشم نیز مصنوعی ریشم کی صنعت کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے فی الوقت نیلان کی قیمت قدرتی ریشم سے زیادہ ہی ہے۔ لیکن حالات کے موافق ہونے اور خام اشیاء کے کم قیمت پر دستیاب ہونے پر اس کی قیمت بہت کم ہو جائے گی۔ جنگ سے قبل جاپان کی مصنوعی ریشم کی صنعت پارچہ بافی کی صنعت میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔ اب امید کی جاتی ہے کہ نیلان اس کا قائم مقام ثابت ہوگا۔ جس طرح

تالیفی یا مصنوعی نیل کی دریافت سے ہندوستانی نیل کے بازار سرد پڑ گئے اسی طرح اب نیلان کی دریافت سے قدرتی ریشم کی صنعت کو سخت دھکا پہونچے گا۔ اس صنعت کے ہندوستان اور بالخصوص حیدرآباد میں قیام کیلئے کافی امکانات ہیں۔ کوئلہ یہاں کافی موجود ہے لیکن اس صنعت کے قیام کے لئے تارکولی حاصلات کی تیاری اور مناسب خبری کا حصول ضروری ہے۔

جنگ کے دوران میں جاپان میں دینائل ایسٹیٹ سے Japan's Synthetic No 1 تیار کیا گیا جو نیلان کے مماثل تھا۔

ریشہ American Viscose Co نے اسے تیار کیا۔ یہ پٹرولیم کے چشموں سے حاصل ہونے والی ایتھلین گیس اور ملاک (نمک طعام کے محلول) کی برق پاشیدگی سے حاصل شدہ کلورین سے تیار کیا جاتا ہے ان اشیا سے وینائل کلورائیڈ اور وینائل ایسٹیٹ تیار کئے جاتے ہیں۔ جن کے ترکیب سے سفید سفوف حاصل ہوتا ہے اسے اسٹون میں حل کرکے پہلے کی طرح ریشہ تیار کرتے ہیں۔ اس ریشہ میں یہ خاص بات پائی گئی کہ یہ پانی کم جذب کرتا ہے اور کیمیائی تعاملات کے لئے غیر عامل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے سفری کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔

۹۹

جیسا کہ اوپر بتلایا جاچکا ہے کہ بڑے سالمات دار اشیا سے مصنوعی ریشے تیار کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر پروٹین سے بھی مصنوعی ریشے تیار کئے گئے ہیں۔ ان میں سے دو ریشے مشہور ہیں۔

(۱) لینی ٹال Lanital (۲) آرالاک Aralac

Lanital لینی ٹال جسے لینی اون (Milk wool) بھی کہتے ہیں دودھ کی پروٹین کیسن (Casein) سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کیسن (Casein) اور اون کی کیمیائی مماثلت بہت عرصہ قبل معلوم تھی Antovnio ferrilli نامی اطالوی سائینداں نے دودھ کو ترشوں کی مدد سے بستہ کرکے کیسن حاصل کیا۔ اسے قلوی اشیا میں حل کرکے مطلوبہ لزوجت کی لیئی میں تبدیل کیا۔ اور اس لزج مائع کو حسب طریقہ بالا سوراخدار پچکاری کے ذریعہ فارم الڈی ہائیڈ محلول میں پھوار کی شکل میں داخل کیا۔ اس طرح ریشہ حاصل ہوا۔ مزید تحقیقات کی بنا پر اس لزج مائع میں بعض ایسی اشیا شامل کی گئیں جن کی وجہ سے ریشہ کی طاقت اور پن روک خاصیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا یہ ریشہ اون نما ہوتا ہے۔ اگر اس کو اون کے ساتھ ملا دیا جائے تو ان ملائے ہوئے ریشوں میں امتیاز تقریباً ناممکن ہے لینی ٹال میں قدرتی ریشم سے زیادہ گرم رکھنے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اسے کوئی بھی مطلوبہ رنگ دیا جاسکتا ہے۔ جرمنی۔ برطانیہ۔ بلجیم۔ ہالینڈ میں بعض اور ریشے یعنی پروٹین (Casein) سے تیار کئے گئے ہیں۔

( Aralac ) آرالاک کے نام سے ایک پلاسٹک کمین سے متحدہ امریکہ میں تیار کیا جا رہا ہے۔ مونگ پھلی میں پائی جانے والی پروٹین سے بھی بعض مصنوعی ریشے تیار کئے گئے ہیں۔ چنانچہ حکومت ہند کے پیش نظر اس قسم کے ریشوں کی تیاری ہے۔ ریاست حیدرآباد میں مونگ پھلی کی پیداوار کافی زیادہ ہے اس لئے یہاں اس قسم کے ریشوں کی تیاری ہوسکتی ہے۔ جرمنی اور جاپان میں ضائع شدہ یا مستعمل ریشم کو مناسب متعاملات میں حل کرکے محلول سے ریشہ تیار کرتے ہیں۔ جاپان اور امریکہ میں سویابین سے حاصل کردہ پروٹین سے پارچہ بافی کی گئی ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ بنگلور میں جہاں سویابین کی غذائی اور معاشی افادیت پر تحقیقات ہو رہی ہے ریشہ سازی کی کوشش ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں اناج کی پروٹین زین ( Zein ) سے ریشہ سازی ہی پر تحقیقات کی جا رہی ہے۔ جرمنی اور جاپان میں مچھلی کے پروٹین، بیکار حیوانی جلد اور عضلاتی بافتوں سے ریشے تیار کئے گئے تھے۔

شیشے سے بھی ریشے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ ( Fiber Glass ) کہلاتے ہیں شیشہ کے متعلق کیمیادانوں کا عرصہ دراز سے یہ خیال تھا کہ یہ غیر استعمال پذیر اور بلند تپش تک قائم رہ سکتا ہے ۱۸۹۳ء میں ایڈورڈ لیبی (Edward Libbey) نے شیشہ کی سلاخ سے سب سے پہلی مرتبہ شیشہ کے ریشے تیار کیا۔ شیشہ سے ریشہ تیار کرنے کے لئے شیشہ کو پگھلا کر اسے باریک سوراخوں میں سے گزارتے ہیں۔ سوراخوں سے نکلنے والے ریشوں کو گردشی آلے کی مدد سے گھماتے ہیں۔ چونکہ ریشوں کی ابتدائی رفتار گھومنے کے بعد کی رفتار سے کم ہوتی ہے اس لئے رفتار میں اضافہ کے باعث ان کا قطر سوراخوں سے بھی کم ہو جاتا ہے اور اس طرح باریک ریشے حاصل ہوتے ہیں $\frac{1}{۲۳۰۰}$ ریشہ کی تناؤ کی طاقت ۲۵۰،۰۰۰ پونڈ فی مربع انچ ہوتی ہے۔ شیشہ کے ریشے تنہا یا اسبطوسی ریشوں مصنوعی ریشم۔ ریشم اور سوت کے ساتھ مختلف اغراض کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ شیشہ دار اسبطوس سے ایسی اشیا تیار کی جاتی ہیں جہاں بلند تپش کی مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اشیا مضبوط اور ہلکی ہوتی ہیں مصنوعی ریشم نیز قدرتی ریشم کے ساتھ ملا کر اس سے ( Scarves-necktie ) ملبوسات اور دوسرے زیبائشی اشیا تیار کی جاتی ہیں وارنشوں کی تہہ چڑھانے پر شیشے کے کپڑے حاجز Insulating اشیا کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں اور ایسے کپڑوں کا برقی صنعت میں خصوصی طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ یہ کپڑے ہلکے ہوتے ہیں اور ان کی برقی مزاحمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آجکل انجینئر ان سے چھوٹے اور ہلکے برقی موٹر مبدل Trans formers اور دوسرے برقی مقناطیسی مشین تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے کپڑے بھی متمدن ممالک میں شیشے کے ریشوں سے تیار کئے جا رہے ہیں۔ ان پر تالیفی ربر کی ایک تہہ چڑھا دی جاتی ہے۔ یہ کپڑے آگ روگ Fire proof اور رطوبت روک ہوتے ہیں۔ شیشے کے ریشے پلاسٹک بیروزوں Resins

کے ساتھ ہوائی جہازوں کے حصوں کی تعمیر میں استعمال ہو رہے ہیں کیونکہ یہ ہلکے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کے لئے شیشے کے کپڑے کی تہوں کو پلاسٹکس سے تر کر کے تہہ بہ تہہ رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مطلوبہ دبازت آجاتی ہے۔ حاصل شدہ دبیز پرتوں سے (Laminites) تیار کرتے ہیں۔ مستقبل میں طیارہ سازی کی صنعت میں بہت زیادہ استعمال ہونگے ان پلاسٹک دار شیشے کے (Laminites) کی تناؤ کی طاقت ۵۰،۰۰۰ تا ۸۰،۰۰۰ پونڈ فی مربع انچ ہوتی ہے۔ پچکاؤ کی طاقت ۰۰۰،۰۰ ۵ پونڈ فی مربع انچ ہوتی ہے۔ شیشے کے ریشے جنگ کے دوران میں ایسے میگنشم کے ہوائی چھتریوں کی تیاریوں میں استعمال کئے جاتے تھے جنہیں بمباری کے دوران میں مقررہ نشان کو روشن کرنے چھوڑا جاتا تھا۔

کلورین شدہ ربڑ سے بھی پارچہ بافی کے ریشے تیار کئے گئے ہیں۔ خشک سمندری کائی سے (Adiginicaeid) ایڈیجنک ترشہ حاصل کیا گیا ہے۔ اس سے بھی مصنوعی ریشہ تیار کیا گیا ہے۔

یہاں ریشم کی کہانی رک جاتی ہے۔ لیکن ختم نہیں ہوتی۔ اس کہانی کا آغاز چین میں عرصہ دراز قبل کمزور کیڑے نے کیا تھا۔ اور اب یہ مغربی کرۂ ارض کی ریشم ساز فیکٹریوں میں اپنے منتہائے کمال پر پہونچ گئی ہے۔ ان خوردہ کیڑوں کی زندگی سے کھیل کر نہیں۔ بلکہ کیمیا کے صنعت پر اطلاق سے۔ صنف نازک کے زیبائشی شوق کو پورا کرنے کے جذبہ نے بھی اس میں بڑی معاونت کی ہے۔

محمد عبد الحمید صدیقی
ام ایس سی (آخری)



# رباعیات

از

سید عبد المجید خلش ال ال۔ بی (ابتدائی)

اے ساقی سیمیں بدن اب دیر نہ کر
اے لالہ رو چھلکا نہ گلابی ساغر
کیا جانے تو کیا رندوں پہ ڈھاتے ہیں ستم
یہ تیرا تبسّم ، تیری مخمور نظر

وہ محفل رقص اور وہ حسین منظر شام
وہ ساقیٔ گل رو وہ چھلکتے ہوئے جام
سمجھائیگا کیا ناصح کم فہم مجھے
میں جانتا ہوں اپنے گناہوں کا مقام

# دُعا

(۱)

درخشان تا بود شمس و قمر بر آسماں یارب
فروزان تا بود لعل و گہر در بحر و کاں یارب
بود بر جان و دلہاے خلایق حکمراں یارب
نظام الملک آصف جاہ سابع ظل سبحانی

(۲)

مبارک تا بود بر جبیں و زہرہ را قراں یارب
مشرف تا بود تاج و سریر از خسرواں یارب
بحق سید ابرار شاہ انس و جان یارب
بپاید شاہِ ما با شوکت و فرِ سلیمانی

(۳)

بود تا آسمان بر فرش خاکی سائباں یارب
بپاید تا بہاران در پس فصل خزاں یارب
شگفتہ تا بود نسرین و گل در بوستاں یارب
بفرق جامعہ ممدود ماند ظل عثمانی

محمد عبد الحمید خاں
سابق پروفیسر شعبۂ فارسی

# دی عثمان شاہی ملز محدود کے مزدوروں کا معاشی سروے

[اس مضمون کو سال گذشتہ میں میگزین کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ مدیر]

قبل اس کے کہ ہم اصل موضوع کی طرف رجوع ہوں مزدوروں کی جو حالت اور اہمیت موجودہ دور میں ہے اس پر نظر کریں تو بہتر ہوگا۔ محنت، پیدائش دولت کے عاملین میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔ محنت کو نہ صرف پیدائش دولت میں فوقیت حاصل ہے، بلکہ مبادلۂ دولت میں بھی محنت قدر کا معیار خیال کی جاتی ہے۔ چنانچہ ریکارڈو بھی اس عقیدہ کا قائل تھا کہ کسی شئے کی قدر کا انحصار اس محنت پر ہے جو اس شئے کی پیدائش میں صرف کی جاتی ہے۔ غرض دنیا کی معیشت میں محنت کو بڑی عظمت حاصل ہے اور معاشی زندگی کا کوئی شعبہ محنت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

جب نظام کارخانہ جات کو فروغ ہوا اور یہ بین الاقوامی بازاروں کی طلب کی تکمیل کا ذمہ دار بنا تو اس نظام نے پیدائش دولت کے ذمہ دار طبقے کے موقف میں انقلابی تبدیلی پیدا کی اور یہ طبقہ آجر اور مزدور دو گروہوں میں بٹ گیا۔ مزدوروں کا گروہ اپنی محنت کو جنس کی طرح بازاروں میں فروخت کرکے معاش حاصل کرتا ہے۔ اس کی اجرت کا مدار بھی اشیا کی طرح بازاروں کی طلب و رسد پر ہوتا ہے۔ مزدور طبقہ پیدائش دولت میں اپنی محنت سے حد درجہ مدد دیتے ہوئے بھی ضروریات زندگی کے لئے محتاج رہتا ہے کیونکہ کارخانوں میں جو اجرت انھیں دی جاتی ہے وہ بالعموم ناکافی رہتی ہیں اور اس سے وہ اپنی ضروریات زندگی بھی پوری نہیں کر سکتے لیکن یہ واضح ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا انحصار منافع پر ہے اور منافع اجرتی محنت کا آوردہ ہوتا ہے۔

جب مزدور کو اتنی اجرت نہ ملنے لگی جس سے وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکے تو وہ اس پر مجبور ہوگئے کہ آمدنی میں اضافہ کی خاطر عورتوں اور کمسن بچوں کو کارخانے میں ملازم رکھیں جس کی وجہ سے آبادی کے ایک بڑے حصہ کی خاندانی اور معاشرتی زندگی میں گوناگوں نقائص پیدا ہوتے چلے گئے اور ہوتے جارہے ہیں۔ برٹرنڈ رسل کا یہ خیال صحیح ہے کہ صنعتی ترقی کے ساتھ مذہب اور خاندان جو سماجی زندگی کے سہارے ہیں انسانی دماغوں سے اپنا تسلط کھو بیٹھے ہیں چنانچہ برطانیہ، امریکہ، جاپان اور جرمنی

میں جہاں صنعتی زندگی اپنے عروج پر ہے، جو سماج شکن عناصر ظہور پذیر ہو رہے ہیں وہ صنعتی ترقی ہی کا نتیجہ ہے طلاق کے اعداد و شمار میں تو امریکہ کو اولیت حاصل ہے اور یہ بھی ان ہی عناصر میں سے ایک ہے۔

مزدور مختلف قسم کے مظالم سہے جا رہے تھے کیونکہ صنعتی انقلاب نے ان کے ذرائع پیدائش کو تباہ کر دیا تھا۔ اس وقت حکومت مزدوروں اور آجروں کے مسائل میں مداخلت سے احتراز کر رہی تھی۔ کارخانجات کے نظام نے جہاں مزدوروں کی محنت کو جنس کی حیثیت میں بدل دیا وہاں اس نظام نے مزدوروں میں آجروں کی دراز دستیوں کے خلاف مزاحمت کرنے کے لئے اجتماعیت کا ایک مستقل نظام پیدا کیا۔ مزدوروں نے یہ محسوس کر لیا کہ آجروں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے لئے اتحاد از حد ضروری ہے چنانچہ اس نظریہ کے زیر اثر مزدور متحد ہونے لگے اور ان کی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ اس وقت رائے عامہ کا تعاون بھی ان کے شریک حال رہا۔

انہوں نے اپنی ان انجمنوں کے ذریعہ کمتر اوقات کار، بیشتر اُجرت اور دیگر سہولتوں کا مطالبہ شروع کیا۔ حکومت اور آجروں کی تحدیدات اور مخالفتوں کے باوجود ان کے اتحادات میں اضافہ ہوتا رہا اور اب وہ نہ صرف بیشتر اُجرت ہی کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ منافع کے بھی دعویدار ہیں۔ ملک میں اشتراکی خیالات کے پرچار نے ان کی ہمتوں کو اور بلند کر دیا۔ اب مزدوروں کے اتحادات ملکی حدود سے بڑھکر بین الاقوامی حیثیت حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں ۱۹۲۳ء کی پہلی بین الاقوامی مزدور مجلس نے ساری دنیا کے مزدوروں کو متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کر دیا ہے اور اب مزدور اپنے مطالبات کو منوانے میں بین الاقوامی اثرات سے کام لے رہے ہیں۔ ۱۹۴۴ء کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ فلاڈلفیا مزدوروں کے عالمی اتحاد اور سیاسی بیداری کا واضح مظاہرہ ہے اس کانفرنس میں سارے صنعتی ممالک کے مزدوروں کے نمائندے شریک رہے۔ ہندوستان میں مزدوروں کے مسائل کی نوعیت نحیف اور نومولود سی ہے۔

ہندوستانی مزدور جماعت میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ آبادی کے اعتبار سے اور دیگر مغربی ممالک کے مقابلے میں کم ہے۔ مختصر یہ کہ جب تک ہندوستان کے مزدور طبقے کے حالات اور اس کے مطالبات دونوں پر ہمدردانہ توجہ نہ کی جائے اور مزدوروں کا اشتراک عمل حاصل نہ کیا جائے کوئی صنعتی عمارت مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم نہ کی جا سکے گی۔ ملک میں مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ صنعتی تعلیم کا عام انتظام کیا جائے۔ مزدور کو کم از کم اتنی اُجرت دی جائے جس سے اس کی ضروریات آسانی سے پوری ہو سکیں اس کی صحت کے لئے طبی امداد کا انتظام ہو۔ سکونت کے لئے صحت بخش مکانات ہوں اور مزدور کو اس بات کا مکمل اطمینان ہو کہ اُسے بے روزگاری کا سامنا نہ کرنا پڑے گا اور ضعیفی کے دن بھی آرام سے کٹیں گے۔

بہر حال سرمایہ اور محنت کا یہ تصادم اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ مزدوروں کو ان کا پورا پورا حق نہ مل جائے۔

حیدرآباد میں بھی مزدوروں کی تعداد تو زیادہ ہے لیکن اِن میں باہمارت بہت کم ہیں اور ایک دقت یہ ہے کہ اکثر مزدور جبکہ کھیتوں میں کام نہیں رہتا تو کارخانوں کا رُخ کرتے ہیں اور ملازمت میں داخل ہوجاتے ہیں اور جب کاشت کا زمانہ آتا ہے تو اپنے اپنے دیہاتوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اس طریقہ سے کارخانہ دار کا کافی نقصان ہوتا ہے کیونکہ کام میں خلل واقع ہوتا ہے۔

بلدہ حیدرآباد میں پارچہ بافی کی صنعت کو دیگر تمام صنعتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ حیدرآباد میں کپڑے کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو محسوس کرکے، شہریور ۱۳۳۱ف کو بمبئی کے ایک تاجر سر فضل بھائی کریم بھائی نے عثمان شاہی ملز محدود کے نام سے ایک کارخانۂ پارچہ بافی کی رجسٹری کرائی۔ حکومت سرکار عالی نے اس فرم کو لاتور، ورنگل، ناندیڑ، اور منگولی میں کارخانہ جات قائم کرنے کی اجازت دی۔ کمپنی کا سرمایہ مجوزہ ایک کروڑ روپیہ کلدار قرار دیا گیا جس میں سے پچاس لاکھ روپیہ ادا شدہ سرمایہ تھا۔ کمپنی نے کارخانہ جات کی تعمیر کے لئے منگولی، ناندیڑ اور ورنگل میں زمین خریدی۔ ۲۹ جون ۱۹۲۲ء کو ناندیڑ میں عثمان شاہی ملز محدود کا سنگ بنیاد

۱۰۲

رکھا گیا۔ ابتدائی انتظامات اور عمارت مکمل ہوجانے کے بعد ۱۲ نومبر ۱۹۲۵ء کو کارخانے نے کام شروع کردیا۔ ۱۹۲۴ء میں کارخانے کے لئے (۱۶،۵۵۲) تکلیاں اور (۳۹۶) کرگھے خریدے گئے تھے۔ کمپنی کو معقول منافع ہورہا تھا اس لئے ۱۹۳۰ء میں یہ سمجھ کر کہ صنعت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوچکی ہے اس گروپ کے دوسرے کارخانے کے آغاز کا انتظام کیا جانے لگا۔ بدقسمتی سے ناندیڑ میں کارخانے کی تیاری کے اخراجات اندازے سے تجاوز ہوگئے اس لئے حکومت سرکار عالی سے مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ عثمان شاہی ملز محدود کے سرمایہ سے جن چار کارخانوں کو قائم کیا جانا مقصود تھا ان کو اب جاری نہ کیا جائے اور اس کے بجائے ورنگل میں کارخانے کے قیام کے لئے ایک نئی کمپنی کی اجرائی عمل میں لائی جائے جس کا دو ثلث سرمایہ عثمان شاہی ملز فراہم کرے۔ کمپنی نے اس پر عمل کیا اور کارخانوں کی کلوں اور عمارت وغیرہ کے مقابلہ میں حکومت سرکار عالی سے بارہ لاکھ روپیہ قرض حاصل کیا اور ورنگل کے نئے کارخانے اعظم جاہی ملز محدود میں مشغول کیا۔

لیکن ۱۹۳۳ء کا سال کارخانے کی مالیات کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس سال کارخانے کے مینجنگ ایجنٹ مسرز کریم بھائی اینڈ سنس کو کاروبار میں خسارہ ہوا اور انھوں نے کاروبار بند کردیا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ مینجنگ ایجنٹ نے کارخانے کے سرمایہ میں سے اٹھارہ لاکھ روپیہ اپنے کاروبار میں صرف کردئے ہیں۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ کے لئے کارخانے کا انتظام نظماء کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا لیکن بہت جلد حکومت

سرکارِ عالی نے کارخانہ کا انتظام اور فروخت پیداوار کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۷؍ جنوری ۱۹۳۴ء کو صنعتی ٹرسٹ فنڈ کی نگرانی کارخانہ ہذا پر عاید کردی گئی۔ کارخانے کی مالی حالت درست نہ تھی اس لئے حکومت نے بارہ لاکھ روپیہ کا ایک اور قرضہ پانچ فیصدی شرح سود پر کارخانے کو دیا۔ اس طرح کارخانے کو اصل زر فراہم ہو سکا۔

عثمان شاہی ملز نے اعظم جاہی ملز کو جس کا سرمایہ اٹھارہ لاکھ روپیہ تھا بارہ لاکھ روپیہ فراہم کیا۔ اس کے بھی مینیجنگ ایجنٹ سر کریم بھائی اینڈ سنس تھے اور ان کی ۱۹۳۳ء میں ناکامی کے سبب اس کارخانے کے کاروبار جو ابتدائی دور میں تھے رُک گئے تو سرمایہ کے ساتھ ہی کمپنی نے کارخانے کی ملکیت اور اثاثوں پر قرض حاصل کیا جس کے باعث کارخانے کو اجرائی کار ہی سے بھاری سود ادا کرنا پڑا۔

یہ ملز ضلع ناندیڑ میں ناندیڑ اسٹیشن سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ اس ملز میں تقریباً (۲۹۴۵) مزدور کام کرتے ہیں جن کی تقسیم مندرجہ جدول میں کی گئی ہے :-

| Serial No | Name of Deptt | Total number of Labourers | Remarks. |
|---|---|---|---|
| 1 | Electrical | 35 | |
| 2 | Boiler & Turbian | 100 | |
| 3 | Mechanic | 45 | |
| 4 | Frame | 45 | |
| 5 | Ring | 50 | |
| 6 | Reeling | 60 | Male & female labourers |
| 7 | Sizing | 60 | |
| 8 | Drawing | 40 | Male & female labourers |
| 9 | Winding | 130 | Only female labourers |
| 10 | Weaving | 1000 | |
| 11 | Folding | 40 | |
| 12 | Watch & ward | 100 | |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 13 | Dyeing | 50 | |
| 14 | Bleaching | 45 | |
| 15 | Cloth godown | 20 | Male & female labourers |
| 16 | Cotton | 60 | |
| 17 | Spinning | 800 | |
| 18 | Bundling | 90 | |
| 19 | Blouroom<br>Finishing<br>Warping | 40 | |
| 20 | Cloth shop | 15 | |
| 21 | Waste godown | 20 | |
| 22 | Welfare :<br>Housing, School,<br>Creche, Canteen,<br>Grain shop, Dispensary | 100 | Male & female |



## اوقات کار وغیرہ :-

مزدوروں کی زیادہ تعداد اسپننگ ڈپارٹمنٹ Spinning Dept اور ویونگ Weaving ڈپارٹمنٹ میں کام کرتی ہے۔ باقی شعبوں میں مزدوروں کی تعداد اوسط ہے۔ مل میں اوقات کار کی تقسیم دو نشستوں میں کی گئی ہے۔ دن میں ایک نشست ہوتی ہے جس کے اوقات کار سات بجے صبح سے پانچ بجے شام تک ہیں اور درمیان میں بارہ تا ایک' ایک گھنٹہ کا وقفہ ہوتا ہے۔ دوسری نشست ساڑھے پانچ بجے شام سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے تین بجے رات کو ختم ہوتی ہے۔ اس میں ساڑھے دس سے ساڑھے گیارہ بجے رات ایک گھنٹہ کا وقفہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے مزدور کو کسی ایک نشست میں بھی نو گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ نشست تو دس گھنٹے کی ہوتی ہے لیکن درمیان میں ایک گھنٹہ کا وقفہ دیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے نو گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ عورتوں

کو صرف دن میں کام کرنے کی اجازت ہے۔ رات میں صرف مرد مزدور کام کرتے ہیں۔ ہر ایک ماہ بعد دن کے شفٹ میں جو مرد مزدور کام کرتے ہیں۔ انھیں رات کے شفٹ میں ڈالا جاتا ہے اور جو رات کے شفٹ میں کام کرتے ہیں انھیں دن کے شفٹ میں ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح سے ہر ماہ بعد شفٹ میں تبدیلی ہوتی ہے۔

## اُجرتیں :-

سال گذشتہ ان مزدوروں کی اُجرتیں مختلف شعبہ جات میں حسب ذیل تھیں۔ ذیل میں کم از کم (اقل ترین) تنخواہ اور بیشترین تنخواہ جو اس شعبہ میں کوئی پا رہا ہے اُس کی تفصیل دی گئی ہے :-

| Serial No. | Name of Deptt | Minimum pay | Maximum pay | Remarks. |
|---|---|---|---|---|
| 1 | Electrical | 45 to 60 | 200 | |
| 2 | Boiler & Turbin | 50 to 80 | 350 | |
| 3 | Mechanic | 50 to 100 | 700 | بقیہ تمام شعبہ جات جن |
| 4 | Frame | 40 | | میں انتہائی یافت کا |
| 5 | Ring | 40 | | اندراج نہیں ہے وہ یا تو |
| 6 | Reeling | 30 | | Head Jobbar ہیڈ جابر کے تحت ہیں یا |
| 7 | Sizing | 60 | | Spinning master اور |
| 8 | Drawing | 50 to 80 | | Weaving master کے |
| 9 | Winding | 30 | | Head Jobber کی تنخواہ (۳۵۰) |
| 10 | Weaving | 50 | | روپیہ ماہانہ ہے اور ماسٹرس کی تنخواہ |
| 11 | Folding | 42 | | سات سو روپیہ ماہانہ ہے۔ |
| 12 | Watch & ward | 40 | 150 | Watchand ward کا شعبہ |
| 13 | Dyeing | 50 | 875 | Supervisor کے تحت ہے |
| 14 | Bleaching | 40 | | اور ان کی تنخواہ (۱۵۰) روپیہ ہے |
| 15 | Cloth godown | 40 | | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 16 | Cotten | 40 | | |
| 17 | Bundling | 30 | 250 | |
| | Blouroom | 50 | | |
| | Finishing | 60 | | |
| 18 | Warping | 70 | | |
| 19 | Cloth shop | 50 | | |
| 20 | Waste godown | 50 | 200 | |
| 21 | Spinning | 40 | | |
| 22 | Welfare :- Housing, School creche,, Canteen, Grain shop, Dispensary | 30 | 250 | |



ملز میں کام کرنے کے لئے مزدوروں کی بھرتی لیبر آفیسر (Labour Officer) یا سردار کی جانب سے نہیں ہوتی بلکہ راست طور پر جابر (Jobber) یا ہیڈ جابر (Head Jobber) مزدوروں کو بھرتی کرتا ہے مزدوروں کو اجرتیں ماہوار دیجاتی ہیں۔ آج سے تقریباً پانچ ماہ پیشتر مزدوروں کو جو اجرتیں دی جاتی تھیں اُن پر ۳۲ ½ فی صد گرانی الونس دیا جاتا تھا لیکن پانچ ماہ سے اجرتوں میں الونس گرانی کی حد تک اضافہ کیا گیا ہے اور وہی اُجرت قرار دی گئی ہے۔ اس طرح گرانی الونس کو تنخواہ میں ضم کر دیا گیا مثلاً اگر پہلے مزدور کو تیس روپیہ تنخواہ ملتی تھی تو اس پر دس روپیہ گرانی الونس ملتا تھا لیکن اب پانچ ماہ سے مزدور کی تنخواہ خود چالیس روپیہ کردی گئی ہے اور ان کو اس شرح تنخواہ پر مندرجہ ذیل الونس گرانی دیا جارہا ہے:

ایک تا تیس روپیہ تنخواہ پانے والے کو تین روپے۔
۳۱ تا ۵۰ " " " کو چار روپے آٹھ آنے
۵۱ تا ۱۰۰ " " " کو چھ روپیہ
۱۰۰ سے زائد تنخواہ پانے والوں کو اب مزید گرانی الونس نہیں مل رہا ہے۔

اُجرتوں کے متعلق مزدوروں کا یہ کہنا ہے کہ ان کو ان کی صحیح تنخواہ کا کوئی علم نہیں ہے اور اُجرتوں

کے اضافہ کو یہ لوگ بھول بھلیاں کہتے ہیں اور دریافت پر ان لوگوں نے بتایا کہ ان کی حقیقی یافت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ ایسے مزدور جن کو کام کے حساب سے اُجرت ملتی تھی، کام کی اکائی بڑھا دینے کی وجہ سے پہلے سے کم اجرت پا رہے ہیں۔

مزدوروں کی اجرتوں پر غور کیا جائے تو اُجرتیں تیس روپیہ سے شروع ہو کر سات سو روپیہ تک ہیں۔ فی الحال جھاڑو دینے والیوں کو بھی گرانی الونس وغیرہ ملا کر تیس روپیہ تنخواہ مل رہی ہے لیکن دریافت پر معلوم ہوا کہ ایسی عورتیں جو وائینڈنگ میں کام کرتی ہیں اور جن کو کام کے حساب سے اُجرت دی جاتی ہے ان میں سے بعض کی اُجرتیں بہت کم ہیں۔ ایک عورت سے دریافت پر اُس نے بتایا کہ گذشتہ ماہ میں اس نے (۲۳) دن کام کیا اور ملز بھی تیئس دن کھلی رہی تو اُسے ختم ماہ تک بارہ روپیہ کا غلہ دیا گیا اور نو روپیہ دئے گئے۔ اس طرح سے اُس عورت کو جملہ اکیس روپیہ اُجرت ملی۔

ادائی اجرت کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک تو ایسا جس میں مزدوروں کو ماہوار مقررہ اجرت ادا کی جاتی ہے اور دوسرے میں کام کے حساب سے اجرت ادا کی جاتی ہے پہلے طریقے میں بھی اگر تعطیلات آجائیں تو تنخواہ کاٹی جاتی ہے مثلاً اگر ایک مزدور کو ماہوار تیس روپیہ مقرر ہے لیکن کسی ماہ میں ملز اگر صرف چھبیس دن کام کرے تو اُس کو چھبیس روپیہ اُجرت ملے گی۔ لیکن اس طریقے میں ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ اگر مزدور ملز کو آکر کام نہ کرے یا اس کو کام نہ ملے تو بھی اُس کو اُس روز کی تنخواہ دیجاتی ہے لیکن اگر کام کے حساب سے اُجرت پانے والا کوئی مزدور کسی دن ملز کو آنے کے بعد اپنا مقررہ کام نہ کرے تو اُس کو اُجرت نہیں ملتی یا اُجرت ملتی ہے بھی تو کم کام کے لحاظ سے کم۔ مثلاً اگر کوئی مزدور روزانہ دس چرخیاں تاگہ لپیٹ کر پندرہ آنے کماتا ہے لیکن اگر وہ کسی دن صرف پانچ چرخیاں تاگہ لپیٹے تو اُسکی اُس دن کی اجرت صرف سات آنے چھ پائی شمار ہوگی اس طرح ایسے مزدور جن کو کام کے حساب سے اُجرت دیجاتی ہے ایک طرح سے نقصان میں رہتے ہیں

مزدوروں کو تقریباً چار سال سے بونس دیا جا رہا ہے جس کی مقدار ادنیٰ مزدوروں میں تنخواہ کی دوگنی ہے۔ ذیل میں چار سال کے بونس کا ذکر ہے اور اس کے محاذی مزدوروں کو جو اُس وقت اُجرت دی جا رہی تھی اُس کا بھی اندراج ہے :-

| بونس | تنخواہ جو اُس وقت دی جا رہی تھی |
|---|---|
| ۲۴ روپیہ | ۱۲ روپیہ + ۴ روپیہ الونس گرانی |
| ۲۹ روپیہ | ۱۲ روپیہ + ۸ روپیہ " |
| ۲۸ روپیہ | ۱۲ روپیہ + ۸ روپیہ " |

دریافت سے یہ بھی پتہ چلا کہ صرف چند سال پیشتر ہی ایسی مزدور عورتوں کو جن کو اُجرت کام کے لحاظ سے
ملتی تھی، اوسط اجرت دوسرے مزدوروں کی طرح حاصل کرنے کے لئے تقریباً بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا
لیکن اب ان کو بھی صرف نو گھنٹے ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی تبلایا کہ روزانہ نو گھنٹے ہی کام کرنا
پڑتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ روزانہ نو گھنٹے کام یہ لوگ تقریباً ۲/۳ ۱ برس سے کر رہے ہیں۔ مزدوروں
نے یہ بھی بتایا کہ چند سال پیشتر ہی معمولی غلطیوں اور خرابیوں پر کافی جرمانہ کیا جاتا تھا اور اکثر معطل
کیا جاتا تھا، لیکن اب اس میں کمی ہوئی ہے۔ اجرتوں کے متعلق مزدوروں کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اجرتوں
کا جو ماہواری حساب کیا جاتا ہے، اس سے وہ مطمئن نہیں کیونکہ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کی اُجرتیں
مختلف حسابی غلطیوں کی وجہ سے جو اہلکاروں سے سرزد ہوتی ہیں، ان کو کم اُجرتیں ملتی ہیں۔

عام طور پر ہفتہ میں ایک دن یعنی جمعہ کو تعطیل دی جاتی ہے اور اگر جمعہ کے بعد ہی یا جمعہ سے پیشتر ہی کوئی اہم
تعطیل آجائے تو وہ تعطیل دیدی جاتی ہے اور جمعہ کو کام لیا جاتا ہے۔ مل کو قائم ہوئے پچیس ۲۵ سال کا عرصہ
ہوتا ہے لیکن اب تک رخصت معہ تنخواہ کا رواج نہیں۔ پانچ ماہ قبل سے البتہ سال میں دس یوم کی رخصت
معہ اُجرت کی منظوری کے احکام آئے ہیں۔ اگر کوئی مزدور بغیر اطلاع کے غیر حاضر ہو جائے تو اسے چار آنے
جرمانہ کیا جاتا ہے اور اگر وہ چار روز تک غیر حاضر ہو جائے (بغیر اطلاع) تو تین یا چار روز تک کے لئے معطل
کردیا جاتا ہے اور اگر دس روز سے زیادہ تک بغیر اطلاع کے غیر حاضر ہو جائے تو فیکٹری ایکٹ کے تحت
اس کو برطرف کردیا جاتا ہے۔

اگر کوئی مزدور ڈیوٹی پر ہو اور کوئی حادثہ پیش آئے جس سے اس کے عضو جسمانی بیکار ہو جائیں تو
ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ پر لیبر کمشنر ضلع یعنی اول تعلقدار اور مینیجر مل اسکی
اُجرت اور سینیارٹی وغیرہ پر غور کرکے قانون کمپنی کی رو سے اُس کو ادا شدنی رقم مشخص کرتے ہیں۔

مزدوروں کے تحت جو اوسط خاندان ہے وہ پانچ افراد پر مشتمل ہے جس میں ایک مزدور، دوسرے
اس کی بیوی، اُس کے دو بچے اور ایک بوڑھی ماں یا باپ ہے اس طرح سے ان پانچ افراد میں صرف
ایک مزدور اپنی اُجرت سے خود کی اور بقیہ چار افرادِ خاندان کی پرورش کر رہا ہے۔ اکثر یہ سوال پیدا ہوتا
ہے کہ کیوں مزدور اپنی بیوی کو کارخانے میں نوکر نہیں رکھتا۔ اس کا جواب اکثروں نے یہ دیا کہ یہ ناممکن
ہے کیونکہ گھر کا کام کاج خود اتنا ہوتا ہے کہ مزدور کی بیوی کو اُس سے فرصت نہیں ملتی کیونکہ اکثر اوقات
اسے اپنے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کپڑے وغیرہ دھونے، سودا لانے اور گھر کے متعلق کاروبار انجام
دینا پڑتا ہے اور پھر اس کے سپرد اپنی بوڑھی ساس یا سُسر کی خدمت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ممکن نہیں

کہ وہ کارخانے میں نو گھنٹے کا کام کرنے کے بعد گھر کا یہ سب کام انجام دے سکے۔ عدیم الفرصت ہونے کے باوجود بھی اکثر عورتوں نے کہا کہ اگر کبھی انھیں فرصت مل جائے تو وہ مختلف قسم کے کاروبار مثلاً دھان کوٹنا اور تعمیراتی کاموں وغیرہ میں حصہ لیکر کچھ پیسے پیدا کرلیتی ہیں۔ تو پھر مزید ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان وجوہات کی وجہ سے عورتیں کارخانے میں کام نہیں کرسکتیں تو پھر آخر ان عورتوں کا کیا حال ہے جو کارخانے میں کام انجام دے رہی ہیں۔ اس میں دریافت پر معلوم ہوا کہ زیادہ تر ایسی عورتیں ہیں جن کے یا تو شوہر مرچکے ہیں یا جن کو کوئی اولاد نہیں۔

مل میں ہفتہ میں چوّن گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ اُجرتوں کی ادائی کے سلسلہ میں مل کے دفتر میں تمام غیر حاضریوں وغیرہ کے اندراجات کی رو سے تنخواہ اگر وضعات ہوتی ہے تو وضعات ہوکر یا اگر اور ٹائم کے سلسلے میں یا اگر کسی اور سلسلے میں کچھ زیادہ ہو تو زیادہ کرکے تنخواہ کا حساب کیا جاتا ہے اور تنخواہ دی جاتی ہے۔ تنخواہ مزدوروں کو ہیڈ جابر یا صدر شعبہ کی موجودگی میں راست مل کی جانب سے دی جاتی ہے۔

## مل کی جانب سے سہولتیں:-

مل کے مزدوروں کو اُجرت کے علاوہ مل کی جانب سے چند سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کو مل میں جو غلے کی دوکان ہے اس سے جنگ سے پیشتر تو بازار کی نسبت کافی ارزاں داموں پر غلہ ملتا تھا لیکن اب بھی بازار کی نسبت سستے داموں پر غلہ فراہم کیا جارہا ہے۔ یہ غلہ مزدوروں کو ان کی تنخواہ کی نسبت سے دیا جاتا ہے مثلاً ایک مزدور جس کی تنخواہ مل میں اقل ترین ہے اس کو بارہ روپیہ کا غلہ دیا جاتا ہے اور اگر یہ غلہ اس کے اور اس کے خاندان کے لئے ناکافی ہو تو بقیہ غلہ اس کو بازار سے خریدنا پڑتا ہے۔ زمانۂ قبل جنگ میں غلے کی فراہمی بازار سے کچھ دشوار طلب نہ تھی لیکن آجکل غلہ کی دستیابی ایک دقت طلب امر ہے۔ پہلے تعلقداری میں جاکر اجازت لینی پڑتی ہے۔ وہاں سے مددگار صاحب رسد سے تصدیق کرانی پڑتی ہے اور پھر یونین کے دفتر میں اجازت نامہ کا اندراج ہوکر یونین کی دوکان سے یا کسی اور دوکان سے غلہ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس طرح آجکل مزدوروں کے لئے یہ بیحد دقت طلب ہے کہ وہ اپنی ضرورت میں سے تھوڑا غلہ تو مل کی دوکان سے بآسانی حاصل کریں اور بقیہ کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کریں۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ مل کی جانب سے مزدور کے یہاں جو افراد پرورش پارہے ان کی صحیح تعداد معلوم کی جائے اور اتنے افراد کا غلہ حکومت سے حاصل کرلیا جاکر کم نرخ پر نہ سہی بازاری نرخ پر ہی مزدوروں کو فراہم کیا جائے۔ اس طرح ان کی پریشانی رفع ہوسکتی ہے اور وہ دلجمعی سے

کام کر سکتے ہیں ورنہ مزدور کو تو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ مل کے اوقات کار کے بعد یہ تمام کاروبار انجام دے۔ اس مسئلہ اس کے پیشِ نظر یہ مسئلہ بیحد پریشان کن ہے۔

## مزدوروں کو کپڑا :-

مل کی جانب سے مزدوروں کو سال بھر میں بیس روپیہ کا کپڑا ہر سہ ماہ میں پانچ روپیہ کا کپڑا دیا جاتا ہے۔ یہ کپڑا اسکنڈ کوالٹی ہوتا ہے یعنی یہ ایسا کپڑا ہوتا ہے جس کے کسی تھان میں کہیں کوئی تاگہ چھوٹ گیا ہو یا کہیں تیل وغیرہ کا دھبہ پڑ گیا ہو یا کسی جگہ رنگ خراب ہوگیا ہو۔ یہ کپڑا بھی مزدوروں کو رعایتی قیمت پر دیا جاتا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہاں جو کپڑے کی قیمت مزدور سے لی جاتی ہے وہ بازار کی قیمت کی ایک تہائی ہوتی ہے۔ اس طرح مزدور کو بازاری نرخ سے سالانہ ساٹھ روپیہ کا کپڑا ملتا ہے۔

## مزدوروں کی بستی :-

مزدوروں کی بستی کا ذکر کرنے سے قبل ان بنگلوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جن میں مل کے اعلیٰ عہدہ دار مقیم ہیں۔ مل کے چار بڑے عالی شان بنگلے احاطہ مل ہی میں ہیں۔ ان میں مینجر، انجنیر، ویونگ ماسٹر، اور اسپننگ ماسٹر مقیم ہیں۔ یہ بنگلے تمام عصری ضروریات سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ ان بنگلوں کا کرایہ جو مقیم اصحاب کی تنخواہ میں سے وضعات کیا جاتا ہے وہ صرف تیس روپیہ ماہانہ ہے۔ حالانکہ بنگلہ دیکھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ اگر اس بنگلے کو خود ضلع ناندیڑ میں کرایہ پر اٹھایا جائے تو اس کا کرایہ بآسانی ایک سو پچیس روپیہ آسکتا ہے۔ اس طرح سے ان چاروں اصحاب کو جن کی تنخواہیں علی الترتیب بارہ، نو سو، سات سو، سات سو ہیں، ماہانہ تقریباً سو روپیہ کی اور سالانہ بارہ سو روپیہ کی صرف کرایہ مکان میں بچت ہوتی ہے۔ مزدوروں نے شکایت کی کہ ان اصحاب کو اتنی تنخواہیں ہیں تو مکانات بنا کر دینے کی ضرورت ہی نہیں اور اب اگر دیا گیا ہے تو ان سے واجبی کرایہ لیا جائے۔ یہ نہیں کہ رعایت بالکل نہ رکھی جائے بلکہ رکھی جائے لیکن کم رکھی جائے۔ اور پھر ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ مینجر کے گھر کے تمام ملازمین مل کے نوکر ہیں۔ اس طریقے سے ان کو تنخواہ تو مل کی جانب سے ملتی ہے لیکن کام مینجر کے بنگلہ پر کرنا پڑتا ہے۔ یہ چار بنگلے بگ بنگلوس ( Big Bung lous ) کے نام سے موسوم ہیں۔ ان چار بنگلوں کے علاوہ تمام کوارٹرس مل کے احاطہ کے باہر آدھے فرلانگ سے لے کر تقریباً ایک میل کی دوری تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ اور چار کوارٹرس ہیں جو آفیسرس کوارٹرس کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں بھی مل کے عہدہ دار مثلاً ہیڈ جابر وغیرہ مقیم ہیں۔ ان کا کرایہ فی کوارٹر دس روپیہ لیا جاتا ہے۔ ان کوارٹرس کا کرایہ عام طور پر چالیس روپیہ آسکتا ہے۔ اس طرح سے ان لوگوں کو ماہانہ تیس روپیہ کی اور سالانہ تین سو ساٹھ روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔ ان کوارٹرس میں تین کمرے = ۱۵ × ۱۰ کے ہیں

ایک وراندہ = ۱۵´ × ۸´ کا ہے ۔ اس کے علاوہ باورچی خانہ حمام موری خانہ اور پاخانہ ہے اور صحن کافی بڑا ہے ۔ ان میں نل اور برقی روشنی ہے ۔

نیو بلاک نمبر ۲۴ (NEW BLOECK NO. 24) ایسے سولہ کوارٹرس ہیں اور یہ کوارٹرس دو منزلہ ہیں۔

ان کوارٹرس میں دو کمرے = ۱۲´ × ۱۲´ ایک نیچے اور ایک اوپر ہیں ۔

کمرہ ایک = ۱۲´ × ۶´ نیچے ۔ اس کمرہ میں سے اوپر جانے لکڑی کی بنی ہوئی سیڑھی ہے جو بہت چھوٹی اور تکلیف دہ ہے۔

کمرہ ایک = ۸´ × ۶´ اوپر ۔

حمام و پاخانہ ہر ایک = ۵´ × ۴´ ۔

صحن = ۱۰۰ مربع فیٹ ۔

اوپر کے دونوں کمروں میں ایک ایک کھڑکی اور نیچے کے کمرے میں ایک کھڑکی ہے ۔ نیچے کے کمرے کے سامنے ایک وراندہ ہے جس کا طول بارہ فیٹ اور عرض ۴½ فیٹ ہے ۔ اس میں صرف نل ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کوارٹر کا کرایہ آٹھ روپے لیا جاتا ہے لیکن عام طور پر کرایہ بیس روپیہ آسکتا ہے ۔ اس طرح سے ان میں رہنے والوں کو ماہانہ بارہ روپیہ کی اور سالانہ ایکسو چوالیس روپیہ کی بچت ہوتی ہے ۔



بمبئی چال (BOMBAY CHAWAL.) اس میں دس کوارٹرس ہیں جس میں سے ہر ایک میں کمرے دو = ۱۱´ × ۱۰´ ۔ وراندہ ایک = ۱۱´ × ۵´ ۔ اوسط صحن ۔ باورچیخانہ حمام اور پاخانہ بھی ہے ۔ اس میں نل بھی ہے اس کا کرایہ ماہانہ سات روپے لیا جاتا ہے اور عام طور پر کرایہ پندرہ روپیہ آسکتا ہے ۔ اس طرح سے ان میں رہنے والوں کو ماہانہ آٹھ روپیہ اور سالانہ (۹۶) روپیہ کا ایک طرح سے منافع ہوتا ہے ۔

نیو بلاک نمبر ۱۳ (NEW BLOECK NO. 13) ایسے بیس کوارٹرس ہیں جن میں حسب ذیل مکانیت ہے:

کمرہ ایک = ۱۲´ × ۱۰´

وراندہ ایک = ۱۲´ × ۵´ کھلا ہے صرف ایک چار فیٹ اونچی دیوار اٹھی ہوئی ہے ۔ حمام اور باورچیخانہ ہر ایک ۲½ فیٹ لانبا اور ۲½ فیٹ چوڑا ہے ۔ صحن اٹھارہ مربع فیٹ ہے ۔ ان کوارٹرس میں پاخانہ نہیں ہے بلکہ ایسے تمام کوارٹرس کے لئے چھ پاخانے ہیں جو علٰحدہ بنے ہوئے ہیں ۔ اس طرح سے پردہ کرنے والی عورتوں کے ساتھ ان مکانات میں نہیں رہ سکتے کیونکہ پاخانے کے لئے باہر جانا پڑتا ہے ۔ اور بے پردگی ہوتی ہے ۔ اس طرح سے یہ مکانات خصوصاً ایسے مزدوروں کے لئے جو مسلمان ہوں اور جن کے یہاں پردہ کرنے والی عورتیں ہوں بیحد تکلیف دہ ہیں لیکن بحالت مجبوری اس میں بھی چند مسلمان مزدور ٹھیرے

ہوئے ہیں اور چند تو صرف تنہا ہیں اور زنانے کو اپنے رشتہ داروں کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ ان مکانات کا کرایہ مل کی جانب سے چار روپیہ ماہانہ لیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کا کرایہ پانچ روپیہ آسکتا ہے۔ اس طرح سے ان میں رہنے والوں کو ایک طرح سے ایک روپیہ ماہانہ اور بارہ روپیہ سالانہ کی بچت ہوتی ہے۔ اس میں نل ہے اور نہ برقی روشنی۔

**پکی چال۔** اس میں بارہ بلاک ہیں اور ہر بلاک میں بارہ کوارٹرس ہیں لیکن ایک بلاک میں دس کوارٹرس ہیں۔ اس طرح سے ایسے (۱۴۲) کوارٹرس ہیں۔ ہر کوارٹر میں صرف ایک کمرہ ۱۲' × ۱۰½' کا ہے۔ یہ کمرہ انگریزی کویلو کا ہے۔ اس کمرہ میں ایک کھڑکی اور ایک موری ہے۔ کمرے کے سامنے ایک ٹین کا وراندہ ہے جو ۱۲' × ۴½' کا ہے۔ اس میں نہ تو صحن ہے نہ باورچی خانہ اور نہ پاخانہ۔ اس میں ہر ایک کوارٹر کا کرایہ دو روپیہ ماہانہ لیا جاتا ہے اور شہر میں بھی ایسی ایک ملگی دو روپیہ ماہانہ کرایہ پر ہی دستیاب ہو سکتی ہے۔ اس طرح سے ان میں مل کے ادنیٰ مزدور رہتے ہیں اور واقعی اگر دیکھا جائے تو مل کو ان ہی مزدوروں کی مدد اور اعانت کرنی چاہیئے لیکن مل اس کی طرف سے لاپرواہی اور بے رخی برت رہی ہے۔ سوائے ان کمروں کے تمام مکانوں میں رہنے والوں کو کم کرایہ سے ایک طرح کی تسکین پذیری حاصل ہوتی ہے لیکن ان بیچارے غریبوں ہی کو کسی قسم کی کرایہ میں تسکین پذیری حاصل نہیں ہوتی حالانکہ ان کو ہی زیادہ تسکین پذیری حاصل ہونی چاہیئے تھی!

**نلہ گنٹہ چال۔** اس میں پندرہ بلاک ہیں اور ہر بلاک میں چھ کوارٹرس ہیں۔ کوارٹر کیا ہیں صرف ایک کمرہ ہے جو ۹ × ۹ کا ہے اور جس کی دیواریں اور چھت سب ٹین کی بنی ہوئی ہیں۔ اس طریقہ سے یہ (۸۱) مربع فیٹ کا ٹین کا کمرہ ہے۔ نہ ہی اس کے سامنے وراندہ اور نہ ہی اس میں کھڑکی ہے۔ صرف ٹین کی دیوار ایک جگہ سے کاٹ کر ایک طرح کا روشندان بنا دیا گیا ہے۔ اس میں رہائش مفت ہے۔ کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔

**گنگا ٹن چال۔** اس میں ایک سو نو کمرے ہیں اور کمرے بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ نلہ گنٹہ چال میں یہ بھی مفت ہیں۔ اس کے علاوہ مزدوروں کو جھونپڑیاں ڈال کر رہنے کے لئے دیگئی ہیں۔ ان جھونپڑیوں کی تعداد (۱۴۶) ہے اور ان میں بھی رہائش مفت ہے۔

نلہ گنٹہ اور گنگا ٹن چال میں جملہ دو سو اسی کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں ایک خاندان بستا ہے۔ میں نے بہت سی چالوں کا معائنہ کیا۔ ان میں سے مجھے کوئی ایسی چال نظر نہ آئی جس میں ایک تنہا مزدور یا مزدورنی رہتی ہو بلکہ ہر چال میں نہ صرف ایک مزدور اور اس کی بیوی بلکہ اس کے ایک دو چھوٹے بچے بھی رہتے ہیں ان لوگوں نے اسی کمرے کے ایک کونے میں دو تین چولھے لگا لئے ہیں اور وہیں پکاتے ہیں۔ بعض مزدور کی

نے کمرے کے اندر سے باہر ایک موری بنالی ہے۔ اس طرح سے وہ اپنے برتن بھی اندر ہی دھوتے ہیں جس سے کمرے کی غلاظت اور بڑھ گئی ہے۔ دھوئیں سے کمرے کالے ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ صبح میں منہ ہاتھ بھی اپنے اپنے کمروں کے سامنے کے کھلے چھتے میں دھوتے ہیں جس کی وجہ سے غلاظت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً دس بارہ کمرے ہیں اور بیچ میں کافی جگہ چھوڑ کر دوسرے کمروں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ چولھے کمرے کے اندر ہی ہونے کی وجہ سے اور کمرے کی گنجائش چھوٹی ہونے سے ہر وقت آگ لگنے کا ڈر لگا رہتا ہے اور خصوصاً بعض مزدوروں کے گھروں میں جن کے یہاں کمسن بچے رہتے ہیں نہ صرف کمرہ جلنے کا بلکہ بچے کی جان کا بھی خطرہ لگا رہتا ہے۔ مزدوروں سے دریافت پر انھوں نے ان کمروں کو بے حد تکلیف دہ بتایا اور درحقیقت یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ سردیوں میں کمرے کی دیواریں اور چھت جو ٹین کا ہے بیحد سرد ہو جاتا ہے اور مزدوروں کو اندر اکڑنے کی نوبت آتی ہے' اور گرمیوں میں انھوں نے اپنی حالت اُبالے ہوئے بیگن کی بتلائی کہ نہ کمرے ہی میں رہا جا سکتا ہے اور نہ ہی باہر نکلا جا سکتا ہے۔ جہاں پر یہ کمرے ہیں اُس میدان میں درخت بھی کم ہیں جن کے سایے میں یہ لوگ اپنا کچھ وقت گزار سکیں۔ ان میں رہنے والوں کے لئے بھی مل کی جانب سے تقریباً آدھ فرلانگ کے فاصلہ پر پاخانے ہیں اور پاخانوں کے قریب میں نل بھی ہیں جہاں سے یہ لوگ اپنی ضرورت کے لئے پانی لیجاتے ہیں۔ پاخانے دور ہونے کی وجہ سے ان میں رہنے والے مزدوروں کے بچے اکثر اپنے کمروں کے پیچھے ہی بول و براز کرتے ہیں۔

۱۴

## کنٹین (Canteen) :-

مل کی جانب سے احاطۂ مل میں ہی ایک کنٹین قائم ہے۔ اس میں ایسے مزدوروں کو جو کھانا کنٹین ہی میں کھانا دیا جاتا ہے۔ کھانا دو وقت دیا جاتا ہے اور ماہانہ بارہ روپیہ لئے جاتے ہیں۔ کھانے میں مسلمان مزدوروں کو جوار کی روٹی، خشکہ، ایک دال اور ایک میٹھا سالن دیا جاتا ہے۔ کھانا مزدور پیٹ بھر کر کھا سکتا ہے۔ جمعہ کو اسپیشل فوڈ دیجاتی ہے جس میں بریانی، میٹھا وغیرہ شامل ہوتا ہے۔

ہندوؤں کے لئے علحدہ پکوان ہوتا ہے اور ان مزدوروں کو روزانہ جوار کی روٹی، خشکہ، دال اور سبزی دی جاتی ہے اور ان کو بھی ہفتہ میں ایک دفعہ اسپیشل فوڈ دی جاتی ہے جس میں پوری، شیرہ، لڈو وغیرہ شامل رہتے ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ کنٹین میں روزانہ ہندو، مسلمان جملہ ایک سو نو ۱۰۹ مزدور کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنٹین میں چائے ہر وقت تیار ملتی ہے۔ چائے کے لئے مزدوروں کو ٹکٹ کی ایک کاپی دی جاتی ہے اور اس میں ہر ٹکٹ آٹھ پائی کا ہوتا ہے۔ اگر پوری کاپی خریدی جائے تو مزدور کو دو چار آنے رعایت سے دی جاتی

ب۔ کنٹین میں چائے آٹھ پائی فی پیالی فروخت ہوتی ہے اور پان ڈیڑھ پیسے میں دو بیڑے ملتے ہیں اور سگریٹ کا [illegible] وہی ہے جو بازار میں ہے۔ کنٹین سے مزدور چائے، پان، سگریٹ کی حد تک بہت زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ کنٹین میں روزانہ تقریباً چھ سو پیالی چائے فروخت ہوتی ہے۔ اس طرح پان اور سگریٹ بھی زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ ایسے مزدور جو گھر پر کھانا کھاتے ہیں وہ بھی چائے کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح [illegible] چائے نوشی کی عادت بہت ترقی کر گئی ہے۔

### کریش (Creche):

اس کا انتظام بھی ویلفیر (Welfare) کے تحت ہے۔ اس میں ایسے بچوں کو رکھنے کا انتظام ہے جن کی مائیں ملز میں کام کرتی ہیں اس میں نو مولود بچوں سے لے کر چار پانچ سال تک کے بچے رکھے جاتے ہیں۔ ملز میں عورتیں تو صرف دن میں کام کرتی ہیں۔ جب عورتیں کام کرنے آتی ہیں تو اپنے بچوں کو یہاں چھوڑ دیتی ہیں۔ ان بچوں کے لئے سات دایائیں ملز کی جانب سے مقرر ہیں جو بچوں کی نگرانی کرتی ہیں [illegible] ان کو دودھ پلاتی اور کھانا کھلاتی ہیں۔ ایسے بچے جو صرف دودھ پیتے ہیں ان کو دس گھنٹے کی مدت میں [illegible] سیر دودھ دیا جاتا ہے۔ اور جو بچے کھانا کھاتے ہیں ان کو دودھ، کھچڑی، چاول، چپاتی اور [illegible] دیئے جاتے ہیں۔ [illegible] ان بچوں کو معمولی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس طرح کریچ Creche [illegible] رہتے ہیں۔ کریچ کی عمارت ملز کے دواخانہ سے ملحق ہے۔ عمارت کوئی خاص اصول [illegible] نظر نہیں بنائی گئی ہے۔ ایک بڑے کمرے میں چھوٹے بچوں کے لئے جھولے پڑے ہوئے ہیں۔

## صحت عامہ و دواخانہ:-

دواخانہ کی عمارت ملز ہی کے احاطے میں ہے۔ صحت عامہ کے تحت حسب ذیل عملہ ہے:-

ایک میڈیکل آفیسر، ایک لیڈی ڈاکٹر، دو کمپونڈر (ایک برائے شب اور دوسرا برائے دن) دو وارڈ بائز، دو مددگار [illegible]، سات دایائیں، ایک سینیٹری انسپکٹر، ایک مقدم، ستائیس جھاڑو دینے والیاں۔

میڈیکل آفیسر سے متعلق مزدوروں کو شکایت ہے کہ ان کی تنخواہ ڈھائی سو روپیہ ہے اور یہ ملز میں صرف چار گھنٹے کام کرتے ہیں اور اس کے بعد مکان جا کر خانگی پراکٹس کرتے ہیں۔ خانگی پراکٹس کی وجہ سے یہ مزدوروں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ مزدوروں نے یہ بھی شکایت کی کہ جب ان کو ڈھائی سو روپیہ تنخواہ دیجاتی ہے تو پھر ان کو روزانہ مکان سے ملز لانے اور پھر ملز سے مکان لے جانے کے لئے ملز کا تانگہ کیوں جاتا ہے۔ یہ خود اپنے خانگی سواری کا انتظام کرلیں۔ درحقیقت یہ شکایات واجبی ہیں کیونکہ جب معقول تنخواہ مل رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ صرف چار گھنٹے کام کریں اور ان کو خانگی پراکٹس کی بھی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

لیڈی ڈاکٹر کی تنخواہ دوسو روپیہ ماہانہ ہے۔ ان سے بھی مزدور مطمئن نہیں ہیں۔ ایک مزدور نے اپنا واقعہ یوں بیان کیا کہ اس نے اپنی بیوی کو جو حاملہ تھی اور زچگی کے دن قریب تھے، ان کے یہاں بغرض علاج ماقبل زچگی رجوع کیا تو انھوں نے اس سے کہا کہ ایک ماہ تک زچگی کے کوئی آثار نہیں اور اسی رات میں زچگی ہوگئی۔ مزدوروں نے ایک شکایت یہ بیان کی کہ ان کی عورتیں یکایک شدید بیمار ہوجائیں اور وہ ان میڈیکل آفیسروں کے گھر جاکر انھیں مریض کو آکر دیکھنے کہیں تو یہ بالکل توجہ نہیں دیتے اور ٹال دیتے ہیں۔

دایاؤں کے متعلق بھی عام شکایت یہ ہے کہ یہ کریچ کے بچوں کے لئے جو دودھ آتا ہے اس پر کی بالائی اور بسکٹ خود ہڑپ کرجاتی ہیں۔

دواخانے میں ان پیشنٹ In-patient کا کوئی انتظام نہیں صرف Out patient اوٹ پیشنٹ کا انتظام ہے۔ روزانہ تقریباً ساٹھ مریض مل کے دواخانے سے دوا حاصل کرتے ہیں۔

## اسکول - School :

مل کا ایک ذاتی پرائمری اسکول ہے جو مل کی بنائی ہوئی پکی چال کے کمروں میں قائم ہے۔ اس میں (۸۹) لڑکے زیر تعلیم ہیں۔ مل میں تعلیم بالغان کا بھی انتظام ہے اور ان کے لئے جماعتیں رات میں ہوا کرتی ہیں۔ اور اس میں اٹھارہ مزدور تعلیم پارہے ہیں۔ اس کی طرف مزدوروں کا زیادہ رجحان نہیں ہے۔

۱۵

## اسپورٹس : Sports

مل میں اسپورٹس کا بھی انتظام ہے لیکن اس میں مل کے نوعمر مزدور صرف محدود تعداد میں حصہ لیتے ہیں۔ مل کے مزدوروں کے بچوں کے لئے کوئی بازیچہ و باغیچہ نہیں ہے جہاں وہ شام میں کھیل سکیں۔ ایک جگہ صرف چند جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ مل کی جانب سے مزدوروں کی بستی کے درمیان میں ایک وسیع چمن کا ہونا نہایت ضروری ہے جہاں نہ صرف مزدوروں کے بچے بلکہ خود مزدور شام کے وقت ہواخوری کے لئے جاسکیں۔ بستی کو صرف مٹی کی ایک پختہ سڑک آتی ہے۔ بستی میں مل کی جانب سے روشنی کے کھمبے نصب ہیں۔ مل کی بستی کے لئے پچاس ہزار گیالن کی ایک ٹاکی فراہم کی گئی ہے جو نلوں کو فلٹرڈ Filtered پانی مہیا کرتی ہے۔ مل کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوا کہ گذشتہ سال مل کی بستی میں (۷۴) پیدائشیں ہوئیں اور (۳۸) اموات واقع ہوئیں۔ گذشتہ سال بستی میں (۹۷) ملغ چیچک ٹیکے دیئے گئے۔ مل کے مزدور عورتوں کو زچگی کے لئے تین ماہ کی چھٹی دی جاتی ہے لیکن دو ماہ کی تنخواہ بطور انعام دی جاتی ہے اس طرح سے سال گذشتہ اس انعام کی مد میں تقریباً دو ہزار روپیہ خرچ ہوئے۔ مل کی بستی میں روزانہ صبح و شام دو وقت جھاڑو دیا جاتی ہے۔ نالیوں اور موریوں کو فینیل Phynyle سے صاف کیا جاتا ہے۔ موش کشی کا انتظام ہے۔ اس کے لئے بستی کے مکانات میں جگہ جگہ دانہ دئے جاتے ہیں

ملز کی جانب سے مکانات کی مرمت اور آہک پاشی کرائی جاتی ہے۔

## مزدور سبھا :

اس وقت عثمان شاہی ملز کے مزدوروں کی دو یونین ہیں۔ ایک یونین ریڈ فلاگ Red Flag کے تحت کام کر رہی ہے یہ اشتراکی جھنڈا یا لال بوٹا کہلاتا ہے۔ اس میں کمیونسٹ ورکرز ہیں۔ اس یونین کے صدر مسٹر ڈی۔ وی دیشپانڈے ہیں اور آرگنائزر مسٹر پھلاری ہیں۔ اس یونین کے زیادہ مزدور رکن ہیں اور یہ کافی اثر رکھتی ہے۔

دوسری یونین ( Yellow or state Flag ) کے تحت کام کر رہی ہے۔ اس یونین کا یہہ مقصد ہے کہ مزدور اپنے مطالبات منوائیں مگر کارگر طریقوں سے اور کبھی حکومت کے خلاف آواز بلند نہ کریں اور نہ ہی کوئی غیر قانونی حرکت کریں۔ حال ہی میں جب لال بوٹے کے لوگوں نے غیر آئینی حرکتیں شروع کیں تو یہ یونین قائم ہوئی ہے۔ اس کے اراکین کی تعداد کم ہے

لال بوٹے کے آرگنائزر سے پیلے بوٹے کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ پیلا بوٹا ملز کے اعلیٰ عہدیداروں کے زیر سرپرستی پروان چڑھ رہا ہے۔ اور اس کے ورکروں کو ملز کی جانب سے باضابطہ روزانہ بھتہ دیا جاتا ہے اور یہ لوگ غنڈہ پن کر کے لال بوٹے والوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور مزدوروں کو ہڑتال کے ایام میں ڈرا دھمکا کر کام پر آنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس طریقے سے لال بوٹے والوں کا خیال ہے کہ پیلا بوٹا مزدوروں کی فلاح و بہبود میں روڑے اٹکا رہا ہے۔

پیلے بوٹے والوں سے دریافت کرنے پر ان لوگوں نے لال بوٹے والوں کے متعلق کہا کہ یہ لوگ جائز و ناجائز مطالبات کرتے جاتے ہیں اور جاہل مزدوروں کو بھڑکا کر ہڑتال کرواتے ہیں اور حکومت کے خلاف غیر آئینی طور پر آواز بلند کرتے ہیں۔ اس طرح سے نہ صرف ہڑتالیں ناکام ہوتی ہیں بلکہ ان لوگوں کی نادانی کی وجہ سے مزدوروں کو بعض مرتبہ سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور ہم اس کی فلاح چاہتے ہیں اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہر بات پر ہڑتال کر دیں اور اس طرح نہ صرف مزدوروں کو تکلیف دیں بلکہ حکومت سے بھی دشمنی مول لیں۔

## گذشتہ ہڑتال کے اسباب اور مطالبات :-

مرکزی اسٹرائیک کمیٹی سے گذشتہ ہڑتال کے اسباب دریافت کرنے پر اس نے یہ بتایا کہ عثمان شاہی ملز کے مزدور ایک سال سے تنخواہ میں اضافے، رضا (رخصت) کی سہولتیں، معقول مہنگائی بھتہ اور کم اوقات کار اور چھٹائی (برطرفی) بند کی جانے کے لئے درخواستیں دیں لیکن اس پر کوئی غور نہ کیا گیا۔ تب انھوں نے یکم اگسٹ ۱۹۴۶ء سے ہڑتال کرنے کی نوٹس دے دی۔ لیکن حکومت نے پنچایتی بورڈ بٹھا دیا۔

پنچایتی بورڈ کے متعلق کمیٹی نے کہا کہ اس میں مزدوروں کو اس کا موقع ہی نہیں ملتا کہ مالکوں کی پیش کی ہوئی دلیلیں معلوم کرکے ان کے بتلائے ہوئے حسابات پر اپنی رائے ظاہر کرسکیں کہ اس میں کہاں جھوٹ ہے اور کہاں دھوکہ۔ اس طرح ان پنچایتی بورڈوں کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس پر مزدوروں نے پھر ہڑتال کی دھمکی دی تو حکومت نے کہا کہ وہ عنقریب فیصلہ کرنے والی ہے اور فیصلہ کیا، جو مزدوروں کے غیاب میں ان سے بغیر مشورے کے کیا گیا اور جو یک طرفہ تھا۔

مرکزی اسٹرائیک کمیٹی نے یہ بھی بتلایا کہ مل کو مندرجہ سالوں میں کتنا منافع ہوا اور ان سالوں میں مینیجنگ ایجنٹ کا کیا کمیشن رہا اور اس سال مزدوروں کی جملہ اجرت پر کتنی رقم صرف کی گئی۔

| سال | مزدوروں کی سالانہ اجرت | مینیجنگ ایجنٹ کا کمیشن | سال بھر کا منافع |
|---|---|---|---|
| ۱۹۴۳ء | ۱۲،۱۴،۴۴۸ | ۶،۴۹،۳۲۸ | ۴۵،۹۰،۱۹۸ |
| ۱۹۴۴ء | ۱۳،۳۲،۳۵۴ | ۵،۶۳،۸۸۱ | ۳۹،۵۶،۵۹۸ |
| ۱۹۴۵ء | ۱۴،۰۰،۰۰۰ | ۴،۵۰،۰۰۰ | ۳۰،۰۰،۰۰۰ |

کمیٹی نے ایک اور اعتراض یہ کیا کہ نہ صرف مل کو اتنا منافع ہی ہوا ہے بلکہ مل نے مشینوں کی فرسودگی کے تحت ایک کثیر رقم مد محفوظ میں رکھی ہے۔

## مطالبات:-

(۱) تنخواہ میں کم از کم پچاس فیصد اضافہ کیا جائے اور کسی مزدور کو (۳۶) روپیہ سے کم ماہوار نہ ملے۔ (۲) سب مزدوروں کو (۲۵) روپیہ گرانی الونس دیا جائے اور جیسے جیسے گرانی بڑھتی جائے مہنگائی بھتے میں خود بخود اضافہ کیا جائے۔ (۳) جنگ کے زمانے میں جو لاکھوں کا منافع ہوا ہے اسمیں سے کم از کم تین مہینے کا بونس دیا جائے۔ (۴) رات کے شفٹ میں جو مزدور کام کرتے ہیں ان کی صحت پر جاگنے سے کافی برا اثر پڑتا ہے اس لئے انہیں پچیس فیصد الونس دیا جائے۔ (۵) سود کی کمی کو پورا کرنے کے لئے تراشن کھاتے میں تین شفٹ چلائے جائیں۔ (۶) سال میں ہر مزدور کو ایک مہینہ پوری تنخواہ کے ساتھ اور ایک ہفتہ آدھی تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی جائے چھٹی دس دن کی پوری تنخواہ کیساتھ اس مسلسل چھٹی کے علاوہ ہے جو نئے قانون کے مطابق مزدور کو آرام کرنے ملا کریگی۔ (۷) گرفتی کی سب چھٹیوں میں تنخواہ دیجائے۔ (۸) چھانٹی (برطرفی) جبری استعفا وغیرہ بند کردی جائیں۔

(۹) آٹھ گھنٹوں کا دن چوالیس گھنٹوں کا ہفتہ اور رات کی نشست سات گھنٹوں کی رکھی جائے۔

(۱۰) ہماری یونینوں کو مان لیا جائے۔

مرکزی اسٹرائیک کمیٹی نے یہ بھی بتایا کہ ان مطالبات کو پورا کرنے سے مِل کو سالانہ مزید تین لاکھ روپیہ کے اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے۔ کمیٹی نے یہ کہا کہ یہ رقم کمپنی کے گزشتہ سال منافع کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی جو کہ بیس لاکھ روپیہ تھا۔

اگر ان مطالبات کو نہ بھی مانا جائے بلکہ اس میں کے صرف دو مطالبات یا ان دو میں سے بھی کوئی ایک پورا کیا جائے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً تمام مزدور دوبارہ کام پر واپس آ جائیں گے اور دو مطالبات یہ ہیں۔ ایک تو تنخواہ میں پچاس فیصد اضافہ۔ دوسرے تمام مزدوروں کو یکساں پچیس روپیہ گرانی الونس۔

## تنقید و تبصرہ :-

اُجرتوں میں چاہئے کہ مِل کی جانب سے مزدور کی ماہانہ اُجرت مقرر کر دی جائے البتہ مزدوروں پر کام کے دوران میں سختی سے نگرانی رکھی جائے ورنہ ایسے مزدور جن کو کام کے حساب سے اُجرت ملتی ہے وہ ایک حد تک بد دل ہو جائیں گے۔ اس طرح تنخواہ مقرر کرنے سے مزدور کو اس بات کا اطمینان رہتا ہے کہ اگر وہ محنت سے کام کرے تو اُسے پوری تنخواہ ملے گی۔ جن ایام میں مِل کی تعطیل رہتی ہے اُن ایام کی اُجرت مزدوروں کو برابر دی جانی چاہئیے۔ مختلف حسابی غلطیاں جو اہلکاروں سے سرزد ہوتی ہیں اور جن سے مزدوروں کی اُجرتوں میں کمی ہوتی ہے اُس کا انسداد ضروری ہے۔

مِل کی بستی کی حالت بہت خراب ہے خصوصاً معمولی درجے کے مزدوروں کو جو رہنے کے لئے پکی چال میں کمرے دیئے گئے ہیں اُن کا کرایہ بجائے دو روپیہ ماہانہ کے ایک روپیہ ماہانہ وصول کیا جانا چاہیئے گزگا چال اور نذ گنہ چال مزدوروں کی صحت کے لئے بہت مضر ہیں۔ اِن کے بجائے کویلو کے معمولی کمرے بنا کر دے جانے چاہئیں۔ بستی میں پاخانے اور نل اِن کمروں کی قربت میں بنائے جانے چاہئیں لیکن صفائی کا انتظام بھی اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے۔ تمام مکانات اور کوارٹرس چاہے وہ کتنے چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں اُن میں پاخانہ اور باورچیخانہ ہونا ضروری ہے۔ مکانات خاص طرز کے بنائے جانے چاہئیں بستی کے درمیان میں ایک وسیع چمن اور بچوں کے لئے ایک بازیگاہ ازحد ضروری ہے۔ ریڈیو جو کینٹین میں لگا ہوا ہے اُسے اس چمن میں رکھا جانا چاہئیے۔ بستی میں اوسط فاصلے پر سایہ دار درختوں کی تنصیب ازحد ضروری ہے۔

مِل میں جہاں مزدور کام کرتے ہیں آئینہ کو تراش کر کھڑکیاں بنائی گئی ہیں لیکن یہ بند رہتی ہیں اور ان بڑے ہالوں کی جہاں مشنری نصب ہے گنجائش کے لحاظ کافی نہیں ہیں۔ اس کے لئے چاہئے کہ اندر برقی پنکھے لگائے جائیں۔ مزدورنیوں کو اس کی ترغیب دلائی جائے کہ وہ اپنے بچوں کو اوقاتِ کار میں کریچ میں لاکر

چھوڑیں۔ مزدوروں کے لئے دواخانے میں اِن پیشینٹ In-patient کا انتظام کیا جائے۔

اس طرح سے اگر مزدوروں کی واجبی شکایات دور کی جائیں اور صحت بخش فضا میں انھیں سانس لینے کا موقع دیا جا کر ان کی دلجوئی کی جائے اور تائید حاصل کی جائے تو ملز کے منافع میں اضافہ ہو سکتا ہے اور وہ مزید ترقی کے ذریعہ اچھا کپڑا اپنے ملک کو فراہم کر سکتی ہے۔

# فرزندِ جامعہ سے

تیری حیات سراپا ہے جستجوئے راز — تری ہی فکر نے بخشی ہے علم کو پرواز

حصول وجہد و ترقی تری سرشت میں ہیں — تری رگوں میں جوانی، ترا عمل اعجاز

ترے کمال کی تخلیق ہیں یہ ایجادات — بلند تیرے ارادے ہیں تو ہی وقت نواز



افق پہ علم کے تو بن کے آفتاب چمک — ترے وجود پہ خاکِ وطن کو بھی ہو ناز

تخیلات کو مرکوزِ علم و حکمت کر — حقیقتوں میں بدل دے تو رمزہائے مجاز

ہے دور تیری توجہ کا منتظر کب سے — سکون و امن کی خاطر اٹھا لے اپنا ساز

سنا ترانۂ رنگیں عروسِ فطرت کو

ہو خامشی بھی تکلم جو تو ہو نغمہ نواز

قاضی منظور محی الدین

بی۔ اے (ابتدائی)

# حیاتین

غذا کا سوال اجتماعی حیثیت سے ہر قوم کے لئے اور انفرادی حیثیت سے قوم کے ہر فرد کے لئے یکساں طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ کسی انسان کی جسمانی اور ساتھ ساتھ دماغی حالت کی تعمیر و تخریب میں اس کی غذا کا نہایت اہم اور نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ جس طرح غذا زندگی کو اور صحت کو برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ ہے اسی طرح انسانی جسم کو مختلف امراض میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ سر ولیم آسلر (Sir William Osler) ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں :-

"چند اتفاقی حادثات وغیرہ کو چھوڑ کر تقریباً ۹۰ فیصدی اموات غیر طبعی ہوتی ہیں۔ اور یہ اموات زیادہ تر نامناسب اور بے ترتیب غذاؤں کے استعمال سے وقوع پذیر ہوتی ہیں"

۱۲۱

مکمل و متوازن غذا کے لئے لازمی اجزاء پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، چربی، معدنی نمک اور حیاتین ہیں۔ ایک مشہور یوروپین ڈاکٹر لکھتا ہے کہ عمر کی کمی بیشی کا انحصار غذا پر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غذاؤں میں بہت سے حیات آفریں اجزاء ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی کمی سے مختلف امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو "امراض قلت" کہتے ہیں۔ ان حیات آفریں اجزاء کو "حیاتین" (Vitamin) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

حیاتین پیچیدہ نامیاتی اشیاء ہیں۔ غذا میں ان کا تھوڑی سی مقدار میں پایا جانا نہ صرف صحت بلکہ زندگی کے لئے بھی لازمی ہیں۔ حیاتین کے متعلق معلومات صرف بیسویں صدی میں حاصل ہوئی ہیں۔ ابتدا میں جن سائنسدانوں نے ان کی تحقیقات کیں وہ ابھی تک زندہ ہیں۔ حال حال تک صرف غذا کی مقدار اور اس کے ذائقہ پر توجہ کی جاتی تھی۔ لیکن اس کے صحت بخش اجزاء کو نظر انداز کیا جاتا تھا

اب تک بیماری کی مختلف وجوہات بتلائی جاتی تھیں لیکن کسی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ غذا کی خرابی بھی امراض کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اس امر کا انکشاف کہ بہت سی بیماریاں غذا میں کسی خاص جز جیسے "حیاتین" کی کمی بیشی سے ہوتی ہیں۔ طب میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۷۵ فیصد امراض صرف صحت بخش غذا کی جانب سے غفلت یا لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلے ڈاکٹر فنک ( Dr. Fink ) نے بتلایا کہ اگر جانوروں کو ایسی غذا پر رکھیں جس میں سے صرف حیاتین کا جز نکال دیا گیا ہو تو جانور بیمار ہوکر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد دو بڑے سائنسدان ہٹرمین اور میک کلم نے حیاتین سے متعلق مختلف تجربے کئے۔ جن سے عیاں ہوا کہ خاص قسم کے حیاتین کی غیر موجودگی سے خاص قسم کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ماہرین کیمیا نے حیاتین کی کیمیائی ترکیب بھی معلوم کرلی ہے۔ اور یہ بذریعہ تالیف تیار کئے جا چکے ہیں۔ بعض حیاتین چربی میں حل پذیر ہیں اور بعض پانی میں حیاتین مختلف غذاؤں میں قلیل مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ حروف تہجی الف، ب، ج، د وغیرہ سے موسوم کئے جاتے ہیں۔
حیاتین الف اور د چربی میں اور ب اور ج پانی میں حل پذیر ہیں۔ حیاتین کے متعلق ابھی تحقیقات جاری ہیں اور آئے دن نئے نئے حیاتین دریافت ہو رہے ہیں۔

## حیاتینِ الف

حیاتین "الف ..... ( Vitamin "A" ) ۱۸۸۰ء میں سوئزرلینڈ کے ایک محقق لونین ( Lunin ) نے اس کے متعلق تحقیقات شروع کی۔ انگلستان امریکہ، سویڈن کے محققوں نے بھی اس میں کافی محنت کی لیکن آخر کار ۱۹۳۱ء میں سوئزرلینڈ ہی کے ایک سائنسدان کیرر ( Karrer ) کے ہاتھوں اس کی تحقیقات پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ دیکھا گیا ہے کہ سبزیوں میں کلوروفل ( Chlorophyll ) کے ساتھ ایک قسم کا زرد مادہ کیروٹین ( Carotene ) بھی موجود ہوتا ہے۔
تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خود جانور حیاتین "الف" کو تیار کرتے ہیں بلکہ یہ پودوں سے حاصل کرکے اپنے جگر میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ جہاں سے ان کے دودھ اور انڈوں میں ان کی کچھ مقدار پائی جاتی ہے۔ تاکہ ان کے بچے اس سے محروم نہ رہ سکیں۔ یہ حیاتین جانوروں کی نشو نما اور بالیدگی کے لئے ضروری ہیں۔ حیاتین الف زیادہ مقدار میں کاڈ ( Cod ) اور ہیلی بٹ ( Halibat ) مچھلیوں کے جگر کے تیل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ کاڈ مچھلی کے جگر سے جو تیل حاصل ہوتا ہے اس میں حیاتین الف کی کثیر مقدار موجود ہوتی ہے اس کی کیمیائی ترکیب کے لحاظ سے ایزروفتال ( Axerophtol $C_{20}H_{30}O$ ) بھی کہتے ہیں۔
حیاتین الف حرارت سے بہت جلد تباہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً دودھ کو جوش دینے یا ہوا میں کھلا رکھنے سے اس کی تکسید ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ کیروٹین حیاتین الف میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ تین قسم کی ہوتی ہے۔ ۱۔ الفا کیروٹین ۲۔ بیٹا کیروٹین ۳۔ گاما کیروٹین۔ بیٹا کیروٹین سے حیاتین الف کے دو سالمات حاصل ہوتے ہیں۔ اور ۰۶ء خرد گرام ( خرد گرام ایک گرام کا دس لاکھواں حصہ ہوتا ہے ) میاری خالص بیٹا کیروٹین ایک بین الاقوامی اکائی تسلیم کی گئی ہے۔ حیاتین الف کا اندازہ بھی اسی اکائی میں کیا جاتا ہے۔ انسان کے لئے حیاتین الف کی روزانہ ضرورت ....۳ تا .... ۴ بین الاقوامی

اکائیاں ہیں (مثلاً مچھلیوں کے جگر سے حاصل کئے ہوئے تیل میں حیاتین کی ایک گرام مقدار ۳۰۰۰۰۰ بین الاقوامی اکائیوں کے برابر ہوتی ہے)

مندرجہ ذیل اشیاء کے ۱۰۰ گرام یا (۳½) اونس مقدار میں حیاتین 'الف' کی مندرجہ ذیل مقدار پائی جاتی ہے :-

| | | |
|---|---|---|
| Cod liver Oil | ۲۰۰۰۰۰ | اکائیاں |
| روغن جگر گاؤ | ۱۶۰۰۰ | " |
| پالک | ۱۳۰۰۰ | " |
| انڈے کی زردی | ۳۰۰۰ | " |
| مسکہ | ۲۹۰۰ | " |
| دودھ | ۲۳۰۰ | " |

حیاتین الف کی کمی کا آنکھوں پر خطرناک اثر ہوتا ہے۔ آنکھیں زرد پڑ جاتی ہیں۔ آنسوں کی پیدائش بند ہو جاتی ہے۔ آنکھیں سوجھ جاتی ہیں۔ بالآخر بینائی غایب ہو جاتی ہے۔ اس مرض کو اصطلاح میں "زیرا فتلمیا" ( Xerapthalamia ) کہتے ہیں۔ ہارورڈ میڈیکل اسکول میں مشہور سائینسدان منٹ ( Minot ) اور مرفی ( Murphy ) اور ننگاگوں میں کوسلر ( Kossler ) نے متعدد تجربوں کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ حیاتین الف کی کمی کی وجہ سے ہاضمہ خراب اور دق جیسی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

بالیدگی اور نشو ونما کے لئے حیاتین الف کی موجودگی ضروری ہے اس کا اظہار ان تجربوں سے ہوتا ہے جو مختلف جانوروں پر کئے گئے۔ چوہوں کے بچوں کو ایسی غذا پر رکھا گیا جس میں حیاتین الف کا جز شامل نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وزن میں کمی ہو کر بالیدگی کے بجائے انحطاط شروع ہوا۔ ایسی غذا سے بڑے چوہے بھی کسی نہ کسی مرض کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے۔

حال ہی میں ایک اور مرض دریافت ہوا ہے جس کو "شب کوری" ( Night Blindness ) کہتے ہیں۔ مشہور سائنس داں ایڈورڈ میلنبی ( Edward Mellanby ) نے تجربات کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ حیاتین الف کی کمی سے مرکزی اعصاب کمزور ہو کر دماغی کمزوری واقع ہوتی ہے۔

**حیاتین 'ب'** حیاتین 'ب' ( Vitamin 'B' ) حیاتین 'ب' کو دافع التہاب عصب حیاتین ( Vitamin-Neuritic-Vitamin a.min. ) بھی کہتے ہیں ۱۸۸۰ء میں ایک جاپانی جنگی جہاز پر مرض بیری بیری ( Beri-Beri ) کے سخت حملہ کے بعد اس حیاتین کے متعلق تحقیقات

کام کی ابتدا ہوئی۔ ایک ولندیزی ڈاکٹر ایگمن ( Eigkman ) کے علاوہ میکیلم ( Mc Callum )
اور ڈیوس ( Davis ) نے بھی تحقیقات کیں ان سائنسدانوں نے چاول کے بیرونی خول میں ایک ایسی
چیز کا پتہ لگایا جو بیری بیری کے لئے تریاق ہے۔ اسی کو حیاتین 'ب' کا نام دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر گولڈ برگر ( Gold Borger ) نے اس حیاتین کو پھر دو ذیلی گروہوں میں تقسیم کیا جنمیں
سے ایک حیاتین "ب۱" اور دوسرا حیاتین "ب۲" ہے۔ دونوں حیاتین ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ اور تقریباً
یکساں ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ حیاتین ب۱ الکحل میں حل پذیر ہے اور ب۲ ناحل پذیر ہے۔ حیاتین ب۲
کی کمی کی وجہ سے رگ پٹھے اور قلب وغیرہ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور عضلات میں درد محسوس ہونے لگتا ہے۔
اور عموماً فالج واقع ہوتا ہے۔ لہسن، ایسٹ ( Yeast ) اور عموماً انڈے کی زردی، ٹماٹر، آلو، گاجر
مولی، رسدار پھلیوں، سبزیوں اور ترکاریوں اور چاول کے بیرونی خول میں اس کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے
مندرجہ بالا چیزوں میں حیاتین ب۲ کی بھی کچھ مقدار موجود ہوتی ہے۔ لیکن لہسن۔ انڈے کی سفیدی اس کے
اچھے ذخائر ہیں جسم میں اس کی کمی سے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ اور خونی دست بھی آتے ہیں۔ یہ دونوں
حیاتین حیوان کی بالیدگی میں بھی مدد دیتے ہیں۔

۱۲۴

**حیاتین ج** حیاتین 'ج' Vitamin 'C' کہا جاتا ہے کہ جب واسکوڈےگاما
اور اس کے ساتھیوں کا جہاز کیپ آف گڈ ہوپ ( Cape of Goodhope ) پر تھا
اس وقت ایک مرض "اسقربوط" (داءالحفر) پھوٹ پڑا اور (۱۶۰) آدمیوں میں سے صرف (۶۰) ہی بچ سکے
اس واقعہ کے بعد سر رچرڈ ہاکنس ( Sir Richerd Hawkins ) نے دریافت کیا کہ لیموں اور
نارنگیوں کا استعمال اس میں بہت مفید ہوتا ہے۔ ہنگری کے ایک باشندے زنیٹ گیورگی Szent Gyorgy
نے کیمبرج میں ایک ایسے مادہ کا انکشاف کیا جو مختلف پودوں میں موجود ہوتا ہے۔ اور جو پودوں کے خلیوں میں
ہیموگلوبن کی صورت میں بھی پایا جاتا ہے۔ بڑی محنت کے بعد اس نے اس مادہ کو قلموں کی شکل میں حاصل کیا
بالکل اسی زمانے میں فرانک فرٹ کے دو جرمن کیمیادان ٹلمان اور ہرش ( Tillmans & Hirsch )
نے اپنے تجربات کے دوران میں دیکھا کہ اکثر تازہ پھلوں کا رس ایک خاص قسم کے رنگ کو کاٹ دیتا ہے۔ اس کے
بعد معلوم ہوا کہ یہ رنگ کاٹنے والا مادہ اور زنیٹ گیورگی والی قلمیں دونوں ایک ہی چیز ہیں اور انہی کو ہم
حیاتین 'ج' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس کی کمی کی وجہ سے مرض "اسکربوط" پیدا ہوتا ہے۔ مصر میں ڈاکٹر تھیوبالڈ سمتھ
( Theohald Smith ) نے بعض جانوروں کو حیاتین 'ج' نکالی ہوئی غذا پر رکھ کر مرض اسکربوط پیدا

گیا تھا۔ ڈاکٹر ساجو ( Dr. Sajous ) نے ثابت کیا ہے کہ حیاتین ج کی کمی مرض مذکورہ بالا کو پیدا کرتی ہے اس لئے اس نے اس کو " ضد اسکربوطا "ج" کہا۔ اس مرض کی وجہ سے اعضا پھول جاتے ہیں اور دموی شعریات کے خون کے رسنے کی وجہ سے سارے جسم پر سرخ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اور سارا دانت کمزور ہو کر گرنے لگتے ہیں۔

حیاتین 'ج' کی کافی مقدار لیموں اور سنتروں میں ہوتی ہے۔ حرارت پہنچانے سے یہ حیاتین مر جاتا ہے

**حیاتین د :** حیاتین 'د' ............ Vitamin 'D' حیاتین 'د' کو ۱۹۲۶ء میں لندن میں روزہیم ( Rosenheim ) اور ویبسٹر ( Webster ) نے دریافت کیا۔ کہ حیاتین 'د' میں تبدیل ہونے والا مادہ ایک قسم کا موم ہے۔ جسے ارگواسٹرال ( Ergosterol ) کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر میک کلم ( Mc Callum ) اور اس کے رفقائے کار نے بتایا کہ کاڈ مچھلی کے جگر کے تیل میں نہ صرف حیاتین الف پائے جاتے ہیں بلکہ ایک اور قسم کا حیاتین بھی اس کے اندر موجود ہوتا ہے جو جسم میں کیلسیم یا چونے کے تحول کے لئے ضروری ہے۔ اس جز کا نام حیاتین 'د' رکھا گیا ہے ،

حیاتین 'د' ان ہی اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ جنہیں حیاتین الف ہوتا ہے کاڈ اور ہیلی بٹ مچھلیوں کے تیل، انڈے کی زردی، حیوانی چربی اور دودھ وغیرہ میں بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے کہ حیاتین د میں تبدیل ہونے والا مادہ ایک قسم کا موم ہے جسے ارگسٹرال ( Ergosterol ) کہا جاتا ہے حیوانی بافتوں میں موجود ہوتا ہے۔ حیاتین 'د' اور ارگسٹرال دونوں اسٹرالز ( Esterols ) کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان اسٹرالز میں چند ایسے ہارمونس ہوتے ہیں۔ جو زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں جب جسم میں اس کی مقدار کم ہونے لگے اور اگر بیرونی ذرائع سے اس کی کافی مقدار جسم میں داخل نہ کی جائے تو مختلف امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہڈیاں ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ بچوں اور گوبھی میں بھی یہ موجود ہوتا ہے۔ جسم پر سورج کی شعاعوں کے اثر سے بافتوں میں کا ارگسٹرال حیاتین 'د' میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ گرما میں یہ عمل زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں ہیلڈ شنکی ( Hald Schinchy ) نے بیان کیا کہ انھوں نے بالائے بنفشی شعاعوں کے غسل سے چار بچوں کو ایک عام مرض کساح یا رکٹس ( Rickets ) سے بچالیا۔ کچھ عرصہ بعد کولمبیا یونیورسٹی کے ماہر میک کلم نے معلوم کرلیا کہ بچوں کو مرض رکٹس سے بچانے کے لئے ان کی غذا میں چونے ( Ca ) اور فاسفورس ( P ) کے علاوہ حیاتین کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

غذا میں اگر حیاتین 'د' مناسب مقدار میں نہ ہو تو دانتوں کی نشو و نما نہیں ہوتی۔ پروفیسر میلبی نے بتایا ہے کہ اگر حیاتین "د" موجود نہ ہو تو جبڑے کی ہڈی نرم ہو جاتی ہے۔ اور دانتوں کی چمک زائل

ہو جاتی ہے۔ اور کھو کھلے ہو کر کیڑا لگ جاتا ہے۔

## حیاتین 'پ'

حیاتین 'پ' ........ Vitamin 'P' اس حیاتین کو ہنگری کے ایک محقق نے حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ یہ حیاتین علٰحدہ علٰحدہ طور پر نہیں ملتے بلکہ کالی مرچ اور چونے کے پانی میں حیاتین 'ج' کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ مرض استقربوط میں دموی شعریات سے خون کے جو رسنے لگ جاتے ہیں اسے محض حیاتین 'ج' اچھا نہیں کر سکتا تاوقتیکہ حیاتین 'پ' بھی اس کے ساتھ موجود نہ ہو۔

## حیاتین 'ی'

حیاتین 'ی' ........ Vitamin 'E' یہ حیاتین شحمیات میں حل پذیر ہیں۔ ڈاکٹر ہربٹ اور ریوداس نے اس کے متعلق تحقیقات کیں۔ لیکن اس کی دریافت کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ہوئی۔ اسی یونیورسٹی کے ایک سائنس ایوانس (Evans) اور اس کے رفقاء کار نے تجربہ کر کے بتایا کہ حیاتین 'ی' کا اثر زیادہ تر جنین کی نشو نما میں ہوتا ہے اس کے علاوہ عضلات کے بڑھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ حیاتین 'ی'، گیہوں کے جنین تجارتی تیلوں مثلاً زیتون کا تیل۔ بیجوں اور سبزیوں میں زیادہ تر مرتکز حالت میں پایا جاتا ہے۔ دودھ کی چربی میں بھی اس کی مقدار ہوتی ہے۔ لیکن Cod liver oil میں بالکل نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ حیاتین بھی صحت انسانی کی بقاء کے لئے نہایت ضروری ہے۔

## حیاتین کولین

حیاتین 'کولین' ........ 'Vitamin Choline' یہ حیاتین بھی جدید تحقیقات کا نتیجہ ہیں۔ اسے ٹارنٹو یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر سی ایچ بسٹ C. H. Best نے دریافت کیا ہے۔ یہ پہلا حیاتین ہے جسے حروف ابجد کے بجائے ایک مستقل نام کولین (Choline) دیا گیا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی تحقیقات میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ حیاتین جگر کے افعال کو درست رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس کی کمی کی وجہ سے جگر متورم ہو جاتا ہے اور شکر سے گلائیکو جن بننے کا عمل سست ہو جاتا ہے۔ یوں تو اکثر چیزوں میں ان کی کچھ نہ کچھ مقدار ہوتی ہے۔ لیکن انڈے کی زردی، گوشت اور لہسن ان کے ماخذ ہیں۔

یہ ہیں غذا کے اہم اجزاء جن کا استعمال صحت کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن اگر ہم ہماری روزمرہ کی غذا پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں مندرجہ بالا اجزا کی مقدار ین ضرورت سے بہت کم ہوتی ہیں۔ چنانچہ نہ تو یہ مناسب غذا کے معیار پر اترتی ہے اور نہ ہمارے حیاتی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔ یہ بھی ایک حد تک درست ہے کہ بعض اچھی غذائیں اصلی حالت میں ہم تک نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ اناج وغیرہ کی

صفائی کے نئے طریقوں کی وجہ سے اس کی موجودہ غذائیت بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ پھر بھی سبزیاں ترکاریاں اور دوسرے نباتات اس کی تلافی کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا طریقہ استعمال اس قدر ناقص ہے کہ ہم ان میں سے کوئی مفید چیز حاصل نہیں کر سکتے۔

آج کل گیہوں کا آٹا تیار کرنے کا طریقہ جتنا سستا اور آسان ہے اس سے کہیں زیادہ فضول بھی ہے۔ کیونکہ گرنی میں چکی کے پاٹوں کی تیز حرکت سے اتنی حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس حرارت سے گیہوں کا نشاستہ وغیرہ بآسانی تلف ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح چاول کو گھنٹہ بھر ابال کر اس کے تمام مفید مادے جس میں کاربوہائیڈریٹ نشاستہ وغیرہ موجود ہوتے ہیں پھینک دیا جاتا ہے۔ اور اس کا فضلہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہی حال گوشت اور ترکاریوں کا بھی ہے جنھیں بھون بھون کر بالکل بیکار کر دیا جاتا ہے کیونکہ سبزیوں اور ترکاریوں کے اندر کے حیاتی مادے اور گوشت کے پروٹینی اجزا زیادتی تپش کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں۔

ایک سائنسدان میکارسن ( Macarrison S on ) نے حسب ذیل اجزا سے مناسب غذا کا تعین کیا ہے :-

" ادھ سیر سے ایک سیر تک دودھ جو تازہ ہو۔ بغیر پکایا ہوا ہو۔ موسمی میوہ بغیر پکائی ہوئی تازہ سبزیاں اور ترکاریاں۔ ۸ اونس روٹی (جس کا آٹا گھر میں پیا گیا ہو تو بہتر ہے) دو اونس تخم (گھی۔ تیل۔ بالائی۔ ۱۲۷ یا مسکے کی صورت میں) ۴ اونس پروٹینی غذا جس میں دہی۔ بالائی۔ انڈے۔ مچھلی مرغ اور گوشت شامل ہیں۔

مذکورہ بالا اجزا کو دن میں دو یا تین مرتبہ جیسے سہولت ہو استعمال کیا جاتا۔ اس میں وہ تمام حیاتی اجزا شامل ہیں جو صحت کے لئے ضروری ہیں ان تفصیلات کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ حیات انسانی کی بقاء کے لئے حیاتین کی کس قدر اہمیت ہے۔ اس کشمکش کے زمانے میں ہم کو چاہیئے کہ ایسی غذا استعمال کریں جو صحت بخش ہونے کے علاوہ آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہوں گیہوں۔ چاول۔ باجرہ اور راگی کے استعمال سے ہم حیاتین "ب" اور "ج" حاصل کر سکتے ہیں۔ جوار اور باجرہ غذائیت کے اعتبار سے اسی قدر اچھے ہیں جس قدر گیہوں اور چاول۔ اس لئے اگر یہ اشیا دستیاب نہ ہوں تو ہم جوار یا باجرہ استعمال کر کے صحت اور توانائی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ حیاتین الف۔ ب۔ ج۔ د انڈے۔ مچھلی یا گوشت کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں اور اگر یہ میسر نہ آسکیں تو دودھ اس کا اچھا بدل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سبزیوں اور ترکاریوں کے بھی ہم حیاتین کی کافی مقدار حاصل کر سکتے ہیں۔

الغرض حیاتین انسانی زندگی کی بقاء اور صحت و تندرستی کے ضامن ہیں۔ اور تندرستی ہی انسان کی زندگی کا جوہر ہے اسی لئے یہ مشہور رہے کہ "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ فقط

محمد شمس الدین متعلم بی۔ ایس۔ سی (ابتدائی)

# غزل

مختصر عیش، درد بے پایاں — کتنی دلچسپ ہے یہ عمرِ رواں

دل کو کیا ہو گیا نہیں معلوم — کیفِ غم ہے نہ جوششِ ارماں

تجھ سے کس کو وفا کی ہے اُمید — دوست توہینِ غم ہے یہ ارماں

اب ہوں تیری جفا سے بھی محروم — دردِ دل میں وہ آب و تاب کہاں

دل کے دم سے تھی زندگی کی بہار — آج دنیا ہے کس قدر ویراں!

ترا ممنون ہوں تباہیِ عشق — دل پہ ہر غم گزر گیا آساں

ہمہ تن اضطراب ہے ہستی — ہمہ تن انقلاب ہے یہ جہاں

زندگی دعوتِ الم کے سوا — اور کچھ بھی نہیں دلِ ناداں

احسان
ام۔ اے (عثمانیہ)



مولوی محمد عبدالحمید خاں صاحب

سابق ریڈر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ

آپ طلبہ میں اپنے اعلیٰ کردار و اخلاق کی وجہ سے ہردلعزیز رہ چکے ہیں

قدیم فارسی ادب کے بہترین استاد اور ظرافت نگار شاعر ہیں آپ نے فارسی ادب کے متعدد

گراں قدر علمی تحقیقات بھی کی ہیں ۔



**محمد معین الدین صدیقی ام اے (آخری)**

[illegible]



**سید عارف اللہ حسینی متعلم ـ ل ـ ال ـ ام (ابتدائی)**

[illegible]

# بہار و خزاں

جو ہوا چھو کے نکل جائے تجھے بادِ بہار — اور جو چھو نہ سکے تجھ کو وہی بادِ خزاں
تجھے امواجِ تبسم سے ہے شادابِ حیات — تیرے انوارِ تبسم سے ہے پرنور جہاں
تو اگر پاس ہو میرے تو خزاں بھی ہے بہار — اور اگر پاس نہ ہو تو تو بہاراں بھی خزاں
آبھی جا، تاکہ دمک اٹھیں مناظر سارے — ایک تیرے ہی نہ ہونے سے ہے غمگین سماں



# یاد

یوں تو عرصہ ہوا رخصت ہوئے تجھکو لیکن — بھولنے ہی میں نہیں آتے ہیں تیرے انداز
گھومتی ہیں ابھی آنکھوں میں نشیلی آنکھیں — گونجتی ہے ابھی کانوں میں رسیلی آواز

# جدائی

تو ہو تو ریگ زار بھی ہے گلشن ارم — تیرے بغیر خلد بھی ویراں مقام ہے
جانِ بہار! عمرِ گریزاں کا واسطہ — گلشن ہے جوئے آب ہے ماہ تمام ہے

محمد معین الدین صدیقی جاوید
متعلم ام اے (آخر)

# نوجوان جامعہ سے

سوچتا ہوں تری غیرت کو گوارا کیوں ہے

یہ خرد سوز جنوں خیز جفا کار نظام — جس میں اخلاص و مروت نہ محبت کا مقام
روح ناپاک ہے خونخوار ہے انسان کا ضمیر — اپنی سفاکی پہ ہے مست جہاں ہر خود کام

سوچتا ہوں تری غیرت کو گوارا کیوں ہے

خود فریبی کا تجھے درس دیا جاتا ہے — روح بیدار کو کرتے ہیں اسیر اوہام
تشنگی شوق کی ہر آن بڑھی جاتی ہے — مے کے بدلے ہے مگر پیر مغاں کی دشنام

اتنی تذلیل حمیت کو گوارا کیوں ہے

تیری فطرت نہیں شائستہ اکرام ابھی — ہے بجا دیں جو تجھے ارباب جفا یہ الزام
قلب احساس کی دھڑکن میں نہیں کوئی خروش — تا بکے یوں ہی پئے جائے گا زہراب کا جام

یہ شقاوت تری فطرت کو گوارا کیوں ہے

سرد ہوتا ہے کہیں یوں بھی جوانی کا لہو — زور بازو کی نمائش نہ ہے کچھ زور کلام
یہ تری پستی ہمت کا تقاضا تو نہیں — عرصۂ زیست پہ چھایا ہوا اک جبر مدام

جبر اتنا بھی شجاعت کو گوارا کیوں ہے

علم و عرفاں سے بغاوت ہے غلامی کی حیات — علم و عرفاں ہیں اے دوست ضعیفوں پہ حرام
علم و عرفاں کی تمنا ہے تو کر سر کو بلند — سر بلندی ہے فقط جذبۂ بے باک کا نام

ننگ اور عار شرافت کو گوارا کیوں ہے

وقت کا ساز کوئی گیت سناتا ہے تجھے — ہے عجب درد میں ڈوبی یہ ترانے الہام
شوق مجبور جو آمادۂ اقدام ہو آج — تیرے ہاتھ آئے ابھی اشہب دوراں کی زمام

یہ ستم روح مشیت کو گوارا کیوں ہے

متین سروش
بی اے (عثمانیہ)



پروفیسر قاضی محمد حسین ام ۔ اے ۔ ال ال ۔ بی (کینٹب) مرحوم
سابق نائب معین امیر جامعہ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

# قاضی صاحب

گذشتہ گرمیوں میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسیز کی کونسل کے اجلاس میں شرکت کی خاطر میں بنگلور گیا ہوا تھا کہ وہاں کے ایک مقامی پروفیسر صاحب نے ریڈیو کی نشر کردہ یہ خبر سنائی کہ قاضی محمد حسین صاحب سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ لیکن مجھے اس خبر کی صحت پر شبہ ہوا اور اس کی دو تین وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ اگرچہ کئی سال سے قاضی صاحب کی صحت کچھ اچھی نہیں تھی اور ان کے تمام ڈاکٹر اور دوست احباب انہیں آرام لینے کا مشورہ دیا کرتے تھے لیکن ان کی صحت اتنی خراب بھی نہیں تھی کہ جس کی بنا پر ان کے اس قدر جلد انتقال کا اندیشہ ہو سکے۔ دوسری وجہ قاضی صاحب کے انتقال کی خبر پر یقین نہ کرنے کی یہ تھی کہ لاہور میں ان کا انتقال ہونا بیان کیا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی جائے ولادت پنجاب میں واقع تھی لیکن پچیس تیس سال قبل جب وہ ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد آئے تو اسی شہر کو اپنا وطن بنا لیا اور شاید ابتدائی زمانہ میں ایک دو مرتبہ کسی کام پر پنجاب گئے ہوں تو ہوں لیکن ایک عرصہ دراز سے پھر ادھر کا رخ نہیں کیا۔ وہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو صرف ملازمت کی خاطر یہاں آتے ہیں لیکن جن کی نظریں ہمیشہ اپنے مولد کی طرف لگی رہتی ہیں اور میعاد ملازمت یا معاہدہ ختم ہونے کے بعد فوراً اپنے مقام کو لوٹ جاتے ہیں۔ قاضی صاحب کو اپنے اس وطن مالوف سے بڑی محبت تھی اور انھوں نے یہیں اپنے لئے ایک مستقل مکان بھی تعمیر کروالیا تھا تاکہ جب کبھی وظیفہ پر سبکدوش ہوں تو یہیں اپنی بقیہ عمر گذار دیں۔ اس بنا پر لاہور میں ان کے انتقال کی خبر اور بھی مشتبہ معلوم ہوتی تھی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ خاک گور نے واقعی انہیں لاہور کھینچا تھا اور اپنے بھائی صاحب کے اصرار پر ان سے ملنے کی خاطر وہ لاہور گئے تھے اور ایک مختصر سی علالت کے بعد وہ اسی سرزمین کے سپرد ہو گئے۔

ان سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے ایک سال قبل ان دنوں میں ہوئی تھی جبکہ میں حکومت ہند کے سائنٹفک ڈیلیگیشن کے ساتھ یورپ اور امریکہ جا رہا تھا۔ اس زمانہ میں قاضی صاحب اسٹیٹ سکالرشپ کمیٹی کے معتمد تھے اور انھوں نے مجھ سے کوئی تین گھنٹے اس بارے میں گفتگو فرمائی کہ

جن طلباء کو حکومت کی جانب سے وظائف اور ڈیپوٹیشن دئے گئے ہیں ان کے لئے یورپ اور امریکہ کی جامعات میں داخلہ کی کوشش کی جائے۔ اس کے بعد قیام انگلستان کے زمانے میں ان سے دو تین مرتبہ خط وکتابت بھی ہوئی لیکن افسوس ہے کہ پھر ان کا دیدار نصیب نہ ہو سکا۔ میری واپسی کے بعد ہی چند کمیٹیوں کے سلسلے میں مجھے دہلی، بمبئی، علی گڈھ اور بنگلور جانا پڑا اور موخر الذکر مقام پر ان کے انتقال کی خبر ملی۔ خدا انہیں مغفرت عطا فرمائے۔

۱۹۲۰ء میں جب ہم دارالعلوم میں تعلیم پاتے تھے تو قاضی صاحب کا نام اکثر سنا کرتے تھے کہ ریاضی کے بڑے ماہر کیمبرج کے رینگلر اور جامعۂ عثمانیہ کے پروفیسر ہیں۔ یوں تو بچپن سے ہمارے سر میں بھی یہ سودا تھا کہ کیمبرج جائیں لیکن چونکہ اس خواب کی تعبیر بظاہر ناممکن نظر آتی تھی اس لئے اشتیاق ہوا کہ کم از کم قاضی صاحب ہی سے ریاضی پڑھیں اور اعلیٰ ریاضی کے شوق کی تکمیل کریں۔

میٹرک میں کامیاب ہوئے تو بحث یہ آپڑی کہ انٹرمیڈیٹ میں مضامین اختیاری عربی، فارسی لئے جائیں یا سائنس اور ریاضی۔ ہماری اپنی حد تک تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ کون سے مضمون لینے چاہئیں لیکن استاد محترم مولوی غلام نبی صاحب کا اصرار تھا کہ عربی ضرور لی جائے۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ سرکاری طور پر تو کالج میں سائنس ریاضی پڑھیں اور خانگی طور پر مولوی صاحب موصوف سے عربی کی تعلیم جاری رکھی جائے۔ ماہ جون ۱۹۲۱ء میں سال تعلیمی کے پہلے دن ہم لوگ بہت شوق کے ساتھ کالج پہنچے کہ اب قاضی صاحب کو دیکھیں گے اور ان سے ریاضی پڑھیں گے۔ اس زمانے میں کالج آغا منزل میں واقع تھا جہاں اب حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے کاروبار ہوتے ہیں ہم اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ کالج کی عمارت میں داخل ہوئے تو سامنے چمن میں ایک پست قد سیاہ فام صاحب بہادر کو گلگشت میں محو پایا۔ ان میں کوئی ایسی وجاہت نہیں تھی جو جاذب نظر ہو سکے اس لئے ہم لوگوں نے بھی کوئی اعتنا نہیں کیا اور چونکہ قاضی صاحب کا گھنٹہ تھا اس لئے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ سیدھے کلاس میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ وہی چمن والے صاحب ہاتھ میں کاغذات لئے چلے آرہے ہیں۔ منہ سے بے اختیار نکلا کہ ارے یہی قاضی صاحب ہیں ساتھ ہی عربی کی وہ مشہور مثل یاد آئی "تَسْمَعُ بِالْمُعَیْدِیِّ خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَرَاہُ" یعنے معیدی کے متعلق سننا اس کو دیکھنے سے بہتر ہے۔ لیکن جب قاضی صاحب نے پڑھانا شروع کیا تو ان کی تفہیم ایسی دل نشین اور موثر تھی کہ تمام طلباء دوسری سب باتوں کو بھول کر ریاضی میں محو ہو گئے۔

قاضی صاحب کی تعلیم سے ہم لوگ کوئی پانچ سال یعنی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک متمتع ہوتے رہے۔

ان کی پابندی اور حاضر باشی کا یہ عالم تھا کہ اس پوری مدت میں مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے کبھی رخصت لی ہو یا کبھی دن دیرسے آئے ہوں۔ شعبہ ریاضی میں اس وقت قاضی صاحب کے علاوہ بابو امرت لال سیل تھے جو دارالعلوم کالج سے یونیورسٹی میں منتقل ہوئے تھے چوں کہ سیل صاحب اکثر بیمار رہتے تھے اس لئے ان کا کام بھی قاضی صاحب ہی کیا کرتے تھے۔ اس طرح انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں ہماری جماعت کو ریاضی کے تمام مضامین کی تعلیم اکیلے قاضی صاحب ہی نے دی۔ وہ لکچروں کے لئے ضخیم نوٹس ساتھ لایا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھر پر اچھی خاصی تیاری کرچکے تھے۔ نائب معین امیر بننے کے بعد ان کو گھر پر تیاری کا موقع بہت کم ملتا تھا اور اس لئے آخر زمانہ میں وہ انہی قدیم نوٹس سے کام چلاتے رہے۔ بہرحال ہماری طالب علمی کے زمانہ میں تو قاضی صاحب کافی تیار ہوکر آتے تھے اور اسی کے ساتھ وہ طلباء سے بھی توقع رکھتے تھے کہ سب تیار ہوکر آئیں۔ چنانچہ وہ ہر روز لکچر کے اختتام پر طلباء کو بتادیا کرتے تھے کہ آئندہ کیا پڑھایا جائے گا تاکہ طلباء ان مسائل کو پڑھیں اور سوالات مکان سے حل کرکے لائیں۔ اسی ضمن میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے قاضی صاحب کی توجہ میری طرف خاص طور پر مبذول ہوگئی کالج میں ہمارے داخل ہونے کے چند دن بعد قاضی صاحب جیومیٹری کا ایک مسئلہ جماعت میں حل کررہے تھے اتفاقاً ان کا حل بہت پیچیدہ اور طویل تھا جس پر چند طالب علموں نے عذر کیا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس پر قاضی صاحب نے جواب دیا کہ وہ حل واقعی کسی قدر مشکل اور طویل ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ کوئی دوسرا حل معلوم نہیں۔ میں بھی جماعت میں بیٹھا ہوا حسب عادت مسئلہ کو اپنے طریقہ پر علٰحدہ حل کررہا تھا۔ میں نے اٹھ کر کہا کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ بھی ہے اس پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ بورڈ پر اپنا حل طلباء کے سامنے پیش کروں۔ یہ حل مختصر اور آسان تھا جس کو انھوں نے بہت پسند کیا اور مجھ سے خواہش کی کہ کالج ختم ہونے کے بعد ان سے مکان پر ملوں۔ اس زمانہ میں وہ سیف آباد کے فوجی دواخانہ کے متصل ایک مکان میں رہتے تھے اور اقامت خانہ مسرت منزل میں مقیم تھا جس میں آج کل حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی کا دفتر واقع ہے۔ پانچ بجے جب میں ان کے مکان پر پہنچا ہوں تو چار پانچ گھنٹے ان سے کوئی دو گھنٹے گفتگو رہی۔ انھوں نے میری ابتدائی تعلیم کے متعلق دریافت کیا اور اپنے پاس سے اعلیٰ ریاضی کی کتابیں دیں کہ ان کا مطالعہ کروں۔ اس کے علاوہ ان سے وقتاً بہ وقت ملتے رہنے کی تاکید بھی کی۔ اس کے چند دن بعد ہی نوبت یہاں تک پہنچی کہ تقریباً ہر دوسرے دن کالج ختم کرکے میں ان کے پاس چلا جاتا تھا اور چاء پی کر ہم دونوں نمبارہ روڈ کی طرف سیر کو نکل جاتے تھے اور مغرب کی نماز پڑھ کر ان کے مکان کو واپس ہوتے تھے۔ اکثر شام کا کھانا بھی میں وہیں کھالیا کرتا تھا۔

ان کی لیڈی صاحبہ بھی اس زمانہ میں لندن سے آچکی تھیں اور کھانے پر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ قاضی صاحب دیکھنے میں اگرچہ دبلے پتلے تھے لیکن ان کی خوراک ماشاءاللہ کافی تھی۔ انگریزی کھانوں کا پورا کورس ختم کرنے کے بعد وہ مغلائی کھانے بھی اچھی مقدار میں کھایا کرتے تھے۔ نیز باتیں بھی وہ اس قدر کیا کرتے تھے کہ شاید ہی کسی وقت ہم نے کھانا دو گھنٹوں کے اندر ختم کیا ہو۔ ان کی گفتگو نہ صرف ریاضی کے متعلق بلکہ شعر و شاعری کے متعلق بھی ہوتی تھی۔ اقبال کے اشعار ان کو بھی اکثر یاد تھے اور وہ بڑے شوق سے سنایا کرتے تھے۔ خود انہوں نے بھی کچھ شعر کہے تھے لیکن افسوس ہے کہ اب مجھے ان کا کوئی شعر یاد نہیں رہا۔ عمر خیام کی مثال وہ اکثر دیا کرتے تھے کہ ریاضی اور شاعری دونوں کے لئے بلند تخیل کی ضرورت ہے اور ریاضی بھی ایک قسم کی شاعری ہی ہے۔ اس کے بیس سال بعد ۱۹۴۷ء میں جب انہوں نے میرے اصرار پر گرمیوں کی تعطیلات میں کوڑی کنال کا سفر کیا تو وہاں ایک مہینے تک تقریباً ہر روز ہم دونوں ایک دوسرے کو اقبال کے شعر سنایا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں تو شاذ و نادر ہی انہیں دفتری کام کے علاوہ اور کسی چیز کے لئے وقت ملتا تھا۔

جن لوگوں نے آخری زمانے میں ان کو خشک زندگی گذارتے دیکھا ہے وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اپنی طالب علمی کے دور میں اور خود پروفیسری کے ابتدائی زمانہ میں وہ کس قدر خوش مزاج، خلیق اور مروت والے انسان تھے۔



۱۹۲۶ء میں جب ان کی لیڈی صاحبہ کے خاندان والوں سے لندن میں میری ملاقات ہوئی تو وہ بیان کرتے تھے کہ طالب علمی میں لکھنے پڑھنے کے شوق کے علاوہ قاضی صاحب سپورٹس اور ڈانس وغیرہ کا کس قدر اچھا ذوق رکھتے تھے۔ خود ہم نے کالج کے ابتدائی دور میں دیکھا ہے کہ مولوی عبدالواسع صاحب اور دوسرے حضرات اساتذہ کے ساتھ قاضی صاحب کی اکثر نوک جھونک ہوا کرتی تھی اور دوران وقفہ میں یہ حضرات مل کر خوش گپی کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب ٹینس کے بھی اچھے کھلاڑی تھے اور جب ہم کالج کی ٹیم میں تھے تو وہ کبھی کبھی ہمارے ساتھ ٹینس کھیلنے چلے آتے تھے۔

بہر حال جب تک ان پر انتظامی کام کا بار نہیں پڑا تھا وہ جامعہ کے ایک بہترین پروفیسر تھے اور بی اے کی حد تک ان کی تعلیم نہایت موثر اور دلچسپ ہوتی تھی چنانچہ ان کے اکثر شاگردوں نے بیرونی جامعات اور اداروں میں کافی نام پیدا کیا ہے۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک میں تحصیل علم کے سلسلے میں یورپ میں مقیم رہا۔ اس زمانہ میں قاضی صاحب سے بھی گاہے ماہے خط و کتابت رہی جس میں وہ جامعہ کے حالات وغیرہ کا تذکرہ

کیا کرتے تھے اور یورپ کے حالات دریافت کرتے تھے۔ انھیں خود یورپ کا سفر کئے ہوئے تقریباً بیس برس ہو چکے تھے اس لئے انہیں دوبارہ لندن جانے کی بہت خواہش تھی۔ ۱۹۳۱ء میں برٹش امپائر کی جامعات کی کانفرنس میں وہ ہماری جامعہ سے سرکاری طور پر بھیجے گئے۔ اسی زمانہ میں یورپ سے واپس ہوا اور میری پہلی ملازمت قاضی صاحب کی جگہ پر منظور ہوئی تھی۔ کوئی دو مہینوں کے بعد وہ بھی واپس ہو گئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت میں کسی قدر تغیر ہو گیا ہے اور وہ پہلی سی خوش مزاجی کم ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ وہ اس اثناء میں کالج کے وائس پرنسپل بن گئے تھے اور پروفیسری کے ساتھ انتظامی کام بھی انہیں کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ اس زمانہ میں مولوی عبدالرحمن خاں صاحب پرنسپل تھے اور تمام اہم کاروبار موصوف ہی انجام دیتے تھے لیکن حسابات وغیرہ کی نگرانی کا کچھ کام قاضی صاحب کے ذمہ تھا اور اپنی عادت کے مطابق وہ اس کام پر ضرورت سے زیادہ توجہ دے رہے تھے جس کا اثر ان کی صحت اور طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کے لئے قاضی صاحب کو اور مجھے ریاضی کی ایک کتاب مشترکہ طور پر تالیف کرنی پڑی اس ضمن میں کئی مہینے ان کے مکان پر ملاقات ہوتی رہی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے کی سی بات نہیں تھی بلکہ انہیں اب کچھ زیادہ تکلف ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنی ذمہ داریوں کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں اور انہیں اندیشہ تھا کہ اگر وہ ذرا سا وقت بھی ہنسی مذاق میں صرف کریں تو اس سے ان کے کام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں جامعہ سے بے حد محبت تھی اور جب جامعہ اڈیکمیٹ میں منتقل ہوئی اور سکنڈری صاحب کے مختصر دورے کے بعد نائب معین امیر کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تو پھر ان کے پاس سوائے جامعہ کے دنیا کی کسی چیز کے لئے یہاں تک کہ خود اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے بھی کوئی وقت نہیں تھا اور وہ دن رات جامعہ کی فلاح و بہبود کی خاطر غور و فکر کیا کرتے تھے۔ اس کام میں ایک حد تک غلو کی نوبت پہنچ گئی تھی اور اسی نے ان کی صحت کو تباہ کیا اور بالآخر وہ اسی کا شکار ہوئے۔

کوئی دس سال تک قاضی صاحب جامعہ کے انتظامی صدر رہے اور اس کی ترقی اور توسیع میں اپنی حد تک انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اب یہ آئندہ مورخین کا کام ہے کہ اس کا اندازہ لگائیں کہ قاضی صاحب کی ان انتھک مساعی سے جامعہ کو کہاں تک فائدہ ہوا۔ ان کے طریقہ عمل کے متعلق ممکن ہے کسی کو اختلاف ہو سکے لیکن ان کے خلوص اور جذبہ عمل کے متعلق شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہمیشہ وہ جامعہ ہی کے کاروبار کے متعلق سوچتے رہتے تھے اور کچھ تو اپنی فطرت کے تقاضہ سے اور کچھ جامعہ کے دستور سے مجبور ہو کر جو انتہائی مرکزیت کا حامل تھا، ان کی کوشش تھی کہ ہر چھوٹے بڑے کام کو بذات خود

انجام دیں۔ اسی لئے ان کے دن اور رات کا بیشتر حصہ مسلہ دیکھنے اور تجویزیں لکھنے میں گذرتا تھا ملک میں اعلیٰ تعلیم کی توسیع و اشاعت سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور اس کی خاطر ان کو اربابِ مقتدر سے بہت کچھ بحث و مباحثہ کرنا پڑتا تھا۔ جب کبھی اوقات کی عدم موجودگی کے باعث وہ کوئی انتظام سرکاری طور پر نہیں کر سکتے تھے تو پھر ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو بغیر معاوضہ کے اس کام کے کرنے پر آمادہ کریں چنانچہ زمانہ کالج میں ایم۔ اے ریاضی کی جماعت اسی طرح قائم ہوئی اور معاشیات کے ام۔ اے کے متعلق بھی انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ پروفیسر صاحب معاشیات کو تدریس کے لئے راضی کروں۔

جامعہ کی چار دیواری سے باہر عوام میں علم کی توسیع و اشاعت کی خاطر انہوں نے بیرونی تقاریر کا انتظام کیا۔ یہ تقریریں توسیعی تقاریر کے علاوہ ہوتی تھیں اور ہر سال جامعہ کے مختلف اساتذہ صاحبان اپنے مضمون کے متعلق عام فہم زبان میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بڑا دلچسپ ثابت ہوا لوگ ان میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے اور قاضی صاحب خود بھی باوجود انتہائی مصروفیت کے بالالتزام حاضر رہتے تھے خود جامعہ کے اندر بھی انھوں نے کوشش کی کہ نصابی تدریس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے تحقیقاتی لکچر ہوا کریں چنانچہ کئی سال تک جامعہ میں اضافیت اور کوانٹم نظریہ پر لکچر ہوتے رہے جن میں ام۔ اے کے طلباء کے علاوہ مختلف شعبوں اور کالجوں کے اساتذہ صاحبان بھی شریک ہوتے تھے۔ قاضی صاحب نے بعد میں جامعہ کی طرف سے ان لکچروں کی طباعت اور اشاعت کا انتظام بھی کروایا۔

مرحوم کی خواہش تھی کہ جامعہ کے ہر استاد کو تحقیقاتی کام کرتا ہوا دیکھیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں بعض اوقات وہ مضحکہ خیز حد تک تجاوز کر جاتے تھے اور انھیں اس کا خیال نہیں رہتا تھا کہ ہر شخص ریسرچ نہیں کر سکتا۔

متعدد مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ انھوں نے رات کے نو دس بجے مجھے بلایا اور دیر تک جامعہ کے مختلف مسائل اور خصوصاً ریسرچ کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ ان کی گفتگو اکثر یک طرفہ ہوا کرتی تھی اور گھنٹوں وہ یہ بتایا کرتے تھے کہ ریسرچ کی اہمیت کیا ہے اور ریسرچ کس طرح کی جانی چاہیئے۔

جامعہ اور اس کے اداروں کی مختلف تقاریب میں بھی انھیں اکثر تقریر کرنا پڑتا تھا اور بعض بعض مرتبہ ان تقریروں کے دوران میں وہ بڑے فصیح و بلیغ فقرے استعمال کر جاتے تھے جو اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ شاید ان کا سب سے زیادہ مشہور جملہ وہ ہے جو انہوں نے جامعہ عثمانیہ کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "علم نامانوس زبانوں میں مقید تھا، آزاد ہو گیا۔ محدود تھا عام ہو گیا"

وہ کہا کرتے تھے کہ انھیں سیر و تفریح کا اور خصوصاً بذریعہ موٹر مختلف مقامات کو جانے کا بڑا شوق ہے لیکن اس کے لئے وقت نہیں ملتا۔ ۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں میں نے انہیں بہت مجبور کیا کہ وہ کوڈی کنال کا سفر کریں۔ چنانچہ وہ مدراس اور میسور کے مختلف مقامات پر سے ہوتے ہوئے بذریعہ موٹر کوڈی کنال پہنچے اور کوئی ایک مہینہ تک وہاں مقیم رہے۔ ہم نے ان کے اصرار سے ان کے لئے ایک علیحدہ مکان کا انتظام کیا تھا۔ تقریباً پورا دن وہ باہر پہاڑ کی سیر میں گذارتے تھے اور سہ پہر اور شام میں ہم دونوں کچھ شعر شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد حیدرآباد سے لاہور تک موٹر کار میں سفر کریں لیکن کسے خیال تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہی ان کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو جائے گا۔

کوڈی کنال کے قیام کے زمانے میں وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے بچے انہیں بہت یاد آتے ہیں اور لندن پر بمباری کے زمانہ میں بچوں کے وہاں رہنے سے انہیں بڑی پریشانی رہتی ہے۔ بچوں کو دیکھنے کی خواہش آخر دم تک پوری نہ ہوسکی اور شاید آخر میں ان کی خشک مزاجی اور کمی کا تعلق ان کی خانگی زندگی سے بھی تھا۔ چوں کہ ان کی فطرت اس کو گوارہ نہیں کرتی تھی کہ کسی اور کے سامنے اپنے دلی خیالات کا اظہار کر کے طبیعت کو ہلکا کریں اس لئے وہ اپنے افکارات کو اندر ہی اندر دبائے رکھتے تھے جس کا اثر ان کی صحت اور خصوصاً ان کے اعصاب پر پڑنا ناگزیر تھا۔



اس کے علاوہ آخری زمانے میں ان کی سرکاری زندگی بھی کچھ ایسی زیادہ خوشگوار نہیں رہی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس زمانے میں ان کو بڑے تلخ تجربے ہوئے جس کی وجہ سے ان کی ہر دلعزیزی اور شہرت بری طرح متاثر ہوئی لیکن پھر بھی حرفِ شکایت کبھی ان کی زبان سے نہیں نکلا اور ہر مصیبت کو انھوں نے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔

یہ جو کچھ بھی ہو بہر حال اہل حیدرآباد ان کی علمی خدمتوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے جو انہوں نے جامعہ کی تاسیس سے لے کر آخر وقت تک انجام دیں۔ علم ریاضی کی اصطلاحات وضع کرنے اور اعلیٰ ریاضی کی کتابوں کو ترجمہ و تالیف کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے اور ملک میں اس وقت جو معدودے چند ریاضی جاننے والے ہیں وہ ان کی زندہ یادگار ہیں۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
پروفیسر صدر شعبہ تحقیقات

# آہ محمد حسین!

## یاد آتی ہے ہمیں تیری وفا تیرے بعد

| | |
|---|---|
| رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو | ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو |
| بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے | کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو |
| پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار | اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو |

خاص الطاف جو اُستاد مرحوم کے مجھ پر تھے اور نیازمندی جو مجھے مرحوم کی ذات سے تھی تقاضا کر رہی تھی کہ کچھ سطریں ان کے متعلق لکھوں کہ مجلہ کے مدیر عزیزم مصلح الدین صدیقی صاحب کی فرمائش نے اس کو مزید تحریک دی اور دلی جذبات بے قابو ہو کر صفحۂ کاغذ پر آگئے۔

مرحوم کا وطن ملتان (پنجاب) تھا اور وہ وہاں کے قاضیوں کے خاندان سے تھے بیس سال کی عمر میں پنجاب سے ریاضی میں ایم اے کیا اور حکومت ہند کے وظیفہ سے انگلستان گئے وہاں پہلے لندن میں انجنیری میں شریک ہوئے پھر اس فن کو طبیعت کے موافق نہ پاکر ریاضی کے لئے کیمبرج چلے گئے اور ٹرائپس درجہ اول کیا اور رینگلر کہلائے۔ ہندوستان واپس آکر اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسری پر مامور ہوئے۔

مرحوم کا تعلق حیدرآباد سے ۱۹۱۷ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ دارالترجمہ قائم ہوا یہاں آپ ریاضی کی مترجمی پر مامور ہوئے پھر جب ۱۹۱۹ء میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاح ہوا تو آپ ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس وقت ریاضی کے صرف دو استاد تھے مرحوم اور بابو امرت لال سیل جو دارالعلوم کے انضمام سے جامعہ عثمانیہ میں منتقل ہوئے تھے ریاضی کی پہلی جماعت کوئی ۲۵ طلباء پر مشتمل ہوگی جامعہ کی سب سے پہلی جماعت میں کون کون لوگ تھے اس سے قارئین کو قدرتی طور پر دلچسپی ہوگی اس لئے ان میں سے جن کے نام حافظہ میں محفوظ ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| سید حسین (پرووسٹ سائنس) | (۲) کلیم الدین انصاری (ایڈوکیٹ) |

۵ مرحوم کی آخیر زندگی کا لقب۔

(۳) محمد بن عبداللہ (لیکچرار کلیہ طبدہ) | (۴) محمد احمد عثمانی (ریڈر کلیہ طبدہ)
(۵) شرف الدین (لیکچرار کیمیا) | (۶) مرتن جے راؤ (لیکچرار طبیعات)
(۷) ابو احمد نظیر الدین (لیکچرار بیطاری) | (۸) عزیز الرحمن (مہتمم [illegible])
(۹) ابوالفتح نصر اللہ (سررشتہ تعلیمات) | (۱۰) عبدالستار (سررشتہ تعلیمات)
(۱۱) محمد اسحاق (پیشوائے فرقہ وہابیہ) | (۱۲) میر غوث الدین علی (تاجر)
(۱۳) محمد نذیر الدین (مرحوم، رکن دارالترجمہ) | (۱۴) نعمت اللہ خاں (مرحوم، انجینئر)
(۱۵) ضیاء الدین انصاری (راقم السطور)

کلیہ کا افتتاح موجودہ حیدرآباد اسٹیٹ بنک کی عمارت میں ہوا تھا، ریاضی کی جماعت اسی میں ہوئی تھی۔ اس پہلی جماعت سے مرحوم کو ایک خاص لگاؤ آخر تک رہا اور ہم سب بھی آپ سے ایک والہانہ عقیدت رکھتے تھے ہم لوگوں کی اثر پذیر طبیعتوں پر استاد مرحوم کی صاف ستھری بے لاگ اور با اصول زندگی کا گہرا نقش بیٹھ گیا۔ اس زمانے کے ایک دو واقعے قابل ذکر ہیں۔

۱۲۹

ہم لوگ سال اول یا سال دوم میں ہوں گے بعض غیر معمولی تعطیلوں کی وجہ سے نصاب کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اور تعلیمی سال ختم ہو رہا تھا گرما کا موسم تھا استاد مرحوم نے ہم لوگوں سے کہا کہ کل اگرچہ چھٹی ہے لیکن میں خاص طور پر کلاس لینا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ گیارہ بجے آجائیے ہم لوگوں کا الھڑپن اور ذمہ داری کے احساس کی کمی اس روز ہم میں سے ایک بھی نہ گیا اس کے دوسرے روز ہم کو ایک دوسرے سے معلوم ہوا کہ کل کوئی بھی نہیں آیا تھا جو تنبیہ کی جاتی ہم اس کے مستحق تھے اور اس کیلئے تیار تھے گھنٹہ بجا استاد کلاس میں آئے ہم لوگ دم بخود تھے اور منتظر کہ کب خفا ہوتے ہیں مرحوم نے چاک ہاتھ میں لیا اور سیدھے بورڈ پر جاکر درس شروع کردیا اسی حالت میں کوئی آدھا گھنٹہ گذر گیا یکایک مرحوم بورڈ سے پلٹے اور ہم سے مخاطب ہوئے ہر شخص کے کچھ Moral obligations ہوتے ہیں میں کل دھوپ میں تین میل سے سیکل پر آیا تھا" یہ کہا اور پھر پلٹ کر لکھنے لگ گئے ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے بعد ہم لوگوں نے ایک پارٹی ترتیب دی تھی شام کا وقت تھا پہلے تصویر لی جارہی تھی ہمارے سب اساتذہ اور پرنسپل ڈاکٹر عبدالستار صدیقی شریک تھے۔ استاد مرحوم شاید کسی کام پر سے سیدھے ادھر آگئے تھے اس وجہ سے لباس تبدیل اور بال درست کئے ہوئے نہ تھے ڈاکٹر صدیقی نے مرحوم سے ان کی ہیئت پر کوئی فقرہ کہا مرحوم نے فوراً جواب دیا ؎

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

مرحوم کے مغربی طرزِ معاشرت اور خشک زندگی کے ساتھ ان کا ادبی ذوق اور مذاقِ سخن حیرت انگیز تھا۔ اس سلسلے میں وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ریفرے کے ہنگامے کے بعد طلبہ نے ہڑتال کی تھی اور جب آخر سمجھانے سے سمجھ گئے تو مرحوم نے اپنی تقریر میں طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی

بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

مرحوم کی طبیعت میں بذلہ سنجی بھی تھی۔ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک دفعہ اُن سے پوچھا "قاضی صاحب آپ اپنا روپیہ کس بنک میں رکھتے ہیں؟" آپ نے بے ساختہ کہا "پی۔ اینڈ او (P&O) میں"۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ آپ کی بیوی ایک انگریز خاتون ہیں اس لئے آپ کے اہل و عیال کی ہندوستان اور انگلستان کے درمیان آمد و رفت ہوتی رہتی تھی اور آپ کی ساری آمدنی اسی کی نذر ہو جاتی تھی۔

ہم لوگ جب ایم۔ اے میں تھے تو اکثر وقت بے وقت مرحوم کے مکان پر پہونچ جاتے۔ گویا کہ اُن کا وقت ہمارے لئے وقف تھا۔ مرحوم کبھی چین بہ جبین نہ ہوتے۔ کالج میں ان کے درسوں سے استفادہ اور مکان پر ان سے ہم کلامی اور اکثر اوقات ہم طعامی ایک جنت تھی جس میں ہماری تربیت ہوئی۔ اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ ایک دفعہ ہم سر شام ان کے مکان پر پہونچے۔ حسبِ معمول بن بلائے اور بغیر کسی قرار داد کے۔ مرحوم اپنے اہل و عیال کے ساتھ کہیں باہر جا رہے تھے۔ انھوں نے ہم سے معذرت چاہی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے اس بات کا بُرا مانا۔ حالانکہ ہم کو ہرگز اس کا حق نہ تھا۔ ہمارا طالب علم زندگی کے دھارے سے دور پرورش پاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں ایک طرح کی خود مرکزیت ( self centridness ) پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دوسروں کا نقطہ نظر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

۱۹۳۷ء میں ایم۔ اے کا پہلا امتحان ہوا۔ ہم تین طالب علم تھے۔ تینوں پاس ہو گئے۔ تینوں کو اسی وقت معقول ملازمتیں مل گئیں۔ ایک صاحب کو ریڈری ایک صاحب کو دارالترجمہ میں مترجمی اور مجھے ریاضی کی لکچراری۔ چونکہ میں امتحان میں اول آیا تھا اس لئے مجھے خیال گزرا کہ ریڈری کا مستحق میں ہوں۔ اور میں نے استادِ مرحوم سے اس کا ذکر بھی کیا۔ مرحوم نے مجھے اس مسئلے کے وہ سب پہلو بتائے جن تک میری نظر نہ گئی تھی اور مجھے مطمئن کر دیا کہ یہ کوئی طرفداری نہ تھی انھوں نے کہا کہ "میرا تو ارادہ تھا کہ تم لوگوں کو بلا کر کہوں کہ دیکھو تم تین ہو اور یہ تین جگہیں ہیں ان کو تم آپس میں بانٹ لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ بھی ان کو اسی طرح تقسیم کرتے"۔ واقعہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ بعض تصفیے بظاہر ناانصافی پر مبنی معلوم ہوں لیکن فی الحقیقت منصفانہ ہوں۔ ایسی صورت میں جس کی بظاہر حق تلفی کی جائے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی تشفی کر دی جائے۔ بلکہ کسی تصفیہ کے منصفانہ ہونے کی جانچ ہی یہ ہے کہ متاثر فریق

سمجھائی جا سکے یا کم از کم اس تصفیہ کے دلائل ان کی روشنی میں لائے جا سکیں۔
...ہم کا پرچے جانچنے کا طریقہ بھی قابل ذکر ہے۔ امتحان کے پرچے وہ خاصے سخت ترتیب دیتے تھے لیکن جانچنے میں سخت نہ تھے۔ ایک خصوصیت ان میں یہ تھی کہ بعض اوقات جب کہ اخیر جواب غلط ہوتا یا جواب ادھورا چھپا جواب کا کچھ حصہ مسودہ کی جانب ( Rough ) رہ گیا ہو اس صورت میں بھی نمبر دیتے تھے۔ ایک دفعہ پرچوں کی جانچ کے متعلق مرحوم سے گفتگو تھی آپ نے کہا "میں تو پرچے کا کونا کونا دیکھتا ہوں"۔

ہماری شاگردی کے ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد مرحوم کی خالص استادی کا دور ختم ہوا وہ جامعہ کے انتظام سے وابستہ ہو گئے۔ یہ خالص استادی کا دور ان کے شاگردوں کے اور خود ان کے لئے ایک سنہری دور اور ایک گلشن بے خار تھا جس کی یاد ہماری زندگی کی ایک قیمتی متاع ہے۔

مرحوم زندگی کے دوسرے دور میں پہلے وائس پرنسپل پھر پرووسٹ اور آخر میں نائب معین امیر جامعہ ہو گئے۔ جس خدمت پر آپ تقریباً دس سال فائز رہے۔ یہ پھولوں کی سیج نہ تھی بلکہ کانٹوں کی سیج تھی۔ کسی تعلیمی ادارے کا انتظام کسی زمانے میں بھی بچوں کا کھیل نہیں پھر جب کہ وہ ادارہ جامعہ عثمانیہ ہو اور جامعہ شہر سے پانچ میل دور ہو اور آمد و رفت کا انتظام ناکافی ہو اور وہ بھی جامعہ کے قابو کا نہ ہو اور زمانہ ایسا پر آشوب ہو تو یہ مشکلات ہزار گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ ان مشکلات کا مرحوم نے جس پامردی سے مقابلہ کیا وہ حق یہ ہے کہ مرحوم ہی کا حق تھا۔

بہرحال ان کی طبیعت کی شرافت، ان کے کیرکٹر کی مضبوطی اور جامعہ کے ساتھ ان کا شغف ایسی چیزیں تھیں کہ ان کا سخت سے سخت ناقد بھی ان پر انگلی نہیں رکھ سکتا۔

اپنی زندگی کے دوسرے دور میں بھی جب کہ وہ نظم و نسق میں الجھ گئے تھے اگرچہ کہ مرحوم نے درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رکھا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کی استادی پہلے دور کے ساتھ ہی ختم ہو گئی اور ان کے شاگرد حقیقت میں وہی ہیں جنھوں نے پہلے دور سے فیض حاصل کیا۔ اور واقعہ ہے کہ اس استاد کے بعد ان کی نظروں میں کوئی نہ جچا۔

میری عقیدت اور نیازمندی نے طالب علمی کے زمانے میں مجھ سے چند اشعار استاد مرحوم کی شان میں لکھوائے تھے جو ہدیہ ناظرین ہیں :-

| | |
|---|---|
| ہیں بہار و باغ و گل کے اب بھلا دیکھوں گا خواب | گلستان دین فطرت جب ہے سر تا سر خراب |
| اک زمانہ تھا کہ ہم تھے مالک ہر علم و فن | فلسفہ جغرافیہ تاریخ ہیئت اور حساب |
| علم میں وارث ہیں تھے ہند کے یونان کے | طفل یورپ جب کہ نادان بھی تھا اور تھا محو خواب |
| ہے ریاضی خاص کر اسلام کی احسان مند | کچھ ہوئے مسلم ریاضی داں نہیں جن کا جواب |

رفتہ رفتہ ہو گیا لیکن یہ اس کا ہم میں حال
رفت ہندسہ داں بگور و ہندسہ اندر حجاب

پھر مسلمان کچھ سنبھل کر راستے پر آ گئے
طعنہ اغیار سننے کی نہیں لائے جو تاب

ساز عشرت کی جگہ لینے لگا سامان علم
پھر دوات و خامہ آئے اور گئے چنگ و رباب

تھیں دبی سینوں میں ذوق علم کی چنگاریاں
جامعہ سے اب ہوا ان کو میسر التہاب

کام رکھنا تھا ہمارا کام ہم نے کر دیا
اب یہ اس کا کام ہے کر دے ہمیں وہ کامیاب

جامعہ عثمانیہ چشمہ ہے معنی من عطش
مثل دیگر جامعوں کے یہ نہیں ہرگز سراب

جامعہ میں ہے خصوصاً ذات تیری مغتنم
یوں تو ہیں استاد سارے اپنے فن میں لاجواب

آسمان جامعہ کے اے درخشاں آفتاب
ہو رہا ہے تیری کرنوں سے زمانہ فیض یاب

رشک اقلیدس و نیوٹن ہے مرا تجھ سے خطاب
گنج دانش کل علوم عقلیہ کا تو ہے باب

تو وہ ہندسہ داں کہ گر اس عہد میں ہوتے حیات
بطلیموس و فیثاغورس چومتے تیری رکاب

تیرے فن میں تیرا ثانی جانتے ہیں ہم نہیں
گرچہ کہنے کو کہیں اللہ اعلم بالصواب

ہم تھے جاہل تھا ہمارے واسطے تیرا وجود
پیاسی کھیتی کے لئے ہو جس طرح گنجان سحاب

حرکت سیال کا فن تو نے پانی کر دیا
اس کی ہیبت سے ہوا جاتا تھا زہرہ میرا آب

لاتناہی تھا ہمارے حال پہ تیرا کرم
مہربانی کی نہ تھی حد لطف کا کب تھا حساب

باہر آتے دوست تیرا سا نہ پاتے ہم کہیں
تھا جماعت میں اگرچہ مثل تیرا رعب داب

پاسداری جنبہ داری تجھ سے کوسوں دور ہے
ایسی باتوں سے تجھے رہتا ہے یکسر اجتناب

سختی ظاہر میں ہے باطن میں لیکن مستقیم
جمع ضدین ایسی ہم نے تو نہیں دیکھی جناب

روشنائی سے مری اک مطلع اب روشن ہوا
بروشنی سے جس کی شرماتا ہے روشن آفتاب

بن کے چمکا تو ریاضی کے افق پر آفتاب
مطلع — ہے ریاضی تجھ سے زندہ اے مسیحت مآب

علم میں کامل بنانا ہم کو تھا مقصد ترا
کب سماتا جامعہ کا تیری نظروں میں نصاب

جو کہے معنی بتاتا تھا اک تیری ہر تقریر میں
خامشی میں بھی سبق آموز تھا مثل کتاب

نعمت کب ہوئی نوبت کو جب آیا زوال
تیرے لائق کب کیا ہے ہم نے تجھ سے اکتساب

اولیں شاگرد تیرا ہوں یہ مجھ کو ناز ہے
ترک شاگردی سے دل ہے سینے کے اندر کباب

بس ضیائے مضطرب مقطع سے کر قطع سخن
آگے بڑھنے سے تجھے مانع ہے تیرا اضطراب

پروفیسر ضیاء الدین انصاری

# پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب مرحوم

## بہ حیثیت استادِ ریاضیات

پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب کی وفات سے تعلیمی دنیا میں ایک ماہر اور تجربہ کار استاد ریاضیات کی کمی واقع ہوئی ہے۔ مرحوم نے اپنی عمر کا بہترین حصہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ ریاضیات کے استاد اور صدر کی حیثیت سے گذارا اور اپنی موثر اور واضح تدریس کے ذریعہ اُن تمام طلباء پر جنھیں آپ کے درسوں سے مستفید ہونے کا موقع حاصل ہوا عمدہ اور دیرپا اثر ڈالا۔ آپ ایک پیدائشی استاد تھے اور ریاضی جیسے مجرد علم کو ایسی پاکیزہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ مشکل سے مشکل استدلال بھی ہر طالب علم سمجھ سکے۔ آپ کا خیال تھا کہ جامعی تعلیم میں بھی معقول توضیحات کا مناسب استعمال ضروری اور مفید ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جماعت ام۔ اے میں بھی تین ابعادی علم ہندسہ اور علم ہیئت کے مشکل مسئلوں کو واضح بنانے کے لئے لکڑی اور تار کے نمونے بکثرت استعمال کرتے تھے اور اس مخصوص طریقہ تدریس سے ایسے طلباء جن کا مجرد تخیل زیادہ پختہ نہ ہو ان مضامین کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے تھے۔

قاضی صاحب کا تدریسی ذوق کمرہ جماعت کے باہر بھی عملی علم ہیئت کے سلسلہ میں طلباء کی رہنمائی پر آپ کو مجبور کرتا تھا۔ وہ منظر نہایت خوش گوار ہوتا تھا جبکہ بعد غروب آفتاب کھلے میدانوں اور رصدگاہ نظامیہ میں آپ کئی گھنٹوں تک طلباء کے ساتھ فلکی مشاہدات میں مصروف ہوتے تھے۔ علم ہیئت سے قاضی صاحب کو جو گہری دلچسپی تھی اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ اس علم میں مسلم ہیئت دانوں نے نمایاں ترقی کی تھی۔ نیز آپ کو یہ یقین تھا کہ ہیئتی مشاہدات کے ذریعہ اجرام فلکی کی منظم حرکت، کائنات کی وسعت اور خالق کائنات کی عظمت کا قابل محو اثر طلباء پر ڈالا جاسکتا ہے اور طلباء کی روحانی تربیت میں علم ہیئت سے کافی مدد لی جاسکتی ہے۔ علم ہیئت سے قاضی صاحب کی غیر معمولی دلچسپی سے متاثر ہوکر آپ کے اکثر شاگردوں نے علم ہیئت کا خصوصی مطالعہ کیا۔ ان شاگردوں میں ایک ممتاز شاگرد یعنی ڈاکٹر اکبر علی صاحب۔ اس وقت رصدگاہ نظامیہ کے ناظم ہیں۔

علم ہیئت سے عوام میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے قاضی صاحب نے کئی ایک عام فہم لکچر بھی دیے

جن میں ہیئتی نقشوں، نمونوں اور فانوسی تصاویر کے ذریعہ غیر معمولی وضاحت پیدا کی گئی تھی۔ شعبۂ ریاضیات میں بھی علم ہیئت کو تمام طلباء کے لئے قابل فہم اور دلچسپ بنانے کے لئے آپ نے کمرہ عملی علم ہیئت کے لئے متعدد آلات اور نقشہ جات فراہم کئے تھے۔ ان آلات اور نمونوں کے ذریعہ اجرام فلکی کی حرکتیں اس قدر واضح ہو جاتی ہیں کہ ریاضی کے طلباء کے علاوہ دوسرے شعبوں کے طلباء بھی ان کا گہری دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اواخر ڈسمبر ۱۹۳۹ء میں جب انڈین میتھامیٹکل کانفرنس کا اجلاس جامعہ عثمانیہ میں منعقد ہوا تو مختلف جامعات کے نمائندوں نے شعبہ ریاضی کے آلات علم ہیئت کا مطالعہ نہایت دلچسپی کے ساتھ کیا اور اپنی اپنی جامعات میں ایسی نوعیت کے آلات مہیا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

چونکہ جامعہ عثمانیہ کا نصب العین یہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی تعلیم اردو کے ذریعہ دی جائے اس لئے معیاری درسی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کو اولیٰ اہمیت حاصل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی ریاضیات کی معیاری کتابوں کے اردو ترجمہ کے لئے وضع اصطلاحات و ترجمہ کی جو کمیٹیاں مقرر ہوئیں ان میں قاضی صاحب نے نمایاں حصہ لیا اور اس ضمن میں آپ نے جو کام انجام دیا وہ اس قدر اہم ہے کہ اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی زمانہ میں بہ حیثیت مترجم ریاضیات کے آپ نے ریاضیات کی کئی معیاری کتابوں کا ترجمہ کیا اور صدر شعبہ ریاضی ہونے کے بعد سررشتہ تالیف و ترجمہ کی ریاضیات کی کتابوں کی نظر ثانی اور فنی نقطۂ نظر سے ان پر تنقید آپ ہی کے ذمہ رہی اور آپ نے اپنی متعدد مصروفیتوں کے باوجود اس کام کو نہایت خوش اور فرض شناسی سے انجام دیا۔ دارالترجمہ کی طرف سے کتب ریاضی کے جو ترجمے شائع ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک میں قاضی صاحب کی اصلاح کا اثر نمایاں ہے۔

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ استاد علم کا جتنا شیدائی ہوگا اسی تناسب سے طلباء میں بھی علمی ذوق پیدا ہوگا۔ جب کبھی تعلیمی نظریوں پر قاضی صاحب اظہار رائے فرماتے تو ہمیشہ ذہنی تربیت کے لئے ریاضیات کی غیر معمولی اہمیت پر زور دیتے اور موجودہ نظام تعلیم میں ریاضیات کے مقام کو زیادہ مستحکم اور مفید بنانے کی خواہش ظاہر فرماتے مرحوم کے اس ریاضیاتی ذوق کی بدولت نہ صرف جامعہ کے امتحانات کے لئے ریاضیات کا عمدہ نصاب مرتب ہو سکا بلکہ طلباء میں ریاضیات سے اس قدر گہری دلچسپی پیدا ہوئی کہ ان میں سے اکثر آپ کی تقلید کرتے ہوئے ریاضیات کے کامیاب استاد بن سکے۔

قاضی صاحب کمرہ جماعت میں استاد اور طلباء کے مابین آزادانہ لیکن باادب بحث کو از حد مفید تصور فرماتے تھے۔ جب کبھی شعبہ ریاضیات جامعہ عثمانیہ میں کسی نوعمر استاد کا تقرر ہوتا تو اس مبتدی کو قاضی صاحب کی ہمیشہ یہ ہدایت ہوئی کہ کمرہ جماعت میں طلباء کو اپنی مشکلات اور شکوک کے متعلق بلا تکلف سوال کرنے کی اجازت

[illegible] اوائل ۱۹۳۶ء میں جب میرا تقرر ہوا تو قاضی صاحب نے مجھے بھی یہی ہدایت فرمائی۔ میں اپنے [illegible] تجربہ کی بنا پر یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس آزاد باہمی تبادلہ خیال سے کمرہ جماعت میں زندگی کی ایک نئی موج پیدا ہوتی ہے اور طلباء کے ذوق اور ذہنی کام میں قابل لحاظ اضافہ ہوتا ہے اور تمام طلباء جماعت کے کام میں اسی طرح حصہ لیتے ہیں جس طرح ایک اچھے مشین کے مختلف پرزے اس کی حرکت میں حصہ لیتے ہیں۔

مرحوم اچھی اور موثر تدریس کے اس قدر دلدادہ تھے کہ جب کبھی آپ کسی استاد کو اچھا اور موثر درس دیتے ہوئے دیکھتے تو اس قدر خوش ہوتے کہ اس استاد کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتے۔ یہ حوصلہ افزائی اچھے استاد کے لئے اپنی تدریس کو نہایت دلچسپ اور موثر بنانے کی مزید خواہش کا باعث ہوتی۔ اس زمانہ میں بھی جب قاضی صاحب نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ تھے آپ ممتاز مہمانوں کو اساتذہ کے درسوں میں لے جاتے تاکہ یہ بیرونی حضرات جامعہ عثمانیہ کے معیار اور طرز تعلیم کا اچھا اثر اپنے ساتھ لے جائیں۔

استاد کے علمی ذوق اور تدریسی صلاحیت کے علاوہ آپ استاد کے بلند پایہ اخلاق کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اساتذہ اور طلباء کے مابین خارج از نصاب معروفیات کے ذریعہ طلباء کے کردار کی عمدہ تشکیل میں مدد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ نے اساتذہ اور طلباء میں زیادہ سے زیادہ تماس پیدا کرنے کے لئے ممکنہ کوشش فرمائی۔ آپ طلباء کی سماجی زندگی میں نہایت خوشی کے ساتھ حصہ لیتے تھے اور اپنے تمام شرکائے کار کو بھی اسی طریقہ پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرماتے تھے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی صاحب کے زمانہ میں اساتذہ اور طلباء میں میل ملاپ بڑھتا گیا۔ نائب معین امیر جامعہ کی خدمت پر فائز ہونے کے بعد بھی دیگر متعدد معروفیتوں کے باوجود قاضی صاحب بلا تکلف طلباء کو ملاقات کا موقع دیتے تھے۔ جامعہ کے اکثر طلباء کو آپ کے مخلصانہ اور دانا مشورے ابتک یاد ہیں۔ قاضی صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش تھی کہ جامعہ عثمانیہ میں جلد از جلد وہی علمی ماحول پیدا ہو جو آکسفورڈ اور کیمبرج کی قدیم جامعات میں پایا جاتا ہے۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ جس طرح ان قدیم جامعات کے طلباء اپنے اساتذہ اور بالخصوص اپنے ٹیوٹروں سے اُن کے گھروں پر بھی ملاقات کا موقع حاصل کرتے ہیں اسی طرح جامعہ عثمانیہ میں بھی کوئی مناسب انتظام جلد وجود میں آئے تاکہ اس مفید تماس کے ذریعہ جامعہ کی علمی زندگی میں خوشگوار اثرات پیدا ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ نے جامعہ عثمانیہ کو خالص اقامتی جامعہ بنانا چاہا۔ اس سلسلہ میں اساتذہ کے لئے مکانات کی تعمیر کا منصوبہ زیادہ تر قاضی صاحب کی گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ حدود جامعہ میں اساتذہ کے مکانات کے منصوبہ کی تکمیل کے بعد طلباء کو اساتذہ سے بلا تکلف ملنے اور ان کے مفید مشوروں سے فائدہ حاصل کرنے کے مواقع آسانی سے حاصل ہو سکیں گے اور قاضی صاحب کا دیرینہ خواب عملی شکل میں رونما ہوگا۔

[illegible] کسی قوم کے مستقبل کی تشکیل میں اساتذہ کا جو اہم حصہ ہوتا ہے وہ قاضی صاحب کے نزدیک ایک



۴۵

مقدس فریضہ کی انجام دہی سے کم درجہ نہ رکھتا تھا۔ اس لئے آپ نے اساتذہ کی کارگذاری کو ایسے معاوضہ سے بے نیاز تصور کیا جو وہ دوسرے لوگوں کو ان کی خدمات کے سلسلہ میں سماج یا حکومت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قاضی صاحب نے اساتذہ کی تنخواہ اور دیگر قسم کے مالی معاوضہ کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ ممکن ہے کہ قاضی صاحب کے اس خیال سے اکثر لوگ متفق نہ ہوں لیکن اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرحوم فطری طور پر اساتذہ کے متعلق اپنے اعلیٰ نصب العین پر قائم رہنے پر مجبور تھے اور اساتذہ کی تنخواہ وغیرہ میں ترقی کے بارے میں آپ کی عدم توجہ اس کا لازمی نتیجہ تھی۔

جامعہ کے تدریسی اور تحقیقاتی کام کے معیار کو کافی بلند بنانے کی غرض سے آپ نے ہمیشہ اعلیٰ علمی اور تحقیقاتی صلاحیت رکھنے والے اساتذہ کو جامعہ کے مختلف شعبہ جات کے لئے منتخب کیا اور تدریس کے علاوہ تصنیف، تالیف اور تحقیقاتی کام کو جامعہ کے اساتذہ کا ایک اہم فریضہ قرار دیا۔ جس زمانہ میں قاضی صاحب نائب معین امیر جامعہ کی خدمت پر فائز تھے، اساتذہ جامعہ نے بلند معیار کی تالیفیں اور تحقیقاتی مقالے شائع کرکے جامعہ کے وقار کو بڑھانا شروع کیا اور اب یہ ذوقِ تحقیق جامعہ عثمانیہ کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔ قاضی صاحب کے خانگی کتب خانہ میں کافی تعداد میں وہ تالیفات اور تحقیقاتی مقالے موجود ہیں جو آپکی خدمت میں ہدیۂ پیش کئے گئے تھے۔ ان تالیفات اور مقالوں کی اشاعت سے قاضی صاحب کو بیحد مسرت ہوتی تھی اور آپ اس علمی خدمت کا ذکر اس قدر خوشی کے ساتھ کرتے تھے کہ مولف کی غیر معمولی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ خانگی ملاقاتوں میں بھی تعلیمی نصب العین اور علمی مشاغل کا ہی ذکر ہوا کرتا تھا اور بارہا یہی اصول پیش کیا جاتا کہ جامعی زندگی کی کامیابی کے لئے اچھی تدریس اور بلند پایہ تحقیقاتی کام دونوں لازمی ہیں۔

استاد اور عالم کبھی شہرت کا خواہاں نہیں ہوتا لیکن بغیر کوشش کے لائق استاد اور عالم کو ایسی ابدی شہرت حاصل ہوتی ہے جو دوسروں کو ہرگز نصیب نہیں ہوتی۔ کسی استاد کے علم کا چشمہ اس کی وفات کے بعد بھی اس کے شاگردوں کے توسط سے دوامی جاری رہتا ہے مجھے یقین ہے کہ قاضی صاحب جیسے سچی اور ماہر استاد کے کثیر التعداد شاگردوں کے ذریعہ جن میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی جیسے ممتاز عالم ریاضی بھی شامل ہیں مرحوم کی یاد نہ صرف جامعہ عثمانیہ میں بلکہ دنیائے علم میں ہمیشہ تازہ رہیگی میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے بلند پایہ کردار اور علمی خدمات کے صلہ میں انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

**محمد خواجہ محی الدین**

ریڈر شعبہ ریاضی

# جنایات بوجہ غفلت

[جامعہ عثمانیہ سے امتحانات ام اے (شعبۂ دینیات مضمون فقہ) اور ال ال بی میں کامیابی کے بعد مجھے جامعہ کا وظیفہ یاب ریسرچ اسکالر رہنے کا بھی موقع حاصل ہوا۔ کام ختم کرنے کے بعد "جنایات بر جائداد" کے نام سے مقالہ پیش کیا گیا۔ اس مقالہ میں جائداد کے متعلق ٹارٹس کے سلسلہ میں عصری انگلستانی قانون اور فقہ اسلامیہ کے اصول وضوابط کا کامیاب تقابل کیا گیا جامعہ کے ریسرچ بورڈ کی منظوری کے بعد عرصہ ہوا کہ یہ مقالہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے طبع اور شائع ہو چکا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ میں پی ایچ ڈی کا درجہ کھلا تو اس میں شرکت حاصل کی گئی اور مقالہ موسوم بہ "جنایات بوجہ غفلت" پیش کیا گیا۔ اس مقالہ میں بھی اسلامی قانون اور زمانہ حال کے انگلستانی قانون کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس مقالہ پر جامعہ عثمانیہ نے مجھے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔

مقالہ کا خلاصہ مجلۂ عثمانیہ کے صفحات پر شائع کرنا مناسب متصور ہوا۔"]

**مقصد** اس مقالہ کا یہ مقصد ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ "جنایات بوجہ غفلت" کے بارے میں اسلامی اور انگلستانی قانون جنایات کے مماثل اصول اور ضوابط میں کیا مطابقت پائی جاتی ہے اور کیا اختلاف کس نوعیت کا ہے اور آیا کہیں کہیں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کسی نظام قانون کے موجودہ اصول آیندہ اور زیادہ بہتر اساس پر ترقی پا سکتے ہیں۔

**حد موضوع** اس مقالہ میں اصول اور ضوابط کلیہ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ ان اصول اور ضوابط کلیہ پر جو مسائل متفرع ہوتے ہیں مثلاً مکانوں اور اراضی کے مالکوں یا قابضوں کی ذمہ داری۔ خطرناک اشیاء کے استعمال کی ذمہ داری۔ آگ۔ پانی اور جانوروں کے متعلقہ مسائل اس مقالہ کا موضوع قرار نہیں دے گئے۔ اسی طرح امدادی غفلت کے مسئلہ پر بھی اس مقالہ میں بحث نہیں کی گئی ہے۔ ان پر آیندہ مستقل مقالے تالیف ہو سکیں گے۔

**تعریف** عصری اردو قانونی ادب میں غفلت کی اصطلاح انگریزی قانونی اصطلاح ( Negligence ) کے مترادف ہے۔ اسلامی قانونی ادب میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "خطا" کی اصطلاح برتی گئی ہے۔
ارباب قانون انگلستان نے صراحت کی ہے کہ غفلت کی کوئی قطعی تعریف مشکل ہے کہ حالات کے اعتبار سے ایک ہی فعل پر بعض وقت غفلت کا اطلاق ہوتا ہے اور بعض وقت نہیں ہوتا۔ اسی طرح متقدمین فقہاء اسلام کی اکثریت نے بھی خطا کی توضیح کے سلسلہ میں یا تو خطا، کا لغوی مفہوم اور مثال بیان کر دی یا اس کی نوعیتیں بیان کی ہیں۔ البتہ فقہا متاخرین اور اہل اصول نے یہ کوشش کی ہے کہ خطا کی منطقی تعریف بیان کی جائے چنانچہ اس کی تعریف میں احتیاط عمل میں لانے کے جزو کو شامل کیا ہے اور ان کی تعریف جسٹس ولس کی اس تعریف کے مماثل ہو گئی ہے کہ "غفلت سے مراد بہ مناسبت حالات احتیاط کی عدم موجودگی ہے"۔

**بدنیتی اور غفلت** انگلستان کے قانون اور اسلامی فقہ دونوں میں قرار دیا گیا ہے کہ فعل یا تو بالعمد وقوع میں آیا ہے یا بوجہ غفلت فعل کئے بالعمد ارتکاب میں فاعل چاہتا ہے کہ اس کے فعل سے وہی نتائج پیدا ہوں جن کو وہ ارتکاب فعل سے قبل ہی جانتا اور چاہتا ہے۔ اس کے برخلاف فعل کے ارتکاب بوجہ غفلت میں فاعل یہ نہیں چاہتا کہ اس کے فعل سے وہی نتائج پیدا ہوں جو بالآخر وقوع میں آئے افعال بالعمد اور افعال بوجہ غفلت میں باہم کوئی واسطہ نہیں ہے۔

**غفلت کا ذہنی اور خارجی مفہوم** انگلستانی اصول قانون کی رو سے غفلت کی اصطلاح صرف ذہنی کیفیت کو واضح کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے بلکہ خود اس فعل پر بھی بنفسہ اس کا اطلاق ہوتا ہے کہ جو اس ذہنی کیفیت کی بناء پر وقوع میں آیا۔ اسلامی فقہاء کے بیانات سے بھی یہی امر واضح ہوتا ہے کہ خطا کا اطلاق ذہنی اور خارجی دونوں نوعیتوں پر ہوتا ہے اور جس طرح ذمہ داری عائد کرنے میں قانون انگلستان کی رو سے دونوں قسم کی غفلت میں کوئی فرق نہیں ہے اسی طرح اسلامی فقہاء بھی ذمہ داری عاید کرنے میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

**غفلت کا خارجی مفہوم اور نظریہ غفلت** قانون انگلستان کے اساتذہ کو اس امر میں اختلاف ہے کہ غفلت امر خارجی ہے یا امر ذہنی۔ البتہ یہ امر گویا قطعیت کے ساتھ طے کیا گیا ہے کہ دیوانی نوعیت کی ذمہ داری عاید کرنے میں غفلت کو امر خارجی یا امر ذہنی قرار دینے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا یہ کہ امور جو ظاہر میں واقع ہوتے ہیں ان پر ہی قانونی اثر مترتب ہوتا ہے۔ اسلامی فقہاء نے عام طور سے جنایت کو امر خارجی قرار دیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ قرار دیا ہے کہ

عائد کرنے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ نیز ان کا ایک مسلمہ اصول یہی ہے کہ حکم امر ظاہر پر ہوتا ہے۔

**احتیاط برتنے کا فرض** | قانون انگلستان اور اسلامی فقہ دونوں کو اس امر میں اتفاق ہے کہ غفلت کا صدور اس وقت قرار دیا جائے گا جبکہ احتیاط برتنا قانوناً ضروری ہو۔

**احتیاط کا معیار** | قانون انگلستان کی رو سے قرار دیا گیا ہے کہ اصلی معیار غفلت یہ ہے کہ اس مقدار احتیاط کو اختیار نہ کیا جائے جو کوئی محتاط آدمی کسی معاملہ میں برتتا ہو۔ اس سلسلہ میں قانون انگلستان کے نکات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کسی کام سے محض اس لئے باز رہنا کہ اس میں خطرہ کا احتمال ہے ضروری نہیں ہے۔

۲۔ احتیاط کا معیار بالعموم ہر مقدمہ کے واقعات پر موقوف ہے۔

۳۔ انسانی قدرت کا جو انتہائی درجہ ہوتا ہے اس کے مطابق احتیاط عمل میں لانا ضروری نہیں ہے۔

۴۔ یہ معیار پیش نظر رہے گا کہ واقعات اور حالات کے اعتبار سے کسی معاملہ میں کسی محتاط آدمی سے جو احتیاط عمل میں آسکتی ہو اس پر عمل کیا جائے۔

واضح ہو کہ امر نمبر ۴ کے سلسلہ میں اسلامی فقہاء نے احتیاط کا معیار" امکان" کو قرار دیا ہے لیکن بالآخر دونوں نظام ہائے قانون میں کوئی تباین نہیں ہے۔ امر نمبر ۲ ضابطہ کا مسئلہ ہے۔ یوں فقہاء اسلام کے پاس بھی اس اصول کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ امور نمبر ایک اور تین میں دونوں نظام ہائے قانون میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

**عدم مہارت** | ۱۔ کسی کام میں مہارت ضروری ہو تو اس کا لحاظ ضروری ہے۔

۲۔ ترک مہارت غفلت ہے۔

۳۔ مہارت اس قدر ہونی چاہیئے جو اس کام کے انجام دینے والے معمولی فہم کے افراد میں ہوتی ہے۔

یہ امور انگلستان کے قانون کی رو سے قرار دئے گئے ہیں۔ اسلامی فقہا کے اقوال سے بھی یہ امور ثابت ہوتے ہیں۔

**خاطی** | ۱۔ تاج۔ انگلستان کے قانون کا یہ اصول ہے کہ بادشاہ سے کوئی قصور صادر نہیں ہوسکتا۔ لیکن اسلام اس اصول کی قطعی طور سے ممانعت کرتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں لارڈ برکنھڈ نے ایک فریق مقدمہ کے لحاظ سے تاج کی حیثیت پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس نے جو مسودۂ قانون پیش کیا تھا اس کے مجوزہ احکام اسلامی اصول و آئین کے قریب تر آجاتے تھے لیکن یہ مسودہ پارلیمنٹ میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔

۲. غیر ممالک کے بادشاہ اور سفراء کے متعلق بھی قانون انگلستان کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جنایتوں کے لئے انگلستانی عدالتوں میں جواب دہ نہیں ہیں لیکن اسلامی ضوابط کے لحاظ سے کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔

۳. ممالک ماتحت کے گورنروں کے متعلق انگلستان میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ ان کے افعال نظم و نسق حکومت کے سلسلہ میں انجام پائے ہوں تو اس صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے البتہ ایسے افعال جو گورنر سے خانگی طور پر صادر ہوئے ہوں ذمہ داری سے بری نہ ہوسکیں گے۔ اسلامی قانون کے اعتبار سے وہی قاعدہ نافذ ہوگا جو تاج کے بارے میں مقرر ہے۔

۴. عہدہ داران عدالتی۔ قانون انگلستان میں قرار دیا گیا ہے کہ کسی عہدہ دار عدالتی کا کوئی ایسا فعل جو حیثیت عہدہ دار عدالتی عمل میں آیا ہو کسی نالش کی بنا نہیں قرار پا سکتا۔ اسلامی قانون بھی اس کے مغائر نہیں ہے۔

۵. عام ملازمین سرکاری کے بارے میں قانون انگلستان میں قرار دیا گیا ہے کہ ہر ملازم سرکار اپنے جنایات کے لئے خود ذاتی طور سے ذمہ دار ہے۔ اسلامی احکام بھی اس کے مطابق ہی ہیں۔

۶. نابالغ۔ قانون انگلستان میں قرار دیا گیا ہے کہ نابالغ فرد بھی عام طور پر اپنی جنایت کے لئے خود ذمہ دار ہے۔ اسلامی قانون کے احکام بھی اس سے متبائن نہیں ہیں۔

۷. مجنون کے متعلق بھی دونوں نظام ہائے قانون میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

۸. شادی شدہ عورتیں۔ قانون انگلستان کی رو سے شادی کے بعد زوجہ اور شوہر دونوں ایک وحدت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ گو مختلف حالیہ قوانین کے ذریعہ شوہر اور زوجہ کی قانونی وحدت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اصولاً اب بھی یہی امر مسلم ہے کہ شوہر اور زوجہ شادی کے بعد ایک وحدت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسلامی قانون میں یہ اصول کسی طرح مسلم نہیں ہے۔ شادی ہونے کے بعد کسی مسلمان عورت کی ذاتی حیثیت زائل نہیں ہو جاتی۔ لا ریفارم ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ذریعہ جو احکام نافذ ہوئے ان کی وجہ سے انگلستانی قانون اب اسلامی قانون کے بہت قریب ہو گیا ہے لیکن اب بھی کافی بُعد ہے۔

## جنایت بربنائے فعل مشترک

قانون انگلستان میں قرار دیا گیا ہے کہ

۱. جو افراد بالاشتراک جنایت کے مرتکب ہوں وہ بالاشتراک اور انفراداً پورے نقصان کے ذمہ دار ہیں۔ ضرر یاب کسی ایک خاطی پر علحدہ طور سے پورے نقصان کے ہرجانہ کی نالش دائر کر سکے گا۔ اگر مدعی چاہے تو سب خاطیوں پر بالاشتراک بھی نالش رجوع کر سکے گا۔

۲۔ جب دو یا اس سے زیادہ افراد پر ایک ساتھ نالش کی جائے تو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ہرجانہ کو ان میں بطور حصہ رسدی باہم تقسیم کیا جائے۔

۳۔ دو یا دو سے زیادہ خاطیوں کی وجہ سے نقصان عائد ہو تو ہرجانہ دلانے کے لئے زیادہ قصور والے سے زیادہ اور کم قصور والے سے کم ہرجانہ نہیں دلایا جائے گا۔

۴۔ اگر ایک مشترکہ خاطی کے متعلق فیصلہ حاصل کر لیا جائے تو دوسرے شرکا بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

۵۔ اگر ایک خاطی کو مدعی بری الذمہ کر دے تو باقی شرکا بھی بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

امر اول و دوم کے سلسلہ میں اصل مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشترکہ خاطیوں کے مابین ہرجانہ کو حصہ رسدی کے طور پر تقسیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ ایک شریک قصور دوسرے شریک قصور پر حصہ رسدی کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اس اصول کے متعلق اہل الرائے میں باہم بہت اختلاف تھا لیکن اب بالآخر ۱۹۳۵ء میں لا رفارم ایکٹ کی رو سے یہ اصول بطور قطعی تسلیم کر لیا گیا کہ ٹارٹ کے ارتکاب کی صورت میں کسی مشترکہ فعل کی بنا پر ہرجانہ کی ادائی عمل میں آئے تو دوسرے شرکا سے حصہ رسدی حاصل کیا جائے گا۔ اسلامی قانون میں یہ اصول پہلے ہی سے مسلم ہے۔

امر سوم کے سلسلہ میں اسلامی فقہا نے بھی اصولاً طے کیا ہے کہ زیادہ قصور والا زیادہ اور کم قصور والا کم ذمہ دار نہیں ہے۔

امر چہارم کے سلسلہ میں واضح ہو کہ اصولاً اسلامی فقہ کی رو سے ہر شخص اپنا ذمہ دار آپ ہوگا۔

امر پنجم کے سلسلہ میں مخفی نہ رہے کہ پہلے انگلستان کے قانون کا یہ قاعدہ تھا کہ اگر ایک شریک کو بری الذمہ کر دیا جائے تو باقی شرکا بھی بری الذمہ متصور ہوتے تھے لیکن لا رفارم ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ کسی مرتکب جنایت کے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے تو اس امر کی مخالفت نہیں ہو جاتی کہ کسی ایسے شخص کے خلاف نالش دائر نہ کی جائے جو بصورت ارجاع نالش مشترک مرتکب کی صورت میں ذمہ دار ہوتا ہو۔ اسلامی فقہا کے پاس یہ اصول پہلے سے مسلم ہے۔

## اصل اور کارندہ

انگلستانی قانون کی رو سے قرار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی جانب سے اجازت سے یا ترغیب دلانے پر یا دوسرے شخص کے کارندہ کی حیثیت میں کسی ٹارٹ کا ارتکاب کرے تو ذمہ داری مرتکب اور خود اس شخص پر جس کی اجازت سے اس ٹارٹ کا ارتکاب ہوا عائد ہوگی۔ لیکن اسلامی قانون کی رو سے بجز چند استثنائی صورتوں کے ذمہ داری محض مرتکب پر عائد ہوگی۔ البتہ قانون انگلستان نے یہ طے کیا ہے کہ اگر کارندہ اپنی غفلت سہو و نسیان

یا لاعلمی سے کسی خلاف قانون فعل کا مرتکب ہوا ہو تو اصل شخص پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اصول اسلامی فقہاء نے بھی طے کیا ہے۔

**شراکتی کاروبار** قانون انگلستان کا ایک اصول یہ ہے کہ کاروبار شراکتی کے اغراض کے لئے ہر شریک دوسرے شریک کا کارندہ ہے۔ اس لئے ذمہ داری صرف ان افعال کے بارے میں عائد ہو سکے گی جن کا ارتکاب کاروبار شراکتی کے دوران میں کیا جائے اسلامی فقہا کا اصول بھی یہی ہے۔

**آقا اور ملازم** یوں معمولی طور سے کسی خلاف قانون فعل کے لئے وہی شخص ذمہ دار قرار پاتا ہے جو اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے لیکن قدیم اور عصری قوانین کی رو سے ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ جہاں نیابتی ذمہ داری پر عمل ہوتا ہے۔ معاشرہ کی ابتدائی حالت میں نیابتی ذمہ داری کا اصول عالمگیر طور سے رائج تھا لیکن یہ اصول عصری اصول معدلت کے مغائر ہے۔ اس اصول میں اسلامی اور انگلستانی دونوں نظام ہائے قانون میں توافق ہے۔

عصری دیوانی قوانین میں نیابتی ذمہ داری کا اصول جن صورتوں میں تسلیم کیا گیا ہے ان میں ایک صورت یہ ہے کہ آقا اپنے ملازموں کے ان افعال کے لئے ذمہ دار ہے جو ملازموں سے بدوران ملازمت صادر ہوتے ہوں۔

اس سلسلے میں یہ چند امور پیش نظر رہنا چاہیئے کہ

(۱) عموماً آقا اور ملازم کے تعلق کی بنا، اداشدنی معاوضہ کے بدل میں قرار پائے ہوئے معاہدہ پر ہوتی ہے۔ (۲) یہ تعلق مسلسل یا دوامی ہوتا ہے۔ (۳) ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ملازم ہو گر اس کو دوامی طور سے مامور نہ کیا گیا ہو۔ (۴) ہو سکتا ہے کہ کوئی ملازم صرف ایک ہی کام کی انجام دہی کے لئے ایک ہی وقت مامور ہو۔ (۵) ہو سکتا ہے کہ ملازمت بلا معاوضہ ہو۔ (۶) ہو سکتا ہے کہ ملازمت محض بطور واقعہ ثابت ہو۔ (۷) خدمت انجام دلانے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ آقا جسمانی طور سے نگرانی کرے۔ (۸) کوئی شخص ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ افراد کا ملازم ہو سکتا ہے (۹) کوئی آقا اپنا ملازم کسی دوسرے کو مستعار دے سکتا ہے۔

ان تمام امور میں دونوں نظام ہائے قانون میں توافق ہے اور عام طور سے کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ اسلامی فقہانے طے کیا ہے کہ آقا ملازم کی جنایتوں کا ذمہ دار ہے لیکن ٹارٹ کا ارتکاب ملازم بالتعمد عمل میں لائے تو پھر اس صورت میں آقا ذمہ دار نہ ہوگا۔ اسلامی فقہا نے آقا پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ

نیابتی ذمہ داری کے اصول پر کی ہے۔ انگلستان کے قانون میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ملازم ٹارٹ کا ارتکاب بالقصد بھی عمل میں لائے تو ذمہ دار آقا ہی ہوگا۔ لیکن اب رجحان یہ ہے کہ ملازم کے ارادۃً عمل میں لائے ہوئے افعال کے لئے آقا اس صورت میں ذمہ دار ہوگا جب کہ ملازم یہ افعال آقا کی منفعت کے لئے عمل میں لایا ہو۔ بہرحال یہ مسئلہ ابھی قطعیت کے ساتھ طے نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں چند مسائل اور ہیں۔

۱۔ ملازم سے کسی ایسے خلاف قانون فعل کا ارتکاب عمل میں آئے کہ جس کی آقا نے اجازت دی ہو تو قانون انگلستان کی رو سے آقا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن اسلامی ارباب قانون نے اس میں ایک شرط یہ قائم کی ہے کہ ملازم کو یہ معلوم ہو کہ وہ آقا کے کہنے پر خلاف قانون فعل کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس صورت میں خود ملازم ذمہ دار قرار پائے گا۔ اگر ملازم کو علم نہ ہو تو پھر اس صورت میں آقا ذمہ دار ہوگا۔

۲۔ قانون انگلستان کا ایک اصول یہ ہے کہ ملازم کی جانب سے کسی کار مجاز کی انجام دہی میں اگر کوئی طریقہ ایسا اختیار کیا جائے جس کی آقا نے اجازت نہ دی تھی تو اس صورت میں بھی آقا ذمہ دار ہوگا۔ جہاں تک سمجھا گیا ہے اسلامی فقہا کے پاس بھی یہ اصول مسلم ہے۔

۳۔ ملازم کا فعل کوئی آزاد فعل ہو اور کار مجاز سے اس کو تعلق نہ ہو تو اس صورت میں دونوں نظام ہائے قانون میں قرار دیا گیا ہے کہ آقا ذمہ دار نہ ہوگا۔



۴۔ دونوں نظام ہائے قانون کا متفقہ مسئلہ ہے کہ بعض وقت اجازت دلالۃً حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ دونوں نظام ہائے قانون کا ایک متفقہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ آقا اس وقت ذمہ دار قرار پاتا ہے جب کہ یہ ثابت ہو کہ ملازم نے فعل کا ارتکاب آقا کے اغراض کے مد نظر کیا تھا نہ کہ خود اپنے ذاتی مقاصد کے تحت نیز یہ کہ ملازم کو کسی فعل سے آقا کی صریح ممانعت بھی آقا کو ذمہ داری سے نہیں بچا سکتی۔

۶۔ کوئی آقا اپنے کسی ملازم کی غفلت یا کسی دوسری جنایت کے لئے محض اس لئے ذمہ دار نہ ہوگا کہ غفلت ملازم سے اس وقت صادر ہوئی جب کہ وہ آقا کے کاروبار میں مشغول تھا۔ آقا ذمہ دار ہونے کے لئے جنایت کو کاروبار انجام دینے کے دوران میں اس طرح صادر ہونا چاہیئے کہ جنایت اس کام کا جزو قرار پائے۔ یہی نہ ہو کہ جنایت اور آقا کا کام دونوں ایک ہی وقت میں انجام پائیں۔ یہ فرق فقہاء اسلامیہ کے آراء کی رو سے بھی مسلم ہے۔

۷۔ کوئی آقا اپنے کسی ملازم کی غفلت کا ذمہ دار نہ ہوگا اگر یہ غفلت کسی ایسے کام کے دوران میں صادر ہو کہ جس کے انجام دینے کی ملازم کو خود اس کے اغراض کے تحت آقا نے اجازت دی ہو۔ عام فقہی اصول کے تحت یہ اصول بھی فقہ اسلامیہ کی رو سے غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔ ۸۔ دونوں نظام ہائے قانون کی رو سے یہ مسئلہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی ملازم اپنے آقا کا

مال آقا کی اجازت کے بغیر خود اپنے ذاتی اغراض میں استعمال کرے اور اس سلسلہ میں غفلت کا ارتکاب ہو کر کسی نقصان پہونچے تو آقا ذمہ دار نہیں ہے۔

۹۔ اگر آقا کے پاس کوئی شخص اپنی کوئی شئے امانت رکھوائے اور کوئی ملازم اس کو چرائے تو قانون انگلستان کی رو سے اصول قرار دینے میں شبہ باقی ہے۔ فقہ اسلامیہ کی رو سے یہ دیکھا جائے گا کہ ملازم سے تعدی کا صدور ہوا یا نہیں۔

۱۰۔ اگر ملازم کی جانب سے اپنے اختیارات دوسرے شخص کے سپرد کردئے جائیں تو ذمہ داری آقا پر نہ ہوگی دونوں قوانین انگلستانی اور اسلامی اس بارے میں متفق ہیں۔

۱۱۔ انگلستانی قانون میں قرار دیا گیا ہے کہ جب ایک ہی آقا کے متعدد ملازم ہوں اور ایک ملازم دوسرے ملازم کو اپنی غفلت سے مضرت پہونچائے تو آقا ذمہ دار نہ ہوگا اس بارے میں اسلامی فقہا کا مسلک انگلستان کے قانون کے مطابق ہے۔

۱۲۔ اگر آقا خود ذاتی طور پر غفلت کا مرتکب ہو اور اس کی وجہ سے ملازم کو مضرت پہونچے تو آقا پر ذمہ داری عاید ہوگی۔ اس بارے میں اسلامی اور انگلستانی قوانین مماثل ہیں۔

**خود مختار معاہدلہ** | قانون انگلستان کا ایک عام اصول یہ ہے کہ آقا کسی ایسے شخص کی غفلت کے لئے ذمہ دار نہیں ہے جو بطور کارندہ خود مختار معاہدلہ کی حیثیت میں کسی کام کی انجام دہی عمل میں لائے۔ عام طور سے اسلامی قانون کا بھی یہی اصول ہے لیکن دونوں نظام ہائے قانون میں چند فروعی اختلافات ہیں جن سے اصل مسئلہ پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا۔

**نالش بعد موت** | جنایت کی بناء پر دعویٰ کرنے کا حق اور دعویٰ کئے جانے کی ذمہ داری کسی فریق کے فوت ہونے سے ساقط ہو جاتی ہے۔ دونوں نظام ہائے قانون میں یہی اصول ہے۔

**بار ثبوت** | ۱۔ دونوں نظام ہائے قانون میں قرار دیا گیا ہے کہ بار ثبوت مدعی پر ہے۔

۲۔ دونوں قوانین میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر کوئی حادثہ وقوع میں آئے تو پیش آمدہ حالات سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ عدم احتیاط کی وجہ سے کس پر ذمہ داری ہے۔

۳۔ دونوں قوانین نے اس اصول پر اتفاق کیا ہے کہ کوئی شخص اس مضرت کی شکایت نہیں کرسکتا جس پر وہ رضامند ہوا ہو۔

۴۔ انگریزی اہل قانون نے رضامندی اور علم میں جو فرق کیا ہے وہ فقہا اسلامیہ کے ہاں بھی مسلم ہے۔

مدعی کن وجوہ کی بناء پر ہرجانہ وصول کرنے سے محروم ہو جاتا ہے | دونوں نظام ہائے قانون کی رکو

امور مندرجہ ذیل پر اتفاق ہے۔

۱۔ ہوسکتا ہے کہ کسی فرد واحد کو جو نقصان ہو اس کی بہت زیادہ یا بجائی اس منفعت سے ہو جائے جو عامۃ الناس کو بالعموم حاصل ہو۔

۲۔ ہوسکتا ہے کہ کسی فرد کو اس وجہ سے نقصان عاید ہوا ہو کہ اس کے ہمسایہ کسی دوسرے شخص نے اپنی کسی جائداد میں حقوق مالکانہ کا استعمال کیا ہو۔

۳۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے کسی فعل سے دوسرے شخص کو اس بنا پر نقصان ہو کہ پہلا شخص کسی بڑے شر کو روکنا چاہتا ہو۔

۴۔ ہوسکتا ہے کہ جو ضرر پہونچا وہ خفیف اور ناقابل ثبوت ہو۔

۵۔ ہوسکتا ہے کہ مدعی علیہ کا فعل خلاف قانون نہ ہو

۶۔ ہوسکتا ہے کہ مدعی علیہ نے جس حق کی خلاف ورزی کی اس کے متعلق مدعی کو کوئی استحقاق حاصل نہ ہو۔

۷۔ ہوسکتا ہے کہ جو مضرت پہونچی وہ ان مضرتوں میں شامل نہ ہو جن کو قانون تسلیم کرتا ہے۔

۸۔ ہوسکتا ہے کہ سبب کا قاعدہ حائل ہو جائے۔



**حرف آخر** | غفلت کے متعلق اسلامی فقہا نے کئی صدی قبل جو اصول منضبط کئے وہ عملی حیثیت سے موجودہ ترقی یافتہ زمانہ کے ایک ترقی یافتہ اور اصلاح پذیر قانون سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ بعض صورتوں میں تو جدید اور عصری قانون اب بھی اسلامی فقہ سے پیچھے ہے مثلاً عورتوں اور تاج کی حیثیت کے سلسلہ میں۔ انگریز مفکرین غور و فکر کے بعد وہی اصول اختیار کرنے پر مائل ہیں جو اسلامی فقہا نے اختیار کئے۔ لا ریفارم ایکٹ کے ذریعہ متعدد امور میں قانون انگلستان اسی نقطہ پر پہونچ رہا ہے جہاں اسلامی قانون پہونچ چکا ہے۔

اسلامی فقہ کے اصول کسی جامد مطلق نظام قانون کے اصول و قواعد نہیں ہیں۔ اسلامی نظام قانون میں وسعت پانے اور ترقی کرنے کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ معاشرہ کی ترقی کے ساتھ جو جدید مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ان کو عملی طور پر حل کرنے میں اسلامی فقہا کبھی پیچھے نہیں رہے۔

---

ڈاکٹر محمد غوث
ام اے، ال ال بی، پی ایچ ڈی (عثمانیہ)

# دورِ حاضر

یہ عالم اس کا ہر ایک دور کتنا انقلابی ہے
خرابی ایں درستی ہے درستی میں خرابی ہے
یہ گلشن پھول کر پھل کر بھی مرجھایا ہوا سا ہے
شرابِ شادمانی پی کے غم کھایا ہوا سا ہے
یہ ساری بسنے والی صورتیں ہیں پتلیاں کل کی
ہر ایک ہستی ہے اس بستی میں سایہ کی طرح ہلکی
عدم تک جانے والوں کا مسافر خانہ ہے دنیا
جو بھر بھر کر چھلک جاتا ہے وہ پیمانہ ہے دنیا
صفات و ذات کے رہتے ہیں دریا موج زن اس میں
رہے ہیں جلوہ گر لاکھوں صف آرا صف شکن اس میں
یہ کس استاد کا خط ہے کبھی ساکت کبھی گویا
مقدر نام ہے اس کا کہیں جاگا کہیں سویا
کسی کے ایک لفظ کُن کی تفسیریں نظر آئیں
مصور جس میں خود جھلکے وہ تصویریں نظر آئیں
یہاں اقوام کی قسمت بگڑتی اور بنتی ہے
قدم کی روشنی امکان کے پردوں سے چھنتی ہے
کہاں محمود غزنی اور کدھر سلطان ابدالی
نہ وہ گلشن نہ وہ اس کی روش باقی نہ وہ مالی
ہوائے انقلاب آمادہ ہے ملت کی خدمت پر
پڑے ایک تازیانہ غیب سے رہوارِ ہمت پر
اُٹھے کوئی تو شارب کیا عجب بن جائے بات اب بھی
کسی ایسے مکین کی منتظر ہے کائنات اب بھی

میر طاہر علی شارب
سال دوم (سائنس)

# کون جانے ـــ!

اور پھر میں البم کا وہ صفحہ الٹ نہ سکا۔ میں اٹھکر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں غیر اختیاری طور پر ٹہلنے لگا۔ سامنے میز پر تصویروں کا البم کھلا پڑا رہا اور میرا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

"چرواہی" یہ اس تصویر کا نام تھا جو البم کے کھلے صفحے پر میری نظروں کے سامنے پڑی تھی۔ بیتے ہوئے دنوں کا ایک مختصر سا واقعہ اس تصویر نے آج یاد دلا دیا تھا ــ مختصر ہی تو تھا وہ پھر بھی میں اسے بھلا نہ سکا۔ اس کی یاد جو ذہن کے کسی نامعلوم گوشے میں دبی پڑی تھی آج اس تصویر کو دیکھتے ہی ابھر آئی تھی۔ ماضی کے سینکڑوں نقوش دماغ میں ابھرتے چلے آئے اور وقت کی ایک ہی جست کے ساتھ کئی برس پہلے کا ایک دن میرے ذہن میں گھوم گیا! ـــ

وہ برسات کی ایک حسین شام تھی۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں سرمئی رنگ کے سینکڑوں بادل تیر رہے تھے۔ سورج کے غروب ہونے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ زمین پر حد نگاہ تک سبزہ پھیلا ہوا تھا درختوں کی شاخوں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں ہوا گیت گا رہی تھی۔ جھاڑیوں میں خرگوش پھدک رہے تھے اور درختوں پر لڑتی ہوئی چڑیوں کا غل مچا ہوا تھا۔ ہر طرف فضا میں بے خودی اور سرشاری گھلی ہوئی تھی۔ میں سائیکل سے اتر گیا اور سڑک سے ہٹ کر سیدھے ہاتھ کو جانیوالی پگڈنڈی پر ہولیا۔ سامنے کھڑی ہوئی ایک اونچی سی پہاڑی پر پہنچنے کو میری طبیعت بے تاب ہو رہی تھی۔



مسلسل پانچ گھنٹے سائیکل پر بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا تھا۔ میں شہر سے اپنے گاؤں آرہا تھا کالج میں تین چار دن کی چھٹیاں تھیں اور موسم کی دلفریبیاں عروج پر۔ میں پنجرہ سے بھاگے ہوئے نوگرفتار پرندے کی طرح اپنے گاؤں اڑا جا رہا تھا.... راستے میں ایک جگہ ہلکی سی بارش بھی ہو گئی تھی لیکن میں بجائے کسی درخت کی آڑ لینے کے بارش میں بھیگتا ہی رہا۔ جیسے مجھ میں اور بارش میں ضد سی ہو گئی ہو ـــ لیکن بارش کو ہار ماننا ہی پڑا! اور پھر ذرا سی دیر میں پورب کی طرف لہراتی ہوئی قوس قزح نے بارش کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ ہوا کے بدمست جھونکوں نے میرے کپڑے خشک کر دئے۔ تارکول کی بھیگی ہوئی سڑک پر سائیکل کے تیزی سے گھومتے ہوئے پہیوں سے ایک مستقل سر پیدا ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے اور کھیتوں کے آس پاس گڑھوں میں بارش کا سرخ گدلا پانی جمع ہو گیا تھا جس میں جنگل سے لوٹتی ہوئی بھینسیں پڑی

لوٹ رہی تھیں۔ راستے میں کبھی گانوں سے گذر جاتا تو بھیگے ہوئے گوبر کی بو دماغ میں چبھنے لگتی۔ بھنبھناتے مچھر کوڑے کو کریدتے ہوئے گانوں کے غلیظ کتے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتے .... لیکن میں گانوں کے باہر باغوں میں پڑے ہوئے جھولوں کو دیکھنے لگتا۔ جھولے کی ہر پینگ کیساتھ سارا درخت جھوم جاتا اور آم کے پتوں پر منجمد ہوا پانی موٹی موٹی بوندوں کی ایک چادر پھیلا دیتا .... ٹپ ٹپ ٹپ۔ اور پھر ایک لمحہ کے لئے جھولا جھولتی ہوئی گانوں کی الھڑ دوشیزاؤں کے دبے دبے لیکن پرمعنی گیت فضا میں منتشر ہو جاتے، میرا جی چاہتا اس مسحور کن فضا کو کچھ دیر کے لئے کیسٹ کرا کے اپنے دل میں رکھ لوں ــــ لیکن اتنی دیر میں میں بہت آگے بڑھ چکا ہوتا اور اب فضا میں ان گیتوں کے بجائے طوطوں اور میناؤں کا شور اور کوئل کی فریاد پھیل جاتی۔ پر تولتے ہوئے کوؤں کی قطاریں وقفہ وقفہ سے کائیں کائیں کا ایک غل مچا دیتیں اور مجھے پھر وہ ساون کا گیت یاد آجاتا ..... جارے کاگا پی کے دیس۔

تو میں سائیکل سے اتر کر پیدل اس پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ پگڈنڈی کے دونوں جانب جھکی ہوئی جھاڑیوں کے پتے ان پر ٹھیرے ہوئے پانی کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے، میں ان سے بچتا بچاتا اوپر چڑھ رہا تھا۔ کوٹ اتار کر کاندھوں پر ڈال لیا تھا اور پتلون کو بیلٹ پر کافی اوپر کھینچ لیا تھا۔ سائیکل کی موجودگی اس چڑھائی میں تکلیف تو بہت دے رہی تھی لیکن پہاڑی پر پہنچنے کی زبردست خواہش کے آگے یہ بے حقیقت تھی۔ بالآخر میں آخری چٹان کے پہلو سے ہو کر ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گیا۔



سائیکل کو زمین پر لٹا کر میں ایک پتھر پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے سامنے میلوں تک پھیلی ہوئی کائنات میرے قدموں کے نیچے ہے۔ جیسے درختوں پر منڈلاتے ہوئے یہ نیل کنٹھ اور ہُد ہُد مجھ تک نہ پہنچ سکیں گے، جیسے میں اُچک کر سر پر اڑتے ہوئے ان بادلوں کے ٹکڑوں کو پکڑ لوں گا جیسے یہ غیر منتہی آسمان ابھی کچھ دیر میں جھک کر مجھ سے سرگوشیاں کرنے لگے گا ..... اور میں ویسے ہی کھڑا رہا۔ مغرب کی طرف غروب آفتاب کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں بادلوں کے کنارے اپنا رنگ بدل رہے تھے اور دور افق تک پھیلے ہوئے سبزہ پر سرخی کی کرنیں پھوٹ پڑی تھیں، گنجان درختوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک کسی تصویر میں بنائے ہوئے لہراتے ہوئے دریا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہوا پہاڑی کے خودرو پھولوں کی خوشبو سے بوجھل سی ہو گئی تھی ــــ میں سوچنے لگا شائد ایسے ہی کسی منظر کو لافانی کرکے خدا نے جنت کی تخلیق کی ہوگی! میں نگاہوں کے رستے اس ماحول کو پی جانا چاہتا تھا۔

اور اسی لمحہ مجھے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی "سُرّ رّ" میں نے مڑ کر دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آیا کچھ قدم آگے بڑھ کر میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر ایک مرتبہ ویسی ہی آواز آئی اور اب کی دفعہ میں نے اسے

دیکھ لیا۔ وہ ایک چرواہی تھی۔ ہاتھ میں ایک لمبی سی درانتی لئے وہ ایک درخت پر چڑھی پتے توڑ رہی تھی۔
میں اور قریب چلا گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا جوانی اور صحت کا ایک مکمل امتزاج میری نظروں کے سامنے
تھا۔ وہ سانولے سے رنگ کی ایک الھڑ سی لڑکی تھی، نیلے سرخ رنگ کا کرتا جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا، بارش
میں بھیگ کر سر کے لمبے لمبے بالوں کی لٹیں چہرے پر ادھر ادھر یوں لٹک رہی تھیں جیسے بڑ کی جڑیں کانوں
میں پڑی ہوئی بالیاں گردن کے ہر جھٹکے کے ساتھ آپس میں ٹکرا جاتیں۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں
چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی، بے چین سی آنکھیں، جیسے کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہوں وہ کچھ ایسی
حسین نہ تھی لیکن حسن کا دوسرا نام شاید جوانی اور صحت ہی تو ہے —— میں اسے دیکھتا اور قریب
چلا گیا۔ درانتی اس کے ہاتھوں میں رک گئی اور اس نے جلدی سے اپنی ننگی باہہ کو کرتے کی پھٹی ہوئی
آستین کھینچ کر ڈھک لیا۔ وہ درخت پر ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں اصل تنے سے ایک اور موٹی شاخ پھوٹ
نکلی تھی۔ دائیں طرف سے ایک جھومتی ہوئی شاخ آکر بالکل اس کے شانے پر جھک گئی تھی۔ ہر طرف درخت
کی ٹہنیوں اور پتوں نے اس کے گرد ایک سبز جال سا بن دیا تھا۔ پس منظر میں نیلے آسمان پر نقروئی
کناروں والے سرمئی بادل جھول رہے تھے، ایک ہاتھ درانتی پر رکھے اور دوسرے سے بار کا ٹہنا تھامے
گردن اٹھائے وہ یوں کھڑی تھی جیسے کوئی یونانی مجسمہ . . . . . ! دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور
میں دوڑتا ہوا جا کر سائیکل سے اپنا کیمرہ کھول لایا۔ وہ وہیں کھڑی ہوئی میری ان عجیب حرکتوں کو تک
رہی تھی میں نے اسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی تصویر اتار لی۔

اس کی سمجھ میں یہ کچھ نہ آیا۔ وہ درخت سے نیچے کود آئی اور میرے قریب آکر کیمرہ کو غور سے دیکھنے لگی۔

"یہ کیمرہ ہے، اس سے تصویر کھینچی جاتی ہے" میں اسے سمجھانے لگا۔

"تصویر!" اور وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ شاید اس کے ذہن میں گاؤں کے کسی میلے کے سفری فوٹوگرافر کی دکان گھوم گئی ہوگی۔ وہ اور زیادہ حیرت سے کیمرہ کو گھورنے لگی۔

"اس سے میں نے تمہاری تصویر کھینچی ہے"

"میری تصویر؟ .... مجھ سے کہے بنا؟!" شرم سے اس کے گالوں کی رنگت ایسی ہی ہو گئی جیسی اس وقت مغرب کی طرف آسمان کی ہو رہی تھی۔

"تو اس میں ہرج کونسا ہے؟" —— اور میں اس کے ہاتھوں سے گری ہوئی درانتی لیکر درخت سے پتے توڑنے لگا۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں بڑی تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ شاید وہ سوچ رہی تھی "ہاں! اس میں ہرج کونسا ہے!" . . . . اور پھر وہ اپنے میلے اور ننگے پیروں اور کرتے کے پھٹے ہوئے

حصوں کو دیکھنے لگی۔
"مگر میری تصویر کا تم کیا کروگے؟!" اس کا غصہ اور شرم اب ایک قسم کی دبی ہوئی خوشی میں ڈھلنے لگے تھے۔
"میں اسے اخبار میں بھیجوں گا"
"اخبار ——— ؟"
"ہاں۔ تمہاری تصویر چھپے گی، سب لوگ دیکھیں گے، تمہاری تعریف کریں گے اور ..... مجھے انعام ملے گا ....."
اس کی پلکوں کی حرکت اب اور تیز ہوگئی تھی۔ "مگر تصویر تو میری ہے، انعام تمہیں کیوں ملیگا؟"
اس کو ہونٹوں پر شاید مسکراہٹ پھیلنے کی کوشش کر رہی تھی جسے وہ بمشکل روک سکی تھی۔ میں سٹ پٹا گیا۔
اب اسے کیسے سمجھاؤں کہ یہ یوں ہی ہوتا ہے۔
"بھئی کھینچی تو میں نے ہے! ..... اس لئے انعام مجھی کو ملے گا۔"
"واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی، تصویر میری اور ..... انعام تمہیں ملے!" اس کی بے چین آنکھیں مسکرانے لگیں۔
"دیکھو نا ـــ یہ کیمرہ میرا، اس کے اندر کا فلم میرا، اور پھر محنت کرکے تصویر اتارنے والا بھی میں ..... انعام تو ....."
"مگر تصویر کھنچوانے والی میں، میں نہ ہوتی تو تصویر کس کی اتارتے؟"
"اچھا بھئی، انعام ملے گا تو سارا کا سارا تمہیں لادوں گا۔
میں ہنس پڑا، ساتھ ہی اتنی دیر سے اس کے ہونٹوں پر مچلتی ہوئی مسکراہٹ بھی ہنسی میں تبدیل ہوگئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ماحول کے ذرے ذرے نے ایک قہقہہ لگایا ہے۔
"تم چرواہی ہو؟"
"ہاں"
"تو تمہاری بھیڑیں، بکریاں کہاں ہیں؟"
"انہیں میرا بھائی لے جاتا ہے، میں روز شام کو تھوڑے سے پتے اکھٹے کرکے ان کے بچوں کے لئے لیجاتی ہوں۔" اس نے توڑے ہوئے پتے جمع کرتے ہوئے کہا۔ میں جاکر اپنی سائیکل اٹھا لایا ـــ
"تمہارا گاؤں کون سا ہے؟" میں نے کیمرہ سائیکل سے باندھتے ہوئے پوچھا۔
"وہ رہا سامنے، چندر نگر"

"تو چلو ۔۔۔ میرا راستہ بھی وہیں سے جاتا ہے"

اور وہ پتوں کا گٹھا سر پر رکھے میرے ساتھ ساتھ پہاڑی پر سے اترنے لگی۔ ہمارے چلنے سے پگڈنڈی پر بیٹھے ہوئے جنگل کے کیڑے مکوڑے پھدک پھدک کر برابر کی جھاڑیوں میں چھپتے جا رہے تھے آسمان کی سرخی اب سیاہی میں بدلنے لگی تھی۔

سائیکل کا بریک دبا کر میں نے اتار پر سے اترتے ہوئے اس کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے میں چرواہی کی طرف دیکھ لیتا۔ میری نظریں اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھ کر وہ اپنی نظریں زمین میں گاڑ دیتی۔ لیکن جب میں بہت دور افق کے قریب ابھرے ہوئے پہاڑوں کا ایک سلسلہ دیکھنے لگتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھے گھور رہی ہے ۔۔۔ اور کچھ دیر ہم اسی طرح چلتے رہے۔

"تم نے اپنی تصویر اس سے پہلے بھی کبھی کھنچوائی ہے؟" خاموشی ناخوشگوار ہو چلی تھی۔

"نہیں" اور نفی میں اپنا سر بھی ہلا دیا۔

"تو یہ تمہاری پہلی تصویر ہے" جیسے میں اپنے آپ سے کہا "اب کی مرتبہ شہر سے آؤں گا۔ تو تمہاری یہ تصویر تمہیں دے جاؤں گا"



"ابھی کیوں نہ دے دو؟!" اس کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

میں ہنس پڑا "ابھی تو اسے بہت دن لگیں گے۔ شہر جا کر بنانی پڑے گی" لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اسے اس کا یقین نہ آسکا۔

"شہر میں نوکر ہو؟" بڑی دیر بعد اس نے ایک سوال کیا۔

"نہیں تو پڑھتا ہوں..... بی۔ اے میں"

"بی۔ اے؟" اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا "یہ .... بی۔ اے کیا ہوا؟!"

"بی۔ اے ..... ہم .... یوں سمجھ جاؤ یہ بی۔ اے ایک کھیت ہے جس کی پیداوار دفتروں میں بھیجی جاتی ہے"

"دفتر؟؟" اور اس دفعہ وہ پوری کی پوری ایک سوالیہ نشان تھی۔

"ہاں .... آں ۔۔۔ یہ دفتر ایک پتھر ہوتا ہے جہاں آدمی سر پھوڑ پھوڑ کر مر جاتے ہیں"

"اپنی خوشی سے؟"

"ہاں۔ اور کیا!" لیکن اس کا اطمینان نہ ہو سکا۔

پتوں کا گٹھا اب اس نے سر سے اتار کر کندھے پر رکھ لیا تھا۔ ہم اتنے قریب قریب چل رہے

تھے کہ ہوا کے ایک جھونکے سے اس کے بال اڑ کر میرے چہرے پر آ گرے۔

"دیکھو تو، تمہارے بال کس قدر ملائم ہیں۔۔ ریشم کے تار جیسے ...... مگر تم نے انہیں برباد کر رکھا ہے"! اور اس نے اپنے منتشر بال پھر اکٹھے کر لئے۔ "کبھی کنگھی بھی کرتی ہو؟" لیکن وہ خاموش رہی۔ جواب اس کے بالوں کی حالت سے خود ظاہر تھا۔

اب ہم پہاڑی سے اتر آئے تھے۔ ایک کچا راستہ اس کے گاؤں کو جاتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کے گاؤں تک پیدل جاؤں، وہاں سے بائیں ہاتھ کو مڑ کر پھر سڑک پر ہولوں گا۔ چلتے چلتے دفعتاً ایک خیال ذہن میں آ گیا۔ اس کی طرف مڑ کر کہنے لگا "آؤ تمہیں سائیکل کی سیر کرادوں!"

وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ کوئی جواب بن نہ پڑا۔ دل میں ضرور چاہتی ہوگی مگر ظاہر اکیسے کہتی۔

"اونہوں۔ گاؤں کا کوئی آدمی دیکھ لیگا ..... تو ... ؟"

"لیکن میں تمہیں گاؤں شروع ہونے سے پہلے ہی اتار دوں گا ــــ آؤ، آؤ ... " اور میں نے اسے کچھ اور کہنے یا سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کو سہارا دے کر آگے بٹھایا۔ پتوں کا گٹھا اس نے آگے ہینڈل پر رکھ دیا۔ اتنی دیر ستانے سے نئی قوت آ گئی تھی، سائیکل پوری رفتار پر چھوڑ دی۔

سڑک بہت خراب حالت میں تھی۔ بار بار سائیکل اچک جاتی اور اس کا سر میرے سینے سے ٹکرا تا۔ اس کے نرم نرم بال چہرے پر پھیل کر گدگدیاں کرنے لگتے اور ساتھ ہی وہ اور سکڑ جاتی۔ ایک جگہ سڑک کچھ ہموار تھی۔ میں سائیکل اور زور سے چلانے لگا۔ سامنے سے آتے ہوئے ہوا کے زور کے جھونکوں سے شائد اس کے پیٹ میں گدگدی ہو رہی تھی۔ اس کی ہر منٹ کی بے چینی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے ہنسی روک رہی ہے۔ بالآخر ہار تھک کر بولی۔

"بس بس، اب روکو بھی ..... میرے گدگدیاں ہو رہی ہیں" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا خون چہرے پر جمع ہو گیا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے ہینڈل کو مضبوطی سے تھامے ہوئے وہ کہے جا رہی تھی "... میں ..... ارے، ارے .... مجھے ہول آ رہا ہے .... مجھے اتار دو .... مجھے" لیکن میں نے رفتار اور بڑھا دی "اوہ .... روکو، روکو .... نہیں تو میں کود جاؤں گی"! اس کی بے چینی اب بہت بڑھ گئی تھی۔

میں نے سائیکل روک لی۔ وہ کود کر اتر آئی۔ ایک دفعہ آنکھوں کے گوشوں سے جھانک کر میری طرف دیکھا .. ان ہی بے چین نظروں سے، اور پھر یکایک کھل کھلا کر ہنس پڑی معلوم نہیں کیوں!

اس کا گاؤں اب بہت قریب آگیا تھا۔ میں نے کوٹ کا کالر وغیرہ درست کر لیا اور اس پر ایک آخری نظر ڈال کر سائیکل آگے بڑھا دی۔ وہ ایک درخت کے نیچے گٹھا زمین پر ڈالے میری طرف گھور رہی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں ..... جانے کیا؟

کچھ دور جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ وہیں کھڑی اب تک مجھے گھور رہی تھی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا، وہ ویسے ہی کھڑی تھی۔ پھر ایک مرتبہ میں نے مڑ کر دیکھا، اور پھر ایک مرتبہ اور...... اور وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ لیکن میرے پیر پیڈل پر حلقے بناتے رہے اور ہم میں فاصلہ بڑھتا ہی رہا۔ کئی بار دل نے کہا کہ ایک دفعہ واپس لوٹ چل۔ لیکن میں آگے ہی بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک موڑ پر وہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ اور پھر میں تیزی سے سائیکل چلانے لگا۔ سات میل منٹوں میں طے کر کے میں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ لیکن راستہ بھر مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے دو بڑی بڑی مضطرب سی آنکھیں میرا تعاقب کرتی رہیں، جیسے وہ آنکھیں کچھ کہتی رہیں، اور جیسے میں ان نظروں کی پہنچ سے باہر نہ نکل سکوں گا۔

اور پھر دو دن بعد جب میں واپس شہر جا رہا تھا تو چندر نگر کے قریب سڑک سے ہٹ کر میں کچے راستے پر ہو لیا..... ہاں غیر اختیاری طور پر ہی! صبح کے کوئی سات یا آٹھ بجے کا وقت تھا۔ میں گاؤں کے بالکل قریب سے گذر رہا تھا۔ کوئی پچاس ساٹھ جھونپڑوں کا معمولی سا گاؤں تھا جھونپڑیاں پار کر کے میں دوسرے کنارے پر پہنچ گیا لیکن وہ نظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر میں دائیں جانب پہاڑی کی طرف مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ نظر آ گئی۔ وہ سامنے کھیتوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ آگے آگے بکری کے دو سفید بچے کلیلیں کرتے دوڑتے آ رہے تھے اس وقت وہ ایک زرد رنگ کا کرتا پہنے ہوئے تھی جو پہلے کی بہ نسبت بہت بہتر حالت میں تھا اور اس کے بال ادھر ادھر اڑنے کی بجائے ایک جگہ محنت سے بندھے ہوئے تھے، شاید ان میں تیل ڈال کر کنگھی بھی کی گئی تھی وہ اس وقت بڑی خوش نظر آ رہی تھی اور بکری کے دونوں بچوں کے پیچھے انہی کی طرح قلانچیں بھرتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔

لیکن میں ایک عجیب سے نامعلوم جذبے کے تحت ایک جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ میں نے ایسا کیوں کیا، یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم! لیکن وہ میرے پاس سے گذری چلی گئی اور میں سائیکل تھامے جھاڑی کے پیچھے کھڑا رہا۔ وہی بے چین آنکھیں اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں ..... شاید۔ لیکن میں انہیں اچھی طرح نہ دیکھ سکا تھا۔

اس کے بعد میں چلا گیا۔ پہاڑی کے دامن سے، کھیتوں کے بیچ میں سے، گاؤں کے پاس سے

اور باغوں کے کنارے سے، جہاں کہیں سے میں گذرا، ایک سوال بار بار میرے ذہن میں گھومتا رہا — اس نے وہ بال کیوں گوندھ رکھے تھے؟ — کیا — کیا — ؟! لیکن میں یہاں آکر رک جاتا اور پھر شروع سے سوچنے لگتا۔

شہر پہنچا تو کچھ دن اور اسی سوال کو دہراتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ میں اس واقعہ کو بھول گیا، اس سفر کو بھول گیا، اس پہاڑی کو بھول گیا، اس چرواہی کو بھول گیا ...... وہ سوال بھی میرے ذہن میں جانے کہاں دفن ہو گیا! بی۔ اے کا امتحان دے کر جب میں لاری میں اپنے گاؤں جا رہا تھا تو چندر نگر کے قریب سے بھی گذرا تھا۔ لیکن میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ مجھے یاد ہے، لاری میں کسی دوست کے ساتھ باتوں میں ایسا محو تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کب چندر نگر آیا اور کیسا گذر گیا ...... اور پھر ہر بار ایسا ہی ہوتا رہا۔

ہاں، وہ تصویریں میں نے دھلوا کر اپنے البم میں لگوائی تھی جو آج تک ویسی ہی پڑی ہے۔ آج پرسوں بعد اپنا البم دیکھ رہا تھا کہ اچانک نظروں کے سامنے وہ تصویر آگئی اور میرے ذہن کے سارے تار جیسے کسی نے جھنجھلا ڈالے۔ اس واقعہ کی یاد ذہن کی سب سے نچلی تہہ سے ابھر آئی اور پھر میں البم کا وہ صفحہ الٹ نہ سکا ...... جانے وہ اب کہاں ہو، کیسی ہو، ...... شائد اب پھر اس کے بال بکھر گئے ہوں، اس کی وہ آنکھیں، اب کچھ نہ کہتی ہوں، ...... یا شائد اب بھی وہ کچھ کہتی ہوں ...... کون جانے!

غلام جیلانی

ام۔ ایس۔ سی (ابتدائی)

# زبانِ فارسی کا اثر زبانِ اُردو پر[1]

معزز حاضرین! مجھے اس بات کی بڑی مسرت ہے کہ میں آج آپ حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل کر رہا ہوں، یہ موقع آپ نے میرے لئے فراہم کیا، اور اپنے پراگندہ خیالات آپ کے سامنے پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی، جس کے لئے میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں، میرے آج کے خطبہ کا عنوان "زبانِ فارسی کا اثر زبانِ اردو پر" ہے، اس موضوع کی وضاحت کے لئے مختصر طور پر یہ بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ زبانِ اردو کس زمانے میں، کن حالات میں اور کہاں وجود میں آئی؟ زبانِ اردو کی جنم بھومی کے متعلق مختلف نظریات ہیں، لیکن سب میں اس امرِ واقعہ کو تسلیم کیا گیا ہے کہ اردو ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل ملاپ کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اس چیز کے معلوم کرنے کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ مسلمان ہندستان کے کس خطۂ زمین پر پہلی مرتبہ وارد ہوئے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ۹۲ھ میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا، اور وہاں عربوں کی حکومت قائم ہوئی، عربوں اور سندھ کے باشندوں میں باہمی گفتگو، ربط ضبط، دین لین اور خرید و فروخت کیلئے کوئی زبان ضروری تھی اس لیے فاتحین کی زبانِ عربی اور مفتوحین کی زبان شورسینی یا برج بھاشا کے امتزاج کا قدرتی نتیجہ "اردو" کی شکل میں نکلا، لیکن جب اردو زبان کی ساخت اور اجزائے ترکیبی پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو پر عربی زبان کا اتنا گہرا اثر نہیں ہے جتنا کہ فارسی زبان کا ہے، اور جو عربی الفاظ اردو میں پائے جاتے ہیں وہ راست عربی سے اردو میں نہیں آئے بلکہ فارسی زبان

[1] یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کا خطبہ صدارت ہے جو جلسہ سالانہ بزم فارسی اردو مارٹن کالج ناگپور یونیورسٹی میں پڑھا گیا تھا۔ مدیر

کے ذریعے سے اردو میں داخل ہوئے تھے یعنی وہی عربی الفاظ جو فارسی میں مستعمل تھے اردو میں بھی استعمال کیے گئے" اس سے محققین لسانیات اس نتیجہ پر پہنچے کہ اردو برج بھاشا اور عربی سے نہیں بنی اور اس کی ابتدا سندھ میں نہیں ہوئی۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ عرب مسلمان جنوبی ہند کے ساحل مالابار اور کرناٹک وغیرہ پر بعنوان تجارت و تبلیغ اترے، انھوں نے اپنی انتھک کوشش، حسن اخلاق، رواداری، راستبازی اور خوش معاملگی سے مقامی ہندو باشندوں میں اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور تجارت کے ساتھ ساتھ اشاعت مذہب اسلام کا بھی کام انجام دیتے رہے۔ رفتہ رفتہ عرب مسلمان جنوبی ہندوستان کے اندرونی علاقہ میں دور دور تک پھیل گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، مکانات، مساجد، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کیں، اور خوش حال زندگی بسر کرنے لگے، اس کی تفصیل مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے بخوبی واضح ہوتی ہے، جس نے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں سفر ہندوستان اختیار کیا تھا وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"ہنور (نام مقام صوبہ بمبئی) میں فقیہ اسمٰعیل کلام اللہ پڑھاتے ہیں، وہ نہایت متقی، خوش خلق اور سخی ہیں اس شہر کا قاضی نورالدین علی ہے، یہاں کی عورتیں باعصمت ہوتی ہیں اور سب کی سب حافظ قرآن ہیں، اس شہر میں تیرہ مدرسے لڑکیوں کے اور تیئیس لڑکوں کے ہیں، یہاں کا بادشاہ جمال الدین ہے اس کو مالابار کے لوگ ایک معینہ خراج ادا کرتے ہیں، یہ بادشاہ بڑا نیک بخت ہے ہمیشہ باجماعت نماز پڑھتا ہے"



یہاں کی زبان کے متعلق یہ امر قابل غور ہوجاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے جنوبی ہند میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور مقامی باشندوں سے میل جول بڑھا، خرید و فروخت و اشاعت مذہب ہونے لگی تو لازمی طور پر کوئی تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوگا، مسلمانوں نے اپنی چیزوں کے خاص اپنی زبان کے نام کہے ہوں گے، قیمتیں تبلائی ہوں گی اور مقامی باشندوں نے اوڑیا، تامل اور تلگو وغیرہ میں سوال جواب کئے ہوں گے، رفتہ رفتہ بعض الفاظ دونوں کی سمجھ میں آکر استعمال ہونے لگے ہوں گے، اس طرح عربوں اور ہندوؤں کی زبانوں سے ایک نئی زبان وجود میں آئی ہوگی جس کا نام "اردو" ہوگا لیکن اس کے متعلق بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو سندھ میں بننے والی زبان کے متعلق پیدا ہوا تھا، یعنی یہ کہ اردو پر عربی زبان کا راست اثر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ اردو پنجاب میں وجود میں آئی کیونکہ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر

شمال کی طرف سے متعدد حملے کئے تھے جس طرح دو ہزار سال قبل آریائی قوم وسط ایشیا سے شمالی ہندستان میں داخل ہوئی تھی اور ہندستان کے اصلی باشندوں کو آہستہ آہستہ جنوب کی طرف ڈھکیل دیا تھا۔ آریائی قوم کی زبان سنسکرت تھی جس میں اوستا، ژند یا ژند کے الفاظ مشترک تھے۔ اسوقت ہندستان کے قدیم باشندوں کی زبانیں بھی بولی جاتی تھیں۔ مقامی باشندے سنسکرت کے ثقیل الفاظ کا تلفظ اور اس کی آوازیں ٹھیک طور پر ادا نہیں کرسکتے تھے اس لئے سنسکرت کے بگڑے ہوئے الفاظ سے "پراکرت" بنی، جو آریاؤں اور دراوڑیوں کے میل ملاپ، بات چیت لین دین اور رہنے سہنے سے رفتہ رفتہ وجود میں آئی جس کو دونوں قومیں بولنے اور سمجھنے لگیں اور اس میں ترقی ہوتی گئی۔

لیکن آریاؤں کی ہندستان میں آمد کے ایک عرصہ بعد راجہ بکرماجیت نے جب دیکھا کہ پراکرت پھیلتی جارہی ہے اور سنسکرت کا رواج و اثر کم ہوتا جارہا ہے اس نے پھر اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی اور اس کو عروج حاصل ہوا، مگر پراکرت بھی رائج رہی۔ پراکرت زبان کے متعلق پروفیسر ویبر کی تحقیق یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں ہندستان میں تقریباً بیس پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں جن میں سے زیادہ مشہور پانچ تھیں، شورسینی، مگدھی، مہاراشٹری، جین اور پالی، شورسینی کا دوسرا نام برج بھاشا تھا، اور وہ بہت زیادہ وسیع رقبہ ہندستان میں سندھ سے بہار اور لاہور سے دہلی آگرہ اور مالوہ تک بولی جاتی تھی۔

بہرحال جب محمود غزنوی نے چوتھی صدی ہجری میں ہندستان پر متعدد حملے کئے تو اسوقت فاتحین کے ساتھ فارسی زبان شمالی ہند میں داخل ہونی شروع ہوئی، محمود کی فوج ایرانی، افغانی اور ترکی اشخاص پر مشتمل تھی، جن کی زبان فارسی تھی، ہزارہا سپاہیوں اور ہمراہیوں کو اپنے مایحتاج کی تکمیل کے لئے مقامی باشندوں سے ربط و ضبط قائم رکھنا، اپنا مافی الضمیر انہیں سمجھانا اور ان کا منشا، خود سمجھنا ناگزیر تھا، اس لئے فاتحین نے اپنے خاص الفاظ استعمال کئے مخصوصاً ایسے کھانے، پینے، لباس اور مذہبی اشیاء کے نام جو سنسکرت اور پراکرت میں نہیں تھے اور بجز خاص الفاظ فارسی ان کا مفہوم ادا نہیں ہوسکتا اور سمجھا نہیں جاسکتا تھا انہیں سکھائے۔ اور دیسی زبان کے الفاظ جو خاص مفہوم رکھتے تھے خود سیکھے۔

اس طرح فارسی اور پراکرت زبان کے امتزاج سے "اردو" کی داغ بیل پڑی، اور جیسے جیسے فاتحین سرزمین پنجاب میں پھیلتے گئے بلکہ جدھر بھی وہ گئے اس معجون مرکب زبان کو غنیمت سمجھ کر اور اپنے مافی الضمیر

کے اظہار کا واحد ذریعہ جان کر ساتھ لے گئے' اور مقامی باشندے بھی اس میں کچھ اپنی زبان کی جھلک دیکھکر اس کو بنیب خاکر قبول کرنے لگے' اس طرح فاتح و مفتوح دونوں نے اس میں الفاظ و محاورات کا اضافہ کرنا شروع کیا۔

چوتھا نظریہ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق یہ ہے کہ جب مسلمان فاتح شمال کی جانب ہندوستان میں داخل ہوئے اور پنجاب فتح کرنے کے بعد دلی فتح کی تو اس وقت دو آبہ گنگا و جمنا کے علاقہ میں شورسینی یا برج بھاشا صدیوں سے دلی اور آگرہ کے اطراف و اکناف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہوگا' اسی زبان کے کثرت سے الفاظ و محاورات اردو میں پائے جاتے ہیں جب فارسی زبان کے الفاظ' محاورات و روزمرہ اس زبان پر اثر انداز ہونے لگے تو اس میں اثر قبول کر لینے کی اس قدر صلاحیت تھی کہ اس نے بہت جلد فارسی کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا' چنانچہ ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان ڈھلنی شروع ہوئی جو بعد کو "اردو" کے نام سے مشہور ہوئی' اور رفتہ رفتہ ہندوستان کی عام زبان بن گئی' اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ دلی جو اس زبان کا مرکز تھی مغل بادشاہوں کا مستقل پایہ تخت قرار پائی میرامن اور بعض قدیم نثر نگاروں کا یہ خیال کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں' صحیح نہیں ہے لیکن اس حد تک واقعہ ہے کہ اردو کی داغ بیل لشکر میں پڑی در اصل اردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں' ان میں اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی نشو و نما جدا جدا ہوئی' اردو شاہی بازاروں اور لشکروں کے زیر سایہ پرورش پائی اور اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہوگئی' اور ہندی اپنے اصلی ماخذ سنسکرت کی طرف عود کر گئی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کی ادبی اردو اور ادبی ہندی میں بڑا فرق ہوگیا' ابتدا میں اردو سادھی سیدھی اور معمولی ضروریات کی ادائیگی کے لیے کافی تھی اس میں ترقی کے ساتھ ساتھ عربی' فارسی و ترکی کے الفاظ شامل ہوتے گئے اور وہ ادبی زبان بن گئی' چونکہ فارسی الفاظ سننے اور بولنے میں بہت شیریں معلوم ہوتے تھے اس لئے مصنفین نے اپنی کتابوں میں ان کو جدت کے طور پر بے تکلف داخل کرنا شروع کر دیا جو رفتہ رفتہ زبان کا جزو بن گئے۔

علاوہ ازیں فارسی رسم الخط بھی جزئی ترمیم کے ساتھ قدیم ہندوستانی رسم الخط کی جگہ لینے لگا اس لئے کہ فارسی الفاظ فارسی رسم الخط ہی میں صحت اور آسانی کے ساتھ لکھے اور سمجھے جا سکتے تھے البتہ خاص حروف ہندوستانی زبانوں کی خاص آوازوں کے حامل مثلاً ٹ۔ ٹھ' پ' پھ' ڈ۔ ڈھ وغیرہ حروف بھی

میں شامل کر لیے گئے۔ اسی طرح نثر و نظم اردو دونوں فارسی کے زیر اثر رہ گئے اور عروض فارسی کا بھی اردو میں تتبع کیا جانے لگا اور اصناف سخن بھی وہی اپنائے جو فارسی نظم کے تھے یعنی قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ۔ نثر کا بھی یہی حال تھا کہ عبارت کی رنگینی الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم نثر اور فارسی کی جان تھی اردو میں اس کی پوری نقل کی جاتی تھی جو آئندہ مثالوں سے واضح ہوگی، غرض یہ کہ فارسی نے اردو پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اس کو بالکل ہی مغلوب کر دیا اور دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو گئے اور اردو کی صرف و نحو اور قواعد کی کتابیں بھی فارسی طرز پر لکھی گئیں۔

رفتہ رفتہ اردو شاہی زبان قرار پائی اور نتیجتاً مقامی زبان غیر اہم ہو گئی، اور شاہی زبان کی ناقل اور متبع بنی لوگوں کو نئی زبان ضروریات کے تحت مجبور ہو کر سیکھنی پڑی، اور بعض نے شوق سے نئی زبان کو سیکھا کیونکہ ہر نئی چیز میں لذت ہوتی ہے، اور اس کے الفاظ و محاورات دیسی زبان میں داخل کرنے شروع کئے۔ شرفا، و امراء درباری تو فارسی زبان بولنے اور لکھنے لگے، اور دیسی زبان دیہات تک محدود ہو گئی، جدت پسند اشخاص نے نئی زبان کا رخ کیا اور اس کو شوق و ذوق سے سیکھنے لگے، چنانچہ قدیم ہندی شعراء کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے، چند برکوئی کی "پرتھی راج راسو" میں بکثرت فارسی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اس کا سبب یہ بھی ہے کہ دیسی زبان میں وہ وسعت و فراخی نہیں تھی جو ان خیالات کو ادا کر سکتی، اس لیے الفاظ فارسی اور اس کے طرز ادا کو اختیار کرنا پڑا، فارسی تخیل و الفاظ نے ہندی میں بھی سنسکرت اور پراکرت الفاظ کی جگہ لینی شروع کی جو مستقل صورت اختیار کر گئی۔

گرو نانک صاحب کہتے ہیں:

سانس ماس سب جیو تمہارا — تو ہے کھرا پیارا

نانک شاعر ایو کہت ہے — سچے پروردگارا

کبیر داس لکھتے ہیں:

کبیر مہر پہلے ہے کیوں سو سکھ چین ہے کوچ نگارا (نقارہ) سانس کا باجت ہے دن رین

تلسی داس نے رامائن کے ترجمہ میں کتنے عربی فارسی الفاظ لکھے ہیں مثلاً

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ — تلسی داس گریب (غریب) کو کوئی نہ پوچھے بات

سور داس نے سری کرشن جی کے ذکر میں اشعار لکھے ہیں، ان کے ہر شعر میں کوئی لفظ فارسی عربی کا ضرور آگیا ہے۔

دیونہ جات پار اترا آئے — چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)

سنہ ۱۵۰۰ء کے آخر میں سکندر لودہی کے زمانے میں ہندوستان کی کایستھ قوم نے سب سے پہلے فارسی زبان میں مہارت نامہ حاصل کر کے سرکاری دفاتر اور درباروں میں داخل ہونا شروع کیا۔ اس کی وجہ سے فارسی ان کے گھرانوں، خاندانوں، دوست احبابوں اور شناساؤں وغیرہ میں رواج پانے لگی اور ان کے میل جول سے مقامی زبانوں کے الفاظ شاہی درباروں اور دفاتر میں دخل پانے لگے، اس طرح اس ملی جلی زبان میں وسعت پیدا ہونے لگی۔

شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں تو مسلمان و ہندو شیر و شکر ہو گئے، ایک دوسرے کے رسم و رواج، عادات و اطوار، بود و باش، بول چال اور باہمی شادی بیاہ کی وجہ سے اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ ایک ہندو وزیر مال کے احکام کی بناء پر ہر سرکاری ملازم کے لئے فارسی زبان کا سیکھنا لازمی قرار پایا، جس کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی، جنھیں ملازمت کا شوق تھا وہ فارسی کی تعلیم حاصل کر کے دفاتر اور دربار شاہی میں داخل ہوتے گئے، فارسی الفاظ و محاورات ان کی زبانوں پر چڑھتے گئے، وہ ان کو اپنی گھریلو زبان میں بھی استعمال کرنے لگے۔ علاوہ ازیں یہ الفاظ فارسی ایسے شیریں تھے کہ سننے میں بہت اچھے معلوم ہوتے اور زور دار بھی تھے، ان کے استعمال کرنے والے تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے جیسا کہ آجکل کے نوجوان انگریزی الفاظ کو رعب ڈالنے اور اپنی قابلیت جتانے کے لئے اردو میں خواہ مخواہ داخل کرتے ہیں، یہ لوگ فاتحوں کی زبان سیکھکر اس پر فخر کرتے اور تصنیف و تالیف بھی فارسی ہی میں کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ آج بھی انگریزی زبان کے متعلق رواج ہے، ابتداءً ہر زبان کا یہی حال ہوتا ہے، جب قدیم باشندگان انگلستان کو نارمن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "انگلو سیکسن" کی بھی "نارمن فرینچ" کے ہاتھوں ٹھیک یہی حالت ہوئی تھی اور جس طرح انگریزی میں دو زبانیں یا بولیاں پائی جاتی تھیں یہی حال اردو ہندی کا ہے۔

شاہجہاں کے عہد حکومت میں فارسی اور برج بھاشا یا مغربی ہندی سے امتزاج پائی ہوئی زبان ایک خاص خطاب "اردو" سے سرفراز ہوئی۔ "اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "بازار لشکر" کے ہیں، یہ زبان اب لشکر کے علاوہ شاہی دربار اور پائے تخت کے قطع نظر اقصائے ہندوستان میں پھیل گئی، اس عہد زریں میں فن تعمیر جس درجہ کمال کو پہنچا اس نے بھی اردو کی ترقی میں بڑی مدد دی، چنانچہ تعمیر کے سلسلہ میں ہندوستان کے دور و دراز شہروں کے ہندسی، معمار، مزدور، اہل حرفہ، تجارت پیشہ غرضکہ ہر فن کے آدمی کسی نہ کسی تقریب سے پائے تخت کی طرف کھنچے چلے آئے، یہاں آکر معاملات، باہمی گفتگو اور خرید و فروخت کی خاطر مقامی بول چال "اردو" سیکھی اور اپنے وطن واپس جاتے ہوئے اردو کے

محاورات اپنے ساتھ لے گئے' ان امور کی وجہ سے اردو کو جلد پھیلنے کے قدرتی اور زریں مواقع ہاتھ آئے اس میں سیاسی و معاشی اثرات کے علاوہ فارسی کی شیرینی نے بھی اشاعت کا بڑا کام دیا' بادشاہوں کی سرپرستی اس کی ترقی میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی' درباروں میں امراء' شعراء و ادبا نے اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی۔

علاء الدین خلجی نے آٹھویں صدی ہجری کی ابتداء میں دکن پر جو حملے کئے ان کی وجہ سے اردو زبان دکن کی طرف بڑھی' اور محمد تغلق نے اپنا پایہ تخت دلی سے دیوگڑھ کو دولت آباد کے نام سے تبدیل کر کے جو منتقل کیا تو اس کے ساتھ کثیر تعداد فوج کے علاوہ علمائے عظام و صوفیائے کرام' اور ان کے متعلقین و متوسلین وغیرہ نے یہیں سکونت اختیار کر لی' اگرچہ بعد میں محمد تغلق نے اپنا پایہ تخت پھر دلی تبدیل کر دیا لیکن بہت سے علماء' صوفیاء و دیگر اصحاب نے دولت آباد میں مستقل قیام کیا' جن کے فیضان علم کے سرچشمے اور روحانی تجلیات نے نہ صرف خطۂ دکن کو منور کر دیا بلکہ اس کی روشنی دور دور تک پھیل گئی' ان کی امداد بڑھی' تبلیغ اسلام ہوئی' اور زبان پھیلتی گئی' اس مخلوط زبان کا نام دکن میں "دکھنی" ہوا' "دکھنی" کی اشاعت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آئی' کیونکہ یہاں کی مقامی زبانیں مرہٹی' تلنگی' اور کنڑی اس سے میل نہیں کھاتی تھیں' اس لئے سرزمین دکن اس کے لئے زیادہ بارآور ثابت ہوئی' البتہ شمال میں اردو کو برج بھاشا کا مقابلہ تھا اس وجہ سے بمقابل دکن کے شمالی ہند میں اس قدر جلد ترقی اس کو نصیب نہیں ہوئی۔

علاوہ ازیں "دکھنی" کو دکن کے قطب شاہیہ فرمانرواؤں کی سرپرستی حاصل رہی اور یہیں وہ پروان چڑھی' اور اردو شاعری کی ابتداء بھی دکن میں ہوئی جس کے کئی دلچسپ اسباب ہیں' اس کے اصل مولد شمال کے بجائے قدیم شعرائے اردو کا گہوارہ دکن ہے' اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا چیلہ حسن تھا' جب وہ اتفاق زمانہ سے بادشاہ بن بیٹھا تو اس نے تبرکاً و تیمناً اپنے گرو کا نام اپنے خاندان کے نام میں شامل کیا' اس کے بعد سے وزارت فینانس فرمانروایان دکن میں ایک ہندو کے سپرد کرنے کا رواج ہوا' جس کی وجہ سے زبان "دکھنی" نے جلد ترقی کی' دوسرا یہ کہ ہندو رعایا اور مسلمان حکمرانوں میں اتحاد و اتفاق بڑھتا گیا' اور ابراہیم عادلشاہ نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دکھنی لوگوں کو اپنی ملازمت دی' اور اب تک جو حسابات فارسی میں رکھے جاتے تھے ہندوؤں کی وجہ سے ہندی میں لکھے جانے لگے' اس سے مقامی زبان کو تقویت پہنچی' کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان بن گئی تھی' علاوہ ازیں ہندوؤں کی تعداد بکثرت بھی

انھوں نے مسلم فرمانرواؤں کو جنگوں میں مدد دی۔ ان دونوں قوموں کے اتحاد و اتفاق کی وجہ سے زبان دکھنی کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مسٹر گریبل نے تاریخ دکن (ج ا صفحہ ۲۹۴) میں لکھا ہے "اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں یعنی جب تک بیجاپور اور گولکنڈہ خود مختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری ہی نہیں بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھی اور یہ حالت برابر قائم رہی یہاں تک کہ زوال سلطنت بیجاپور کے بعد مرہٹوں کے ظلم و تعدی نے اسکا خاتمہ کردیا۔"

اردو زبان دکن میں نویں صدی ہجری سے پہلے ادبی صورت اختیار کر چکی تھی اور اس میں اسی زمانہ سے تصنیف و تالیف کی ابتدا ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے موجودہ معلومات کی رو سے شمالی ہندوستان میں بارھویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بول چال اور لین دین تک محدود رہی۔ بابر سے لیکر عالمگیر کے عہد کی تحریرات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں کی زبانوں پر عربی و فارسی الفاظ چڑھ رہے ہوئے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کی زبان بھی ایک حد تک دیسی زبانوں کے زیر اثر تھی۔ ابوالفضل کے رقعات میں اردو و ہندی کے الفاظ موجود ہیں، شاہجہان کا اردو میں شگفتہ لکھنا اور عالمگیر کا رقعات عالمگیری میں اردو الفاظ کا بے تکلف استعمال صاف پتہ دیتے ہیں کہ اردو ان ادوار میں عام طور پر رائج تھی، بازار سے لیکر شاہی محلات تک میں خاص و عام اس کو سمجھتے اور بولتے تھے۔

عہد عالمگیر سے دلی میں اردو شعر گوئی کا رواج ہوا اور سب سے پہلے فارسی گو شعراء نے اس طرف توجہ کی، شاہ موسوی خاں فطرت، مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا عبدالغنی قبول جو فارسی کے نامور شعراء تھے انھوں نے تفنن طبع کے لئے کبھی فارسی اور اردو کے ملے جلے الفاظ میں شعر کہے، محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں شیخ سعداللہ گلشن، شمس الدین فقیر، سراج الدین علیخان آرزو جیسے صاحب کمال دلی میں موجود تھے، ولی دکھنی بھی کچھ عرصہ کے لئے دلی آئے، ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، ان کا کلام سنکر فارسی گو شعراء کو اردو میں شعر کہنے کا شوق ہوا، یہ مخلوط لشکری زبان "اردوئے معلےٰ" کا معزز خطاب پاکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی، لیکن جہاں بھی گئی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا ذخیرہ اس میں موجود رہا، دلی میں ملا عبدالواسع ہانسوی نے اردو ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا جس کا نام غرائب اللغات رکھا، اردو الفاظ کے معنی فارسی

میں لکھے، سراج الدین علیخان آرزو نے اس لغات کی نظر ثانی اور اضافہ و ترمیم کی اور اس کو نوادر الالفاظ کے نام سے موسوم کیا۔

جو شاہ راہ ولی نے دکن میں دکھلائی تھی اس کے پیرو دلی میں بہت پیدا ہوگئے، آبرو، حاتم، مظہر جانجاناں وغیرہ جو ولی کے ہمعصر اور فارسی کے اچھے شاعر تھے، نونہالِ اردو کی پرورش انہیں کے آغوش تربیت میں ہوئی۔ لیکن اس زمانہ میں نہ تو کوئی خاص طرز اردو شاعری مقرر ہوئی تھی اور نہ زبان اس کے لئے خاص تھی، بہت سے ہندی دکھنی الفاظ و محاورات جو کلام ولی میں پائے جاتے تھے ان کی تبدیلی، صفائی ان بزرگوں نے کی، یہ مشکل کام انہوں نے نہایت عمدگی اور جانکاہی سے انجام دیا، اس تراش خراش کے بعد انہوں نے ہندی کے الفاظ و محاورات کی بجائے فارسی کے خوشنما محاورے اور دلکش ترکیبیں اردو میں داخل کیں، چونکہ اردو میں لوچ اور قوت جذب موجود تھی اس لئے اس نے یہ تصرفات بآسانی قبول کر لئے۔

ابتدائی دور میں صنعت ایہام بہت مقبول ہوئی، آبرو، حاتم، وغیرہ نے اس کو بہت استعمال کیا مگر سودا، میر، میر درد اور تمام و غیرہ نے بعد میں اس کو بالکل خارج کر دیا۔

167

تصوف زبان اردو کے ابتدائی دور کی دوسری خصوصیت ہے، شاعری پر تصوف کا رنگ بہت غالب اور عالمگیر تھا کیونکہ اکثر شعراء صوفی مشرب تھے، پیری مریدی کا بازار گرم تھا، متاخرین کے دور میں فارسی شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی تھی، اور اردو شاعری اس کی ناقل تھی اسی وجہ سے اردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ چڑھ گیا۔

اس دور میں سنسکرت، بھاشا اور قدیم دکھنی الفاظ کا اخراج ہوا، میر اور سودا کے زمانہ میں بھی یہ عمل جاری رہا اور ناسخ کے عہد تک اس کی تکمیل ہوتی رہی، یہ لوگ "مصلحین زبان" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے بھونڈے الفاظ بھاشا کے خارج کر کے عربی اور فارسی کے مترادف الفاظ قبول کر لئے، اور ان الفاظ کی صحت کا خیال بھی ہونے لگا، قدیم الفاظ و محاورے جو ولی کے زمانہ میں مستعمل تھے، ان میں تغیرات پیدا کرنے لگے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی۔ تاریخ شعرائے اردو کی عبارت درج ذیل ہے جس سے واضح ہوگا کہ اس عبارت میں کس قدر فارسی الفاظ موجود ہیں اور اردو کا کیا ڈھنگ ہے لکھتے ہیں:۔

"مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے، نہ صرف اسکا کلام میں بلکہ اس کے ہم عہدوں کے کلام میں اس سے

زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ ان کے "دیوان زادہ" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے"

دہلی میں میرؔ اور سوداؔ کا زمانہ اردو شاعری کا عہد زرین تھا، اسی زمانے میں وہ معراج ترقی پر پہنچ گئی، میر حسنؔ، میر دردؔ اور سوداؔ جیسے صاحب کمال عالم وجود میں آئے جن کے نام، زبانِ اردو جب تک زندہ رہے گی، زندہ جاوید رہیں گے، مثنوی سحر البیانِ میر حسنؔ، قصاید سوداؔ، غزلیات میرؔ اور میر دردؔ لاجواب ہیں، یہ استادان کامل اپنے فن میں عدیم النظیر ہوئے ہیں، اور اپنا کلام آئندہ نسلوں کے لیئے ایک بے مثل معیار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں، یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی حقیقی وقعت علمی دنیا میں کبھی کم نہ ہوگی، بڑے بڑے اساتذۂ فن جو بعد میں گزرے ہیں مثلاً ذوقؔ، غالبؔ، ناسخؔ اور آتشؔ، وغیرہ سب نے ان کا لوہا مانا ہے، اور ان کی استادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل ہیں چنانچہ ذوقؔ لکھتے ہیں:۔

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا ۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

بقول آتشؔ:۔

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سوداؔ کا جواب ۔ ہاں تتبع کرتے ہیں آتشؔ ہم اس مغفور کا

غالبؔ کہتے ہیں:۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ ۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

اس زمانہ میں فارسیت کا بڑا غلبہ تھا، میرؔ، سوداؔ اور دوسرے استادان فن نے اپنے پیشروؤں کی نقل کی، شاہ حاتمؔ، اور میر دردؔ وغیرہ نے اپنے کلام سے ہندی الفاظ نکال ڈالے، ان تغیرات کی فہرست صفیر بلگرامی نے "تذکرۂ جلوۂ خضر" کی جلد اول میں لکھی ہے، جس کو "شعر الہند" میں نقل کیا ہے، اس کی عبارت یہ ہے:۔

"ان اصلاحات کے بعد اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعراء نے بالکل ایرانی شعراء کے طرز میں کہنا شروع کیا چنانچہ میرؔ لکھتے ہیں، تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ" سوداؔ و میرؔ نے سعدیؔ و حافظؔ سے استفادہ کیا اور ان کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا، اس زمانہ میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعرائے فارسی ناصر علی سرہندی، جلال۔ اسیرؔ، کلیمؔ اور بیدلؔ کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔ لیکن خوش مذاق شعراء نے طالب آملی، شفائی وغیرہ کی روش اختیار کی۔ ان تصریحات کے علاوہ خود ان شعراء کے کلام کی

ان شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے متاخرین شعراء فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھکر شاعری شروع کی ہے چنانچہ سودا، میر، درد وغیرہ نے اس دور کے متعدد شعرائے فارسی مثل صائب، بیدل، نظیری، عرفی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا، اس لئے ان کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے" سودا نے بالخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کئے جو مستقل طور پر اسی کے ہوگئے، میر نے بھی خزانہ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالا مال کر دیا۔

شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا اور مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے اردو میں دینیات کے رسالے لکھے ۱۸۳۵ء میں دفاتر سرکاری میں بھی اردو استعمال ہونی شروع ہوئی اردو میں اخبار بھی نکلنے لگا، اس طرح اردو کو فروغ ہونے لگا لیکن بول چال کی اردو اور ادبی اردو میں بہت فرق رہا، سادہ اور روزمرہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھے ہوئے تھے تحریر میں آتے وقت فارسی الفاظ سے بدل جاتے تھے جس کی وجہ ان کی عظمت اور شان و شکوہ تھی، ابتداء میں اردو اپنی کم مائگی کی وجہ سے ادبی زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اس پر جلا نہیں آئی تھی بھونڈا پن نظر آتا تھا نہ اس میں اس قدر صلاحیت تھی کہ اس میں نازک اور باریک خیالات ادا ہوسکتے یا مختلف خیالات کا اظہار عمدگی کے ساتھ کیا جا سکتا، لیکن اس میں جو ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی اس کی وجہ سے جو الفاظ و بندشیں اس کو ملتی گئیں وہ اس میں شامل ہوتی رہیں، رفتہ رفتہ زبان میں صفائی اور پختگی آتی گئی، دور اول کے شعراء ایسی زبان لکھتے تھے جس میں فارسی و عربی غالب اور اردو کم ہوتی تھی اس لئے فارسی و عربی کے الفاظ و ترکیبیں اردو میں ایسی گھل مل گئیں کہ ان کا تمیز مشکل ہوگیا، زبان کے اس جزو کو اب ہم نکال نہیں سکتے، بعض حضرات جو اس زمانہ میں سنسکرت کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو زبان سے نکالنے کی سعی کر رہے ہیں ہماری رائے میں یہ فعل عبث ہے کیونکہ یہی کثرت الفاظ جو اردو کا مایۂ ناز ہیں اردو کو اس قدر لچکدار اور مستحکم بنائے ہوئے ہیں کہ ہر ادبی کام اسکے ذریعہ پورا ہوسکتا ہے۔

فارسی نے اردو پر اسقدر غلبہ پایا کہ اس کا تمام ماحول ہی بدل گیا الفاظ محاورے اور تلمیحین وغیرہ سب فارسی کے اردو میں داخل ہوگئے۔ اس حقیقت کو ہم ذیل کی چند مثالوں سے واضح کرینگے۔ مثلاً الفاظ شمع، سرو وغیرہ۔ اردو میں جو تلمیحات لائی جاتیں تو وہ سبھی تاریخ ایران کی ہوتیں جیسے خسرو شیریں کا قصہ سہراب و رستم کی نبرد ازمائی مانی و بہزاد کی مصوری، رستم و اسفندیار کی بہادری جوئے شیر قصر شیریں وغیرہ

گل و بلبل بھی ایران کے ہوتے۔ دریا و پہاڑ کے نام بھی ایرانی لائے جاتے مثلاً دریائے جیحون و سیحون کوہ الوند والبرز بے ستون وغیرہ۔

اگرچہ ایک زبان کے محاورہ کا ترجمہ دوسری زبان میں کرنا جائز نہیں مگر اردو و فارسی میں اتنا اختلاط بڑھا کہ یہ امتیاز بھی جاتا رہا۔ کار آمد خیالات و محاورات کا دلکش انداز میں فارسی سے اردو میں ترجمہ کر لیا گیا جس کے چند نمونے یہ ہیں:

برآمدن و بسر آمدن۔ سودا کہتے ہیں:

اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ برآئے ÷ انجم کو یہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آئے

عرق عرق شدن، آب شدن۔ بقول ذوق:

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی ÷ جب یہ عاصی عرق شرم میں تر جائینگے

حرف آمدن و دل خون شدن۔ ذوق:

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے ÷ اس درد سے عقیق کا دل خون ہی میں ہے

چشمک زدن، ذوق کہتے ہیں:

۱۵۶

لب پر ترے پسینہ کی بوندائے عقیق لب ÷ چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ

از جامہ بیرون شدن، بقول سودا:

نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھ ان دنوں رقیب ÷ تھوڑے ہی دم دلاسے میں تنا بچھ چلا

دل از دست رفتن، سودا:

ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھ محبوبان کی چال

از سر چیزے گذشتن: دست بردار ہونا، انشاء کہتے ہیں:

خدا کے واسطے گزرا میں ایسے جینے سے

فارسی کی اضافت نے بھی اردو آسان کر دی اور 'کا' 'کی' 'کے' کو کم کر دیا۔

فارسی کی تشبیہات و استعارات نے زبان اردو کو مرصع کر دیا، جس سے خیالات کی نزاکت، ترکیبوں کی چستی اور زور کلام پیدا ہو گیا اور نئے الفاظ، نئی ترکیبوں اور تلمیحوں نے زبان اردو میں وسعت پیدا کر دی۔

مرزا غالب اور سر سید احمد خاں کے زمانہ سے اس میں تغیر شروع ہوا، سادگی اور بے تکلف عبارت نے رنگینی اور مقفیٰ عبارت کی جگہ لی، کیونکہ زمانہ اسی کا متقاضی تھا، اور یہ عام فہم ہونیکی وجہ سے

زیادہ مرغوب اور ہر دلعزیز ہوئی جو ابیات بھی فارسی الفاظ بکثرت موجود تھے لیکن وہ زبان اُردو میں گھل مل گئے تھے اور ان سے تصنع نہیں معلوم ہوتا تھا، ہندی الفاظ بھی استعمال ہوئے لیکن اس حد تک کہ فارسی الفاظ و محاورے کے ساتھ وہ میل کھاتے ہوں'

دنیا کے تقریباً تمام ادبوں کی ابتداء شاعری سے ہوئی، شعر ایک ایسی زبردست قوت ہے جس کا وجود نثر سے پہلے ہوتا ہے، انسان میں قافیہ پیمائی اور تک بندی فطری چیز ہے، اس کو پہلے جذبات کا احساس ہوتا ہے اثر کے نتیجہ پر وہ دماغ کو متحرک کرتا ہے، غور و تامل میں منہمک ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ تہذیب انسانی میں شعر جو مظہر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے' اور غور و فکر دماغ کا نتیجہ ہے، کسی قوم میں ایجاد تحریر سے قبل ہی شعر اپنے لطف و اثر کی وجہ سے دماغوں میں محفوظ رہ سکتے تھے گو نثر اظہار خیالات و گفتگو کا بظاہر آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے' مگر بعد غور و خوض اور تجربہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ نثر صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریروں کے واسطے موزوں ہے'

اسی طرح زبان اردو میں بھی نظم کا وجود تحریر میں بہ نسبت نثر کے پہلے ہوا' اور قرین قیاس بھی یہی تھا کیونکہ اردو شاعری دراصل فارسی شاعری کی نقل ہے' جو خیالات اردو بولنے والوں کے دماغوں میں

۱۶۱

پیدا ہوئے انہیں فارسی کے معین و مجرب سانچے ہاتھ آئے اور فارسی کے الفاظ' ترکیبوں' محاورات کے ذریعہ سے ان کی فکر دماغی لوح قرطاس پر ظاہر ہوئی' اور اردو کے شعراء نے ابتداءً اساتذہ فارسی کے کلام کا ترجمہ کیا اور ان کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر پیش کیا' چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے عام طور پر بالطبع مرغوب ہوتی ہے' اس لئے نظم کا وجود اُردو میں یقیناً نثر سے قبل ہوا ہے' اور اس کی زبان بھی بہ نسبت نثر کی زبان کے شاندار اور بلند حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک ہمکو معلوم ہے اُردو کے سب سے پہلے شاعر امیر خسرو دہلوی ۲۵ھ م ۱۳۲۵ء قرار پاتے ہیں' انہوں نے سب سے پہلے اردو الفاظ ادبی طور پر استعمال کئے' ان کی اردو غزل اس ترکیب کی ہے کہ ایک مصرع فارسی کا اور ایک اردو کا ہے' اور بحر فارسی ہے۔

زر گر پسرے چو ماہ پارا ⁜ کچھ گھڑ کے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست ⁜ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

علاوہ ازیں امیر خسرو نے انمل' دوہرے' پہیلیاں لکھیں' اور ایک کتاب خالق باری لکھی جو بہت مشہور ہوئی' اور اس زمانہ کی فارسی اور اردو کا بہترین امتزاج ظاہر کرتی ہے' یہ کتاب قدیم زمانہ میں بچوں کو فارسی سکھانے کیلئے رائج تھی' اس کے اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

بیا برادر آ ورے بھائی　　　نشین اور بیٹھ ری مائی

ان کی غزل کا ایک شعر ہے:

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ　　　سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری تیاں

امیر خسرو کے بعد حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (وفات ۸۲۵ھ) نے اردو زبان میں شعر کہے تھے:

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا دسے　　　جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

یوں کھوئی خودی اپنی خدا سا تہ محمدؐ　　　جب کھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی دسے

یہ امر مسلم ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ اگرچہ ایک مدت تک ولی دکھنی کو اردو شاعری کا "ابوالآبا" اور سب سے پہلا شاعر" تصور کیا جاتا تھا جیسا کہ رودکی فارسی شاعری میں مسلم ہے اور چاسر انگریزی شاعری میں لیکن اب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ولی کے ایک عرصہ پہلے ہی قطب شاہیہ دور میں اردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔

چنانچہ خواجہ صاحبؒ کے بعد دکن میں محمد قلی قطب شاہ (۱۰۲۰ھ) سب سے پہلا صاحب دیوان

۱۶۸

شاعر گزرا ہے، اس کا کلام تمام اصناف سخن قصیدہ، مثنوی، غزل، مراثی اور ترجیع بند وغیرہ پر مشتمل ہے، اشعار کی تعداد پچاس ہزار سے زاید بیان کی جاتی ہے، اُس کے کلام کے مشہور اصناف کے ایک دو شعر (محمد قلی قطب شاہ کے اردو دیوان کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے بڑی تحقیق و جانفشانی سے ایڈٹ کر کے طبع و شائع کیا ہے۔)

نمونتہً پیش کیے جاتے ہیں: لیکن دکھنی میں بجائے فارسی الفاظ کے ہندی الفاظ زیادہ مستعمل ہیں، ان میں کے بعض الفاظ اب تک دکھن کے دیہات میں رائج ہیں محمد قلی قطب شاہ کا تخلص فارسی میں قطب شاہ اور اردو میں معانی تھا، سادگی اور شیرینی ان کے کلام کے جوہر ہیں: کہتے ہیں:

نبی کی دعا تھے برس گانٹھ پایا　　　خوشیاں کی خبر کے دمامے بجایا

پیا ہوں میں حضرت کے ہت آب کوثر　　　تو شاہاں او پر مجھ کاس کر بتایا

خدایا معانیؔ کی امید بر لیا　　　کہ جیوں سانت کی ہیوں تے جگ سب کھایا

ولہ

کرتے ہیں دعوے شعر کا سب اپنی طبع سوں　　　سمجھتا فصیح شعر معانیؔ کے تئیں خدا

قلی قطب شاہ کے بعد سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوئے جن کی وفات ۱۶۲۵ء میں ہوئی، انکے دیوان ہیں، فارسی اور اردو، جو تمام اصناف سخن پہ حاوی ہیں، فارسی میں ظل اللہ اور اردو میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے، کلام میں شیرینی، لطافت اور صفائی پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں:

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ — محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ
دو لب ترے رنگیلے یاقوت کو دے رنگ — ہے بھیک تک عقیقاں رنگین ہوئے یمن میں

عبداللہ قطب شاہ محمد قطب الدین کے بیٹے تھے جن کا ۱۶۷۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کے اشعار صاف اور ستھرے ہیں، زبان میں فارسیت اور صفائی بہ نسبت ان کے پیشروؤں کے زیادہ پائی جاتی ہے لکھتے ہیں:

کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث — آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا
سو مخفی نہیں اس پہ ہیں آشکارا — جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے

اس عہد کے دوسرے مشہور شعراء ابن نشاطی مصنف "پھول بن" ملا غواصی مصنف قصہ "سیف الملوک بدیع الجمال" و "طوطی نامہ" ہیں۔ اس دور کا سب سے زیادہ مشہور شاعر وجہی ہے جس نے نظم و نثر دونوں لکھے، نظم میں اس کی "قطب و مشتری" مشہور ہے اور "سب رس" اردو ادب کی سب سے قدیم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ تحسین الدین نے اسی دور میں ایک مثنوی "کامروپ کلا" لکھی جس کا ہیرو کامروپ شاہ اودھ کا بیٹا اور "کلا" شاہ لنکا کی بیٹی تھی، دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ قصہ کا ہیرو مسلمان اور ہیروئن اور دیگر کردار ہندو تھے، آخر بڑے مصائب جھیلنے کے بعد ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے، اس مثنوی کو گارساں دتاسی نے ۱۸۳۶ء میں قصہ "کامروپ" کے نام سے شائع کیا تھا، یہ بات بھی باعث تعجب و دلچسپی ہے، کہتے ہیں کہ مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے اس کا جرمن زبان میں ترجمہ کرا کے سنا اور اس سے بہت محظوظ ہوا تھا۔

۱۶۹

دکن میں سلطنت عادل شاہی کی بنیاد ۸۹۵ھ میں قائم ہونے سے پہلے ہی وہاں اردو زبان عام ہو گئی تھی، امیر و غریب سب اسی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ سلطنت بہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کی فارسی زبان اردو میں تبدیل کر دی تھی لیکن یوسف عادل شاہ اور اس کے فرزند اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے زمانے میں شاہی دفتر کو بھی فارسی میں منتقل کر دیا، اسی طرح ہر ایک یا دو بادشاہوں کے عہد میں اردو سے فارسی اور فارسی سے اردو بدلتی رہی، غرضکہ سلاطین عادل شاہیہ بھی سلاطین قطب شاہیہ کی طرح علم دوست، تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو

خسرو شاعری اور فن موسیقی کا بڑا شوق تھا' فارسی کا مستند اور بے مثل شاعر ظہوری اسی کے دربار کا گوہر بے بہا ہے اور ملک قمی اسی کے دربار کا ملک الشعرا ہوا ہے' ابراہیم عادل شاہ کو فن موسیقی میں درجہ کمال حاصل تھا چنانچہ اس نے موسیقی پر ایک کتاب "نورس نامہ" لکھی تھی جس میں قواعد و ضوابط موسیقی درج کئے تھے' ملا نورالدین ظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا جو اس وقت سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے' بقول مصنف گل رعنا "موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندستان سے تین چار ہزار گویئے بیجاپور میں جمع کیے گئے' ۱۵۹۹ء میں بیجاپور کے قریب نورس پور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گرد اور چیلوں کے لئے بڑی بڑی محلسرائیں بن کر تیار ہوئیں شاہی محلسرا کا نام نورس محل' شاہی مہر پر نورسی سکہ پر نورس علم و نشان کے نام نورسی' بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا" (جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم ایم' اے فارسی مسمی قمرالدین صاحب نے ایک نہایت جامع مقالہ بڑی محنت و جانفشانی سے ظہوری پر تحریر کیا ہے جس کو درجہ اول کے نشانات حاصل ہوئے ہیں اور ممتحنین نے اس مقالہ کی بڑی تعریف کی ہے' انھوں نے بھی بعد تحقیق اس شہر نورس پور کی بہت تفصیل لکھی ہے۔)



علی عادل شاہ ثانی سنہ ۱۶۵۶ء تا سنہ ۱۶۷۲ء کے دربار میں مشہور شعراء و ادباء جمع تھے' اس بادشاہ کو دکھنی سے خاص دلچسپی تھی اور اس زبان کے شعراء کا بھی بڑا قدر دان تھا' دکھنی زبان کا مشہور شاعر نصرتی اسی کے عہد میں تھا' جس نے ۱۶۶۵ء میں مثنوی علی نامہ لکھی اور ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز ہوا اس کی دوسری مثنوی "گلشن عشق" ہے' رستمی' ہاشمی' شاہ ملک وغیرہ بھی علی عادل شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ تھے۔

جب عالمگیر نے بیجاپور اور گولکنڈہ فتح کر لیا تو ان حکومتوں کا خاتمہ تو ہو گیا' لیکن شعراء نے اردو کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہ آیا' اور دکھنی یا اردو شاعری طول و عرض ملک میں پھیل گئی' اس زمانہ کے مشہور شعراء میں عاجز' و بدی' اور بحری وغیرہ تھے' ولی اورنگ آبادی نہ صرف اس زمانے کا بلکہ دور ما بعد کا بھی زبردست شاعر بلکہ رہبر شمار کیا جاتا ہے' شمالی ہند کے بڑے بڑے شعراء اسکے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں' اور انہوں نے اس کے تقدم و بزرگی کا اعتراف کیا ہے' میر جیسے استاد شاعر نے ولی کے تتبع کا اس طرح اظہار کیا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے  
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولی نے شہدائے کربلا کی مدح میں "دہ مجلس" لکھی تھی' انہوں نے سفر گجرات بھی اختیار کیا تھا'

سورت کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں، ایک مثنوی کے چند شعر یہ ہیں :-

عجب شہروں میں ہے پر نور یک شہر — بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
کہ ہے مشہور اس کا نام سورت — کہ جاوے جسکے دیکھے سب کدورت
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت — ہر اک صورت ہے واں منقول صورت

سادگی، سلاست، صفائی و روانی ولی کے کلام کے جوہر ہیں، بعض شعر تو زمانہ حال کے کسی شاعر کے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً :-

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے — زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے
اب ولی درد سر کبھو نہ رہے — جب ملے صندل و گلاب سخن
تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہونگا — جادو ہے تیرے نین غزالاں سے کہونگا
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی — یہ کشور ایران میں سلیماں سے کہونگا
بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہرگاہ — جلدی سے ترے درد کی درماں سے کہونگا

ولہ

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا — ہے مطالع مطلع انوار کا
آرزوئے چشمہ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار — مدعا ہے چشم گوہر بار کا

ولی کے سنہ انتقال کے متعلق اختلاف ہے ۱۱۵۵ھ، ۱۱۴۲ھ لکھے جاتے ہیں لیکن بمطابقت تحقیق مولوی عبدالحق صاحب ۱۱۱۹ھ ہے۔ شاہ سراج بھی اس دور کے بڑے مشہور شاعر گزرے ہیں، ان کا کلیات "سراج سخن" کے نام سے مع بسیط مقدمہ کے عبدالقادر صاحب سروری سابق ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حال پروفیسر اردو و فارسی جامعہ میسور نے حیدرآباد سے شایع کیا ہے، سراج نے ایک مثنوی بوستان خیال بھی لکھی تھی، ان کا ۱۱۷۷ھ میں انتقال ہوا، ان کی یہ غزل بہت مشہور ہے :-

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی — نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی
شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کوں — نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

سلاطین مغلیہ، قطب شاہیہ اور عادل شاہیہ ادوار کے نظم کے نمونے تو آپ نے دیکھے اب ان

اس دور کی اُردو کے طرز کو بھی ملاحظہ فرمائیے تو واضح ہو جائے گا۔ فارسی الفاظ، محاورات اور ترکیبیں کس کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے وجہی نے ۱۰۴۵ھ میں ایک کتاب سب رس لکھی جو اُردو زبان کی سب سے پہلی ادبی اُردو کی تصنیف سمجھی جاتی ہے، گو اس سے قبل کی نثر قدیم کی عبارتیں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں کوئی مسلسل قصہ اور ادبی حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ سب رس کی مقفیٰ عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"عجب عجب اس کے کام، ان کے کام کیا کر سکے خام (فہم)، پیدا کیا زمین، پیدا کیا آسمان، سب نایان سب دانشمندان حیران، کیا ولی کیا نبی، سجدہ کئے اس ٹھانو (جگہ)، یعنی قادر، قدرت کا دھنی، غنی، مستغنی، ہوتا سب خدا کا بھاتا، ہو کہنے میں ہو جاتا، یاں چرا نہ چون، چون عربی میں لکھتا ہے کن فیکون۔"

۱۱۴۵ھ میں فضلی نے دہ فصل لکھی، یہ کتاب سب رس کی دریافت سے پہلے اردو کی سب سے پہلی کتاب تصور کی جاتی تھی، اس کی عبارت درج ذیل ہے:

"پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل، چاہیے کامل اور مدد کسی طرف کی ہووے شامل، کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی ﷺ صورت پذیر نہ ہووے، ور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آوے۔"

میر تقی میر کی عبارت کے چند جملے درج ہیں:

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالےٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہوا، پس یہ چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامۂ دو زبان اپنی ہیے، صفحہ کاغذ پر تحریر پائے، لازم ہے کہ تحویل سامعہ سخن سنجان روزگار کر دوں تا باقی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین آفرین رہوں۔"

میر کے تیس سال بعد انشاء اللہ خاں اور میرزا جانِ جاناں مظہر کی گفتگو کے چند فقرے یہ ہیں:

انشا کی درخواست مظہر جانجاناں کی خدمت میں:-

"ابتدائے سن صبا سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبہ عالیہ تا بحدے تھا کہ سلک تحریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔"

مرزا مظہر جانجاناں جواب میں فرماتے ہیں: "اِس بے تمیز کو بھی بدو طفولیت سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست باقی ہے۔" اس کے بعد مشہور ادبا و شعرا مثلاً غالب، حالی، شبلی، نذیر احمد، سرسید احمد خاں، حسن نظامی، عبدالحق کی نثریں اتنی مشہور و معروف ہیں کہ ان کی مثالیں دینا باعث طوالت ہے اور عبث بھی۔ ان میں سے ہر ایک کی تحریر میں کم و بیش الفاظ و تراکیب فارسی لازمی طور پر موجود ہیں۔ جب سے شاہان آصفیہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے

وارث قرار پائے ان کے ذوق علم و ادب اور شعر و سخن کے وارث بھی وہی ہوئے، دکن ہمیشہ سے
علم و فن اور شعر و شاعری کا گہوارہ رہا ہے، یہاں بے شمار علماء، فضلاء، ادباء، شعراء اور صوفیاء
گزرے ہیں جو مقامی اور شمالی ہند کے بزرگوں پر مشتمل تھے، اب بھی حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں
مختلف ممالک کے لوگ موجود ہیں، مثلاً عرب، ترکی، ایران، شام، فلسطین، انگلستان، فرانس، جرمنی،
چکوسلواکیا، یوگوسلاویا، چین، جاپان، جاوا، وغیرہ ان میں اکثر فن دان، ڈاکٹر، اہل حرفہ اور
تجارت پیشہ وغیرہ ہیں جو خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں، حکومت حیدرآباد ان ممالک کے لوگوں کے
ساتھ خاص مراعات روا رکھتی ہے، بعض علماء و فضلا کو عہدے اور بعض کو تو جاگیرات اور منصب
عطا ہوئے ہیں سلاطین آصفیہ نہ صرف قدردان علم و ادب و شعر و سخن تھے بلکہ خود بھی بہت اچھے شاعر
تھے اور ہیں۔

حضرت نظام الملک آصفجاہ اوّل بانی سلطنت آصفیہ فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے،
آپ کا تخلص شاکر تھا، غفران مکان اعلیحضرت میر محبوب علیخان کے زمانہ سے حیدرآباد میں اردو
کو بہت ترقی ہوئی، چنانچہ اعلیحضرت کے حکم سے سنہ ۱۳۰۱ھ میں حکومت کے دفاتر کی زبان فارسی سے
اردو میں تبدیل ہوگئی، علماء، فضلاء، و شعرائے ہند حیدرآباد میں طلب کیے گئے اور بڑے بڑے
عہدوں پر مامور کیے گئے اور خطابات سے سرفراز کیے گئے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:
مہدی حسن خان محسن الملک، چراغ علی اعظم یار جنگ، مشتاق حسین وقار الملک، سید علی بلگرامی عماد الملک،
عزیز مرزا، وغیرہ شعراء میں امیر، داغ و جلیل فانی وغیرہ تھے، داغ کو اعلیحضرت غفران مکان کے
استاد ہونے کا شرف حاصل تھا ان کی دہ ہزار روپیہ ماہوار مقرر تھی علاوہ ازیں مکان سواری اور
داد و دہش بھی ہوتی تھی، یہ سب شعراء دکن ہی میں پیوند زمین ہوئے۔ رتن ناتھ سرشار رسالہ دبدبہ
آصفی کے ایڈیٹر تھے، مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولوی حالی بھی اسی ریاست ابد مدت کے زلہ خوار
تھے، اسی عہد میں مختلف علوم و فنون پر کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ اردو میں اخبارات و رسائل
جاری ہوئے، اور علمی انجمنیں قائم ہوئیں۔

اعلیحضرت "سلطان العلوم" و "سلطان الشعراء" نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے
عہد زرین عہد میں حیدرآباد دکن میں اردو کی جو عظیم الشان ترقی ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا
کہ اس دور کی ترقی علم و فن و شعر و سخن کا آصفی سلاطین سلف کے عہد سے توازن کیا جائے تو یقین ہے کہ
اس دور کا پلہ ہی بھاری رہے گا اور اس پلہ میں سنگین ترین وزن جامعہ عثمانیہ کا شمار ہوگا جو سنہ ۱۹۱۹ء میں

باتباع فرمان خسروی عالم وجود میں آئی تھی، اس اہم تر بالشان کارنامہ کی وجہ سے یہ عہد تا قیام قیامت انشاء اللہ ناقابل فراموش ہوگا۔ جامعہ کے تقریباً اٹھائیس سالہ دوران میں مختلف علوم فنون کی صدہا کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں دارالترجمہ کی بدولت منصۂ شہود پر نمایاں ہوئے اور دیگر علم دوست اصحاب نے ہزاروں چھوٹی بڑی کتابیں اس قلیل عرصہ میں تالیف و تصنیف کیں۔ علوم و فنون کا جو شوق دکن کے بزرگوں اور نوجوانوں میں پیدا ہو گیا ہے اس کی نظیر گزشتہ ادوار میں نہیں ملتی، جامعہ عثمانیہ سے ہر علم و فن کے زندۂ جاوید چشمے ہر طرف بہ نکلے ہیں اور تشنگان علم کو خوب سیراب کر رہے ہیں، اس منبع آبحیات و زلال جانفزا کو دیکھ کر عوام میں علم کی تشنگی روز افزوں ہے، بلکہ اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اب سرزمین دکن چشم بد دور رشک دہلی و لکھنو ہو گئی ہے اللھم زد فزد،

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن کی کوششوں اور حکومت حیدرآباد کی کثیر مالی امداد سے زبان اردو کی ترقی، اشاعت، طباعت کتب، تراجم و تصانیف و تالیفات سے بڑا بھاری علمی کام انجام دیا ہے۔

۱۸۴

حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اردو کا بھی ترقی و اشاعت اردو میں بہت بڑا حصہ ہے، چند ہی سال ہوئے کہ یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے لیکن اس قلیل مدت میں اس نے حیرت انگیز کام انجام دیا ہے اور آئندہ اس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں اس ادارہ کی جانب سے ممالک محروسہ سرکار عالی کے تمام اضلاع اور بعض تعلقات میں اردو کے ادارہ جات قائم کر دئے گئے ہیں، اور سالانہ مرکزی امتحانات اور شاندار اسناد کے جلسوں نے اردو کی تعلیم و اشاعت میں نئی روح پھونک دی ہے اس ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صد آفرین و تحسین کے مستحق ہیں۔

حیدرآباد میں اعلیحضرت غفران مکان کے عہد میں اردو نظم و نثر کو جو ترقی ہوئی اسکا انداز و طرز وہی تھا جو شمالی ہند کا تھا، اس لیے کہ مذکورۂ بالا علماء، فضلاء و شعراء شمالی ہند کے باشندے تھے، ان کے فیضان علم کے اثرات اور مقامی صاحبان علم و فضل کی کوششوں سے اب کوئی فرق زبان کا شمالی ہند اور دکن کا باقی نہیں رہا تھا، اور نظم ہو کہ نثر زبان فارسی کے اثرات اردو پر سے کسی جگہ بھی زائل نہیں ہوئے تھے بلکہ دکن میں فارسی الفاظ کی جگہ ہندی الفاظ لے رہے تھے۔ البتہ کسی عبارت میں کم اور کسی میں زیادہ تھے، چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ دلچسپ مستند اور شواہد زبان

پیش کیجاتی ہے اس لیے ہم بغرض اختصار نثر سے قطع نظر کر کے چند نظم کے نمونے پیش کرتے ہیں، اور ان شعراء کا کلام نہیں پیش کرینگے جو استاد ان سخن ہیں اور جن سے سارا ہندستان واقف ہے جیسے امیر، داغ، جلیل، فانی وغیرہ، بلکہ خاص حیدرآباد دکن کے شعراء کا نمونۂ کلام پیش کیا جائے گا جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ خیالات، انداز بیان، صحت و لطافت زبان، شیرینی، سادگی کے تمام اعتبارات سے ان کا کلام کس پایہ کا ہے، اگر شاعر کا نام ظاہر نہ کیا جائے تو یہ بتانا ناممکن ہے کہ وہ کسی شمالی ہند کے بہترین شاعر کا کلام ہے یا کسی "دکھنی" کا نتیجہ فکر۔

چونکہ کلام الملوک ملِک الکلام ہوتا ہے اس لیے شاہانہ کلام سے اس کی ابتدا کیجاتی ہے:

اعلیحضرت غفران مکان میر محبوب علیخان تخلص آصف اردو میں شعر موزوں فرمایا کرتے تھے، نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے:-

آصف کو جان مال سے اپنے نہیں دریغ | گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی | یارب بجھے گی آگ یہ کیوں کر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں | کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

185

اعلیحضرت سلطان العلوم، سلطان الشعراء نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ تخلص عثمان کا کلام شاہانہ ماشاء اللہ اردو و فارسی دونوں زبانوں پر حاوی اور لاجواب ہے، آپکے دیوان فارسی و اردو مطبوعہ موجود ہیں، اعلیحضرت ظل سبحانی کو حضرت رسالتمآب صلعم سے خاص عقیدت ہے، فرماتے ہیں:

محمد گر نبودے کس نبودے | نہ بودے ہر دو عالم را وجودے
بہر ساعت بہر لحظہ بہر دم | بخواں عثمان بنام او درودے
ہو گئی ختم نبوت جو نبی پر عثمان | ہے یہ ایمان ازل سے مرا قرآن کی قسم

نہ صرف سلاطین دکن ہی شعر و سخن سے شوق فرماتے ہیں بلکہ خانوادۂ آصفی کے ارکان بھی شعر سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں چنانچہ شاہزادہ معظم جاہ بہادر شجیع تخلص نہایت لطیف، دلکش، سادہ اور شیریں سخن ہیں، اکثر چھوٹی بحریں پسند فرماتے ہیں جو بیحد موثر اور زود حفظ ہوتی ہیں۔ شاہی غزلیں عام رسالوں میں طبع نہیں ہوتیں، کہتے ہیں:-

دل کی قسمت میں غم تمہارا ہے | جس پہ اب زیست کا سہارا ہے
دیکھئے دل سے کیا جواب آئے | نام لیکر ترا پکارا ہے

کاش تم حال دل سمجھ لیتے — دل تو ہر حال میں تمہارا ہے
کچھ نہیں چاہیے محبت میں — اب تو سب کچھ نہیں گوارا ہے
کیا کہوں شام غم کا حال شمیم — وقت گزرا نہیں گزارا ہے

**ولہ**

غم دل سنانے کو جی چاہتا ہے — تجھے آزمانے کو جی چاہتا ہے
نہیں ہے انہیں ہم سے کوئی شکایت — یونہی روٹھ جانے کو جی چاہتا ہے
بہت دن سے خاموش ہے جذبۂ دل — قیامت اٹھانے کو جی چاہتا ہے
تصور میں کیا بھی یاد آ رہے ہو — خود ان کا بھی آنے کو جی چاہتا ہے
یہ ہے شمیم اپنی نظروں کا دھوکہ — کہ دھوکے میں آنے کو جی چاہتا ہے

نہ صرف حیدرآباد دکن کے سلاطین و شاہزادگان ہی شعر و سخن کی سرپرستی اور فکر سخن فرماتے ہیں بلکہ ان کے ہندو وزرائے اعظم بھی اسی طرح شعر و سخن، علما، فضلا و صوفیا کے قدر دان تھے اور خود بھی بہت اچھے شاعر اور صوفی منش تھے چنانچہ چندو لال شاداں فارسی کے اچھے شاعر تھے اور ان کے نواسے اور وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد تخلص فارسی اور اردو کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے عشقیہ شاعری کے علاوہ تصوف و وحدانیت کے اشعار کہتے تھے اور صوفیاء سے خاص لگاؤ رکھتے تھے ان کی عزت حرمت اور خدمت اپنی عین عزت و مسرت خیال کرتے تھے۔ مہاراجہ کے کلام کا نمونہ بیحد دلچسپ ہے اور اگر تخلص ظاہر نہ کیا جائے تو خیال ہوگا کہ یہ کسی پکے مسلمان اور صوفی کا کلام ہے، کہتے ہیں:

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی — شیدائے محمد ہے وہ شیدائے مدینہ
احمد کے در پہ اس لیے میں جبہ سا رہا — سجدے کے لائق اور کوئی آستان نہ تھا
معراج میں حضور جو مدعو خدا کے تھے — خلوت تھی کوئی اور وہاں میہمان نہ تھا
کفر چھوڑا بیکسی کے مٹے توحید کی — رنگت شاد آپ عاشقانہ ہو گیا
بال کھولے ہوئے اے گیسوؤں والے آجا — آجا آجا مجھے دامن میں چھپا لے آجا
مبارک شاد زاہد کو یہ جھگڑا کفر اور دین کا — مرا مشرب فقیرانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
ادھر ہے باغبان دشمن ادھر ہے تاک میں صیاد — ہے ایک گل کیلئے بدلی زمانہ کی ہوا مجھ سے
میں پیا آپ عاشق ہوں میں پیا آپ ہی معشوق — حقیقت میری کیا جانے کوئی میرے سوا مجھ سے

غلب کرتا ہوں جو اس نے عطا کرتا ہے مجھکو — محمد اللہ راضی شاد ہے میرا خدا مجھ سے

آمادہ ہوں آج کچھ لکھوں میں — مدح خواجہ میں کچھ کہوں میں

لازم ہے مجھ کو نعمت سنجی — رکھتا ہے یہ آرزو مرا جی

مدح واح کی مدح لکھ رہا ہوں — مداح حبیب مصطفےٰ ہوں

رباعی

باقی جو یہ برس ہائے یہ رحمت ہے — کیا شان ہے معبود کی کیا قدرت ہے

وہ بخشا ہے گنہ گاروں کے سارے اعمال — یہ بندہ نوازی ہے عجب حکمت ہے

مہاراجہ شاد نے اعلیحضرت خسرو دکن کی تخت نشینی کے وقت یہ قطعہ فرمایا تھا اس سے سلاست زبان و روانی اور شاہان آصفیہ کے ساتھ کمال عقیدت و محبت کا اظہار بدرجہ اتم ہوتا ہے:

سلامت رہیں میرے آقا الٰہی — بقا جنکے دم سے ہے ملک دکن کی

وہ آقا جو ہیں مسند آرائے دولت — بت ذی شوکت مہ کامگاری

سعید جہاں میر عثمان علیخاں — امیروں کے سلطان غریبوں کے والی



یہی شاہ محبوب کے جانشیں ہیں — انہیں سے ہے خستہ دلوں کی تسلی

خدا کے کرم سے ہے امید ہم کو — کہ یہ نونہال گلستان شاہی

اب عدد کے نعم البدل ہوگئے ثابت — رہیگا جہاں ہو کے ان کا فدائی

یہ تاریخ دے نذر اے شاد چلکر — مبارک ہو سرکار مسند نشینی

۱۳۲۹ھ

حیدرآباد کے چند مشہور شعراء کے کلام کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے اور انصاف کیجئے کہ ان کے اور شعرائے شمالی ہند کے خیالات و زبان میں کوئی فرق و امتیاز ہے یا کیا۔

توفیق۔

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل — خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرف مشدد کا

رہے سلامت جو خاکساری کبھی نہ اپنی ہو بندگی — کبھی تو اٹھینگے گرد بنکر کبھی تو اونچا غبار ہوگا

قطرہ دریا میں تو دریا ہے نہاں قطرہ میں — میں اک عالم میں ہوں مجھ میں ہے اک عالم پیدا

یہ ٹوٹا آئینہ توفیق میرے بجھیا دل کا — گرا سو بار یہ کمبخت کسی کے طاق نسیاں سے

یہ تجلی خیرگی تاب جمال روئے ساقی نے — بنا ہر نقش ہے ساغر میں پردہ چشم ساغر کا

حضرت امجد کا کلام تصوف سے مالا مال ہے کبھی کبھی عشقیہ شاعری بھی قلم سے نکل جاتی ہے یوں تو تمام اصناف سخن میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں لیکن رباعی بس آپ ہی کا حصہ ہو گئی ہے

یا تو قدیم زمانہ میں حضرت ابو سعید ابی الخیر اور خیام اخلاقیہ حکمیہ اور فلسفیانہ مضامین باندھا کرتے تھے
یا اب حضرت امجد باندھتے ہیں کیا پاکیزہ سادہ اور دلکش کلام ہے:

**غزل کا رنگ دیکھئے:**

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا
کوئی تم سا نظر نہیں آتا

ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں
وہ تماشا نظر نہیں آتا

جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے
جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

زیر سایہ ہوں اس کے میں امجد
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

---

نالۂ جانِ خستہ جان عرشِ بریں پہ جائے کیوں
میرے لئے زمین پر صاحبِ عرش آئے کیوں

جس نے چڑھائیں تیوریاں نام سے میرے عمر بھر
اب وہ میرے مزار پر پھول چڑھانے آئے کیوں

امجد خستہ حال کی پوری ہو کیوں کر آرزو
دل ہی نہیں جب اس کے پاس مطلبِ دل بر آئے کیوں

---

جا چکے عقل و ہوش تاب و تواں
لیکن اب تک انا فنا نہ ہوا

---

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد
ہر پردے کے بعد اور اک وہ نظر آتا ہے

رباعیات کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

صنعت تری ہر خار دکھاتا ہے
ہر غنچۂ گل تری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصول معرفت ہے یا رب
پتہ پتہ ترا پتہ دیتا ہے

---

ضایع فرما نہ سرفروشی کو مری
مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری
آتا ہوں کفن پہن کے اے ربِ غفور
دھبہ نہ لگے سفید پوشی کو مری

---

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی ابھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی ابھی
اک سجدہ نے خاک کر دیا ہستی کو
حضرت! تم سے دیا سلائی اچھی

ہر حسبِ مسبب سبب سے مانگو — منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو — بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

---

**کیفی** مرحوم حیدرآباد کے اُن شعراء میں گزرے ہیں جن کا نام جب تک اردو زبان باقی ہے بڑی عزت و وقعت کے ساتھ لیا جائے گا ' زبان کی سادگی بے ساختگی لطف و شیرینی اور اسکے سبب اپنے استاد داغ کے تلمیذ سمجھے جاتے تھے کلام وہی عاشقانہ 'رندانہ وصوفیانہ ہے ۔

ہر چند گناہوں سے کنارہ نہ کیا — پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر — لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

---

وہ اب کیا خاک آئے ہائے قسمت میں ترسنا تھا — تجھے اے ابر رحمت آج ہی آنا برسنا تھا
کیفی ہے بے چینی کیسا ہے ترا رونا — کچھ کہہ تو سہی اے دل آخر تجھے کیا ہونا
ہم نہ کہتے تھے محبت ہے بڑی بد کیفی — کیا سے کیا ہو گئی دو روز میں حالت تیری



---

میں کسی کام کے قابل تو نہ تھا اے کیفی — ہاں مگر دیدۂ عبرت کے بہت کام آیا

---

جسے کہتے ہیں دل یہ وہ دل نہیں ہے — یہ دل دل لگانے کے قابل نہیں ہے
میں اپنے خیالوں میں ہوں غرق کیفی — یہ وہ بحر ہے جس کا ساحل نہیں ہے
فکر معاد ہے نہ تلاش معاش ہے — کھویا گیا ہوں میں مجھے اپنی تلاش ہے
اسیر دام زلفِ یار چھوٹا ہے نہ چھوٹیگا — طلسم عشق ہے کیفی نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹیگا
نہ یہ سر محتسب کا ہے نہ یہ رندوں کا ساغر ہے — یہ میرے دل کا چھالا ہے نہ پھوٹا ہے نہ پھوٹیگا

---

یہ شبِ وصل ہے اے شمع تو ہو جا خاموش — کہہ نہ دے سوزِ جگر ان سے زمانہ تیرا

---

کس کے دل میں کھپ گئی کس کی نظر میں جچ گئی — میرے دل سی شے خدا معلوم کس کو بیچ گئی
ہنستے ہنستے ہاتھ اس نے منہ پر اپنے رکھ لیا — آسماں سے آج بجلی گرتے گرتے بچ گئی

حقی اورنگ آبادی بھی اچھے شاعر ہیں اور اپنے استاد کیفی کے پورے مقلد۔ انکے چند شعر یاد ہیں:۔

ادا پیدا ظرافت عیاں رخ سے آن تیور سے — ترے قربان آخر دل ہے کس کس کیلئے ترے

ارے نادان بچا چاہنے والا نہیں ملتا — وہ لیلی تھی کہ جس کو مل گیا مجنوں مقدر سے

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا بھی نہیں آتا — بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

علاوہ ازیں دیگر شعرائے حیدرآباد میں نوازش علی ذہین، گردھاری پرشاد باقی، راجیشور راؤ اصغر، نرسنگ راج عالی وغیرہ ہیں۔ نئی پود کے شعرائے عثمانیہ کا انداز کلام بالکل جداگانہ ہے۔ وہ گل و بلبل کی شاعری نہیں رہی، اب جذبات، واقعات، مناظر، قومیت، جوش اور انقلاب کے راگ الاپے جاتے ہیں بجائے مصرع طرح کے نظم کا ایک عنوان قرار دے لیتے ہیں، ان میں زیادہ شہرت کے مالک وجد، تمکین، مخدوم، کنول پرشاد کنول، سلیمان ادیب، فضل الرحمن، لطیف ساجد، تحسین سروری، صمد رضوی، ساز، باقی، انظر وغیرہ ہیں ان میں سے بعض شعراء کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں، اگر ان کے کلام کو تفصیل کے ساتھ لطف اندوز ہونا چاہیں تو علاوہ مندرجہ بالا شعراء کے دیگر شعرائے جامعہ عثمانیہ کا مجموعہ کلام موسومہ بہ "شعرائے عثمانیہ" سب رس گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیں۔ اور



اب ان شعراء کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:۔

سلیمان ادیب:۔ عنوان نظم "خواب" یہ نظم شاعر نے اپنی رفیقہ حیات کی موت پر کہی تھی، دو بند ہیں:۔

حسن اور عشق کے پر کیف خیالوں میں مگن — جھومتا گاتا ہوا میں بھی تھا سرگرم سفر
کوئی پیکر ہو کوئی زلف کوئی آنچل ہو — چند لمحوں کیلئے تھے مرے مسجود نظر
ایک بے نام سی خواہش جو دل تھا بیتاب — ایک انجان سی تسکین کو تڑپتا تھا جگر

---

اک دوراہے پہ کچھ اسطرح ملیں تم مجھ سے — جیسے تم مجھ سے کبھی تھیں ہی نہیں بیگانہ
تم نے پھر اپنی محبت کا جلایا دیپک — اور مجھے بخش دیا سوز دل پروانہ
میرے ساقی تیری بدست نگاہوں کی قسم — میرے ہر گام پہ بنتا ہی رہا میخانہ

---

فضل الرحمن: "ذروں کا ناچ":۔

یہ پہاڑ یہ نہریں یہ کھیت یہ بن — یہ زمیں جو ہے جلوؤں میں رشک چمن

وہ ستارے جو پھولوں میں روشنی کے — وہ فلک جو ہے نور کا باغ عدن
یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمین — وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ برین

یہ ہے برق کے ذروں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

یہ ہوائیں جو باغوں میں مست ہیں سب — یہ درخت جو شیشہ بدست ہیں سب
یہ بہار یہ نکہت و رنگ کی سے — یہ صراحئی لالہ یہ جام سمن
یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمین — وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ برین

یہ ہے برق کے ذروں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

کنول پرشاد کنول "تعارف" ایک بڑے پر جوش نوجوان شاعر ہیں، اور پڑھتے بھی بڑے جوش سے ہیں:

مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

میں راہی ہوں ایک اکیلا
گھیرے رہتا راہ کو جس کی ہر دم طوفان کا ریلا
تم اپنے دھندلے دن دیکھو میری ڈھلتی شام نہ پوچھو — مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
آزادی کا دیوانہ ہوں
انگاروں سے کھیلنے والا اک البیلا پروانہ ہوں
تم سو بندھن میں جکڑے ہو آزادی کے دام نہ پوچھو — مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
دنیا کا رنگ دیکھ رہا ہوں
منڈلاتے طوفانوں بھونچالوں کا بھی ڈھنگ دیکھ رہا ہوں
کانپ اٹھوگے دنیا والو دنیا کا انجام نہ پوچھو — مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

مزید مخدوم محی الدین مخدوم "استالین":۔

صف اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر استالین
مادر روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جسکی تابانی سے روشن ہے زمیں
وطن اور وہ وطن

جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرفان
ان کی محنت کا اخوت کا محبت کا خمیر — وہ زمین ۔ اس کا جلال اسکا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر — میرے پیارے مرے فردوس وطن کی خاطر
ایسے ہنگام قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا میرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بنکر ۔ نہ سما جائے گا ۔ قرۃ العین، میری جان عزیز ۔
آؤ مرے فرزند
برق یا دہ مرار ہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خون مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے ۔ ہے مرا قافلہ سالار جہاں ۔ استالین ۔



میر محمد علیخاں میکش "تاج محل"

یہ اندھیری رات یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں
آنسوؤں کی طرح یہ بکھرے ہوئے تاروں کی دوڑ
اس اندھیرے میں نمایاں ہو رہا ہے کیا کملی سی شئے
رات کو ٹوٹی ہوئی کشتی یہ اک مدہم چراغ
مرمریں پیکر میں اس خواب حسیں کو ڈھال کر
جنکی بے خوابی نے ڈبالا ہے آئے وہ خواب گر
ایک ملکہ کی محبت کو عمل کرنے دوام
کتنی راتیں موت کے طعنوں سے تھراتی رہیں

جسطرح گھونگٹ الٹ دے کوئی بد صورت دلہن
بہ رہی ہو جیسے ٹکڑے ہو کے سورج کی کرن
جیسے چھوٹے ماہتابی سی ادھورے خواب میں
جھلملائے جارہا ہو جس طرح سیلاب میں
کتنی نیندوں کے پریشاں خواب ہیں سوئے ہوئے
جیسے اب بھی بکھرے ہیں بوجھ سا ڈھوئے ہوئے
کتنی صبحیں پتھروں میں حسن بن کر بچ گئیں
جب کہیں اک زندگی کی چند سانسیں بچ گئیں

نظم ۔ "انقلاب" ۔

اک نیا پرچم اڑاتا آرہا ہے انقلاب
ظلمت نم رہ گئی ہے عقل کی تنویر میں — زخم دل ہے اب گرفت حکمت و تدبیر میں

"عالم نو" تھا ابھی تک "پردہ تقدیر" میں — آج پھر پردہ اٹھاتا آ رہا ہے انقلاب
روح خیر و شر ابھی کروٹ بدلنے ہی کو ہے — پا گئے آگاہی دل پستی نکلنے ہی کو ہے
اب جلوس عزم آزادی نکلنے ہی کو ہے — راہ میں آنکھیں بچھاتا آ رہا ہے انقلاب

**کاوش "تجدید"** :-

چشم کو دیدۂ بیدار بنا کر چھوڑوں — دل کو یہ حلقۂ انوار بنا کر چھوڑوں
روح کو محرم اسرار بنا کر چھوڑوں — رہ ہر کو گلشن بے خار بنا کر چھوڑوں

درد کا اک نئے انداز سے درماں کر دوں

اس طرح تجھ پہ کروں اپنے غموں کا اظہار — کہ ترے دل میں بھی ہو جائے محبت بیدار
حد سے گزری مری بیتابی دل تیرے نثار — آگہ اچھے نظر آتے نہیں غم کے آثار

دیدہ و دل کو تری راہ میں قربان کر دوں

**لطیف ساجد "نوائے شوق"** :-

کیا کروں اے غم بیچارگی درد حیات

آہ یہ بزم کہ ہے مجلس اوہام میں شاد — عقل سہمی ہوئی تدبیر کے سامان برباد
ہر طرف جہل کی تاریک گھٹاؤں کا خروش — سینۂ زیست پہ ہے رقص کناں یوعناد کیا کروں...
آہ یہ چشم امارت کے بہکتے ہوئے خواب — اُف یہ لٹتا ہوا دوشیزۂ مسرت کا شباب
بے کسی ظلم و ستم جور و جفا تعزیریں — زندگی پر وہ درکش کمش روز حساب کیا کروں...
نور احساس کا بہتا ہوا دھارا بن کر — ایک خورشید در آغوش شرارا بن کر
چھین ہی لو نگا امارت کی جبیں سے تنویر — شب افلاس کی قسمت کا ستارا بن کر

اک فقط جذبۂ بے باک کی تلوار تو دے
اور کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں اے درد حیات

**تحسین سروری "گاؤں کی باتیں"** :-

کیوں نا راز بنا بیچھے ہو کیا حال ہے گاؤں کے لوگوں کا — میں نے سوال یا لیکن دل میرا وہ ہے جی بیٹھا سا
تنہائی سے اکتا کر جب گھر سے نکل جاتا ہوں میں — کیا جانے کیا یاد مجھے آتا ہے مچل جاتا ہوں میں
ہاں یہ تو بتا ارجن ماناک کیسے ہیں ملتے ہی ہیں — اور سنا ہے گردھاری نے بکے نگا دی اپنی زمیں
خیر یہ باتیں چھوڑو کچھ اپنی بھی کہو کیا کرتے ہو — اب بھی پڑھتے ہو یا کام اپنی کھیتی کا کرتے ہو

یاد ہے اک دن اس گوری پادھا کو کتنا ستایا تھا
بے چاری پر گندہ پانی سب نے پھینکے اچھالا تھا

غصے سے گھبراتی تھی لیکن بھی تو ڈرتا تھا
اور وہ کملا کی باتوں پر اندر کتنا مرتا تھا

کھیلتے تھے سب آنکھ مچولی سیتا دیکھا کرتی تھی
پاربتی کی بھاوج اپنی آنکھیں میچا کرتی تھی

کتنے اچھے دن تھے اور کتنی سہانی راتیں تھیں
کتنی سادہ ملاقاتیں تھیں کیسی اکھڑ باتیں تھیں

یوسف ناظم "گزارش"۔

اے خدا دیکھ نہ مٹ جائیں کہیں رسم و رواج
ورنہ ہو جائے گا دنیا کا تخیل تاراج

آ دو مفلس کو کبھی عرش سے ٹکرانے نہ دے
توڑ دے حسب روایات غریبوں کا زجاج

دامن زیست سے لپٹی رہی ہے فکر معاش
عرش پاتا رہے معصوم دعاؤں کا خراج

خون ہوتا رہے انسان کی تمناؤں کا
عقل دیتی رہے ہر وقت تسلی کا پیام

اے خدا دیکھ مچلتا ہے جوانوں کا شباب
انکے ہاتھوں سے نہ گر جائیں کہیں چنگ رباب

سکندر علی وجد "اجنتا" (صوبہ اورنگ آباد میں واقع ہے جہاں کی سنگ تراشی اور رنگ آمیزی شہرۂ آفاق ہے۔)



جہاں خون جگر پیتے رہے اہل ہنر برسوں
جہاں کھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں

جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکس خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہیگی جنت قلب و جگر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

در و دیوار پر ہیں نقش حسن و عشق کی گھاتیں
پیام زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں

جوان برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں
فضائیں گونجتی رہتی ہیں ہر دم دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکا نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیات جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خامۂ مانی

متشکل ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی
تقدس کے بہانے جی رہا ہے ذوق عریانی

گلستان اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہینگے نقش انکے نام مٹ جائینگے شاہوں کے

حضرات! اس مختصر وقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اردو زبان و ادب پر فارسی کے اثرات کے عنوان سے آغاز زبان اردو سے آج تک کے ادبیات پر ایک مختصر و نامکمل تبصرہ کیا ہے کیونکہ وقت اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا، اگر صرف سرزمین دکن کے علم و ادب و شعر و سخن کی تفصیل بیان کی جائے تو ایک مضمون اور معین وقت میں کیا بیان کیا جا سکتا ہے اس کے لیے تو کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی، اس مختصر وقت میں اردو کی ابتدا کے متعلق لکھا گیا، دکھنی اور شمالی ہند کی کیفیت بیان کی گئی اور نظم و نثر کی مثالیں پیش کی گئیں، ان سے ایک حد تک واضح ہو گیا ہوگا کہ فارسی اور اردو کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، اور کس طرح فارسی مقامی زبانوں سے شیر و شکر ہو کر ان کے باہمی امتزاج سے اردو کے ایک نئے روپ میں آراستہ و پیراستہ جلوہ افروز ہوئی سب نے اس کو اپنا جانا، اس نے کچھ ایسی کشش اپنے میں پیدا کر لی کہ جب کوئی اس کے دامن الفت سے ایکبار وابستہ ہو گیا تو پھر اسے چھٹکارا نصیب نہیں ہوا، اردو نے نہ صرف لشکر پر اپنا اثر کیا بلکہ معززین امراء و سلاطین کو اپنے زلف گرہ میں گرفتار کر لیا، علماء فضلاء متین و سنجیدہ اشخاص بھی اس کے جادو اثر سے نہ بچ سکے، صوفیائے کرام کو بھی مست و بیخود کر دیا، نہ صرف وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگے بلکہ اپنے ہزاروں مریدوں کو اس کی ہر دلعزیزی و شیرینی کا گرویدہ بنا دیا، ہندوؤں اور برہمنوں کو اس نے رام کر لیا، اور وہ اسی کی مالا جپنے لگے، غرضکہ اردو مذہب و ملت اور زمان و مکان کے جھگڑے سے بالاتر ہو گئی، جس طرف جاتی اس کو آنکھوں پر لیا جاتا اور دل میں جگہ دی جاتی، کبھی وہ شاہان مغلیہ کے حرم سرا میں نظر آتی ہے کبھی سلاطین بہمنیہ عادل شاہیہ قطب شاہیہ اور آصفجاہی کے درباروں کی زینت بنتی ہے، کبھی صوفیاء کی محفلوں میں رقص کراتی ہے، اور کبھی شعراء کے دل کی دھڑکن اور سامعین کے جذبات کی ترجمان بنتی ہے، اگر ہندوؤں نے فارسی بڑے ذوق شوق سے پڑھی اور اس میں تصنیف و تالیف کی تو مسلمانوں نے بھی ہندی زبان میں کتابیں لکھ کر اپنا حصہ ادا کر دیا، لیکن ہر دو کی یہ غایت نہ تھی کہ ایک دوسرے پر احسان کریں بلکہ دونوں نے جو علمی خدمات زبان اردو کی انجام دیں یہ سمجھتے تھے کہ اس کے بنانے میں دونوں کا برابر کا حصہ ہے مسلمان زبان اردو صرف اپنی ہونے کا دعوے نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہندوستان آتے وقت اس کو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، ہندو بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ مسلمان آنے سے پہلے ان کی "اردو" جیسی کوئی زبان تھی، یا مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد تنہا انھوں نے یہ زبان بنائی ہے، بلکہ زبان اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کی انتھک ادبی کوششوں کا نتیجہ ہے، دونوں کی تہذیب و ثقافت کا آئینہ ہے، دونوں کا موروثی و مشترکہ ورثہ ہے، سر تیج بہادر سپرو نے بالکل صحیح فرمایا ہے جب وہ کہتے ہیں" اردو زبان مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے آباء و اجداد کا مقدس و مشترک ورثہ ہے

جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے آج بھی جو بے تعصب مسلمان اور ہندو آپس میں اردو بولتے ہیں تو اس
اپنے پرائے کے سوال پہ جھگڑتے ہیں، مسلمان کہتا ہے کہ یہ میری زبان ہے اور ہندو کہتا ہے کہ
یہ میری زبان ہے، میں گھر میں اسی طرح بولتا ہوں، خطوط اسی زبان میں لکھتا ہوں اور دوست
احباب سے اسی میں گفتگو کرتا ہوں، کون کہتا ہے کہ یہ میری زبان نہیں ہے آخر تصفیہ یہ ہو جاتا ہے
کہ "یہ ہماری زبان ہے" اس شیر و شکر کو متعصب لوگ زہر ہلاہل سمجھتے ہیں اور ہر طرح اس کی کاٹ میں
لگے رہتے ہیں اس بات کے لئے کوئی تسمہ لگا نہیں رکھتے کہ اس مشترکہ زبان کے بولنے والوں
میں تفریق پیدا ہو، وہ نہ صرف اس زبان کے بلکہ خود کے بھی دشمن ہیں، زبان اردو کی مثال ایسے
دو جڑواں بچوں کی سی ہے جن کے دوران خون کا ایک ہی سسٹم ہے، اگر ایک کو کسی طرح نقصانات
پہنچا تو دوسرا اس مضرت سے محفوظ نہیں رہ سکتا، ایک کے معدوم ہونے سے دوسرا کب زندہ رہ سکتا
ہے اس لئے مسلمانوں اور ہندوؤں کو چاہیے کہ اس ورثہ کو مقدس و مشترک ہی جانیں، اردو دونوں
کی باہمی کوششوں سے بنائی گئی ہے وہ دونوں کی ہے اور دونوں کی رہے گی، سیاسی اسباب
عناد اور دشمنی کی وجہ سے عارضی مصائب اس پر نازل ہوں تو، جیسا کہ دنیا کی ہر چیز پر کبھی کبھی
نازل ہوا ہی کرتے ہیں اس سے اردو کی دوامی ہر دلعزیزی پر کوئی اثر نہ پڑے گا، اور نہ پڑنا چاہیے،
مسلمانوں اور ہندوؤں کے ملاپ کا زبردست ذریعہ یہی اردو زبان ثابت ہوگی،

میری مسلمانوں سے خاص طور پر اپیل ہے کہ ہر مسلمان وہ جس کسی صوبہ، ضلع، تعلقہ یا گاؤں کا
باشندہ ہو اردو لکھنا پڑھنا سیکھے، دوسرے ناخواندہ مسلمان بھائیوں کو اور اپنے ہندو دوستوں
کو سکھائے پڑھائے، اور اردو کی اشاعت اپنا فرض اولین تصور کرے، اس غرض کے لئے وہ
اردو زبان کو سادہ اور سہل بنائے، بولنے اور لکھنے میں اس کو ملحوظ رکھے تاکہ اس کے کم پڑھے
لکھے مسلمان اور ہندو بھائی ثقیل اور غیر دلچسپ عربی اور فارسی الفاظ سے گھبرا نہ جائیں بلکہ پہلے کی
طرح اس سے قریب ہوں، اور ہمیشہ کی طرح اس کی ترقی و اشاعت میں بے تعصبی اور یگانگت کا کامل
طور پر اظہار و کوشش کریں اور خاصکر مسلمانوں کو چاہئے کہ حتی الوسع وہ فارسی بھی پڑھیں کیونکہ ان کے
مذہب ثقافت، تہذیب اور کلچر کا خزانہ اس زبان میں موجود ہے۔ والسلام فقط

پروفیسر ڈاکٹر سید قاری کلیم اللہ حسینی صدر شعبہ فارسی

# مرزا فرحت اللہ بیگ کی ظرافت نگاری

مرزا فرحت اللہ بیگ خوش مذاق تھے۔ ان کی خوش مذاقی او رظرافت ان کے مضامین کی جلدیں ہی نہیں، بلکہ ان کے کردار و اعمال، ان کے تکلم و تکرار اور ان کی طبع رواں سے بھی ہویدا تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے اتنا ہنساتے کہ زندگی مجسم ہنسی بن کے رہ جاتی۔ مرزا صاحب کی ظرافت نگاری انکی فطرت کا آئینہ تھی۔ وہ کس معنی میں ظرافت نگار تھے اس کے لئے ظرافت یا خوش مذاقی سے واقفیت ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔

197

## ظرافت کیا ہے؟

ظرافت جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے ہنسی اور تمسخر پیدا کرنے والی باتیں نہیں اور نہ پھکڑپن کو ظرافت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ تو عظمت اللہ خاں کی نظر میں — "ایک ذہنی کیفیت ہے، ایک طرح کی لتا نتت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہئے، ایک نفسی انبساط ہے" [1] مرزا فرحت اللہ بیگ نے "روح ظرافت" کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"خوش مذاقی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسے پڑھ کر کوئی شخص بے وقوفوں کی طرح ہی، ہی، ہی کرنے لگے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ کسی فقرہ پر نظر پڑنے اور ساتھ ہی انبساط کی ایک لہر دل سے اٹھے اور لبوں پر آکر ختم ہو۔ خود بخود نگاہ پھر اسی فقرہ پر جائے، چہرہ پر مسکراہٹ آجائے اور بے ساختہ منہ سے نکلے کہ بھئی خوب لکھا ہے۔" مرزا عصمت اللہ بیگ کہتے ہیں۔ "خوش مذاقی یا ظرافت اور مزاح، طنز اور ہجو کتنے ہی ہم معنی الفاظ کیوں نہ ہوں مگر سب علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ لیکن ان سب کی ایک بڑی اور مشترکہ صفت یہ ہے کہ جب ان میں سے ہر ایک اپنے منہ پر ظرافت کی نقاب ڈالے اور ہنس مکھ پن کا مالہ لئے ہوئے دکھائی دیتا ہے تو ہمارے ذہنی

[1] "خوش مذاقی" از عظمت اللہ خاں  [2] "خوش مذاقی اور ظرافت" از مرزا عصمت اللہ بیگ۔

اور تخیلی عناصر میں ایک حرکت سی پیدا ہو جاتی ہے جسے مزاح یا خوش طبعی کہتے ہیں۔" خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو اور منطقی پیچیدے اور داؤ پیچ ذہن کے لئے پر لطف ورزش بھی بن جاتی ہیں۔ اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قارئین پھول کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑیں تو ایسا مضمون ظرافت کا بہترین نمونہ ہوگا۔ خوش مذاقی کے مضامین کے لئے دوسری چیز عبارت کی روانی اور قصہ کی بندش ہے۔ پڑھنے والا ہنستا ہے اور ساتھ ہی دل میں یہ خیال آتا رہتا ہے کہ اللہ نے اگر مجھے لکھنے کی قدرت دی ہوتی تو میں بھی یوں ہی لکھتا۔ کارلائل کا خیال ہے کہ خوش مذاقی نہایت سلجھی ہوئی طبیعت اور موجوداتِ عالم کے ساتھ پرجوش خلوص چاہتی ہے۔ اس کی ہنسی اصلی ہنسی ہے جس سے فرحت اور بشاشت پیدا ہوتی ہے۔ تھیکرے (Thackeray) کی نظر میں خوش مذاقی ظرافت اور محبت کے مجموعہ کا نام ہے۔ خوش مذاق شخص کا دل انسانی ہمدردی اور کائنات عالم کی محبت سے لبریز رہتا ہے۔ اس کی تحریر و تقریر طنز اور لعن طعن کے زہریلے اشاروں کنایوں سے پاک رہتی ہے۔ وہ روزمرہ کے واقعات اور اصلاحی اور معاشرتی پہلوؤں پر تفصیلی اور تنقیدی نظر ڈالتا ہے اور اس خوبی سے ان کی مذمت کرتا ہے کہ کسی کے احساس یا جذبات کو ٹھیس نہیں لگنے پاتی وہ معصوم بچہ کی طرح خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا رہتا ہے۔ خوش مذاقی یا ظرافت کا مقصد یا ان کا دیگر لطیف جذبات کی تسکین اور زندگی کے پہلوؤں پر مبنی تنقید ہے۔ یہ ادب کی وہ اعلیٰ ترین صنف ہے جس کے ذریعہ زندگی کے تاریک ترین پہلوؤں کو بھی روشن کیا جا سکتا ہے۔ بد اخلاقیوں اور معاشرتی کمزوریوں کی اصلاح اسی کے ذریعہ پر امن طریقہ پر کی جا سکتی ہے۔[۳]



مختلف نقطہ ہائے نظر سے ظرافت یا خوش مذاقی کو جانچنے کے بعد اردو ادب میں ظرافت نگاری کی مختصر سی تاریخ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ تاکہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کو دوسرے ظرافت نگاروں میں کیا امتیاز حاصل ہے۔

**اردو ظرافت کی مختصر تاریخ** سہولت کی خاطر اردو ظرافت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

---

ص ۳ "مینائے ادب ظرافت نمبر" از احمد انجم نظامی۔

"پہلا دور میر جعفر زٹلی سے اودھ پنچ اسکول کے آغاز تک ۔ دوسرا دور اودھ پنچ اسکول کے اختتام تک اور تیسرا دور اودھ پنچ اسکول کے اختتام سے آج کے دن تک "[1]
پہلے دور میں انشاء اللہ خان انشاء اور مرزا غالب دہلوی اہمیت رکھتے ہیں میر جعفر کی "زٹلیات" اردو ظرافت نگاری میں پہلا قدم ہے۔

مرزا رفیع سودا کی خوش مذاقی بھی اس پہلے دور میں شامل ہے۔ ان کے یہاں ہجو کے ساتھ ظرافت بھی تھی۔ انشا کی شوخ اور بذلہ سنج شاعری بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ خطوط غالب کے علاوہ غالب کی زندہ دلی اور ظریف الطبعی نے غزلوں میں بھی اس رنگ کو نمایاں کر دیا ہے۔

دوسرے دور میں منشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" نے "حاجی بغلول"، "احمق الذین"، "طرحدار لونڈی" اور "میٹھی چھری" کے ذریعہ، پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "فسانۂ آزاد" کے ذریعہ، اکبر الہ آبادی نے اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعہ اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر اور نواب سید محمد خان آزاد وغیرہ نے اپنے اپنے ذوق کے آئینہ دار رشحات قلم کے ذریعہ مزاح اور ظرافت کی تاریخ میں ایک اچھا اضافہ کیا ہے۔ اسی دور میں بھوق، محفوظ علی بدایونی، جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی اور شوق قدوائی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ سلطان حیدر جوش نے فلسفیانہ طنز نگاری کی بنیاد ڈالی اور ظفر علی خان نے بھی اس میدان میں دوڑ لگائی۔

تیسرا دور سابقہ دونوں ادوار سے مختلف حیثیتوں کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں مزاح کے لئے زیر لب تبسم ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ گویا سنجیدہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب مزاح نگار وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے پڑھنے والوں کو ہنسا لے اور قہقہہ لگانے پر مجبور کر دے۔ رشید احمد صدیقی کا اسلوب، الفاظ کی بندش اور طنز و مزاح؛ خواجہ حسن نظامی کا مخصوص انداز تحریر، سید احمد شاہ بخاری پطرس کا بے نظیر انداز بیان، شوکت تھانوی، ملا رموزی اور عظیم بیگ چغتائی کی خصوصیات سندباد جہازی اور امتیاز علی تاج اور ساتھ ہی ہمارے ملک کے بعض نو مشق ظرافت نگار تمکین کاظمی، آوارہ ۱۵ ام۔ اے، اور مرزا عصمت اللہ بیگ کی مساعی جمیلہ ظرافت نگاری کے اس تیسرے دور میں ایک مقام رکھتی ہیں۔ شفیق الرحمن اور کنہیالال



[1] "اردو ادبی مقالات" از بشیر علی صدیقی

بھور بھی طنز کے میدان میں آ نکلے ہیں۔ تاہم خوش مذاقی کے صحیح معیار ذوق کی کسوٹی پر سب سے زیادہ کھرے مرزا فرحت اللہ بیگ ہی ثابت ہوئے۔ اس دعوے کو تقویت پہنچانے کے لئے صرف یہ لکھ دینا کافی ہے کہ "وہ جو کچھ لکھتے واقعات ہوتے ان کی تحریروں میں خوش مذاقی ان کی زبان اور شوخ طبیعت کا نتیجہ ہوتی۔ اگر اس معیار کو پیش نظر رکھا جائے اور رائے صحیح مان لیا جائے تو اردو ظرافت نگاری کے نمونوں اور ادب میں ایک مرزا فرحت اللہ بیگ ہی بن گئے جنھوں نے جو کچھ لکھا اصولی اور فنی نقطۂ نظر سے لکھا۔ لیکن اس بارے میں ان کی طبیعت کی شوخی بڑی حد تک معاون ثابت ہوئی۔

## مختصر سوانح مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۴ء کے اوائل میں تولد ہوئے۔ ابتدا میں اسلامی طریقہ پر تعلیم پائی۔۔۔ ابتدائی جماعتوں سے بی۔ اے تک کوئی نہ کوئی امتیاز ضرور حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں دہلی سے حیدرآباد چلے آئے۔ محنت اور قابلیت کی وجہ سے مختلف ذمہ دار اور محنت طلب عہدہ داروں کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیتے۔ وظیفہ حسن خدمت پر علیحدگی کے بعد بھی دستوری خدمات انجام دیں۔

ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر اسد اللہ خان غالب سے ان کے خاندان کا تعلق تھا۔ خواجہ امان دہلوی مترجم "بوستان خیال" ان کے قریبی دادا تھے۔ اس لئے نظم اور نثر دونوں میں اپنے علمی و ادبی شوق کی تکمیل کی۔ مرزا حسین احمد بیگ نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ حافظہ ابتدا سے زبردست تھا۔ قدرت نے ذہن ایسا تیز عطا کیا تھا کہ جس کام کی طرف توجہ کرتے اس میں ید طولیٰ حاصل کر لیتے۔ کتب بینی کا شوق ہمیشہ سے رہا۔ اردو اور انگریزی کی کتابوں کا اچھا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ زیادہ تر شاعروں کے تذکرے تلاش کر کے لاتے تھے۔ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ روزانہ اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی جملہ مذاقیہ زبان پر آ ہی جاتا۔[1]

ان کی تمام فطری چیزوں نے مجتمع ہو کر انھیں ایک اچھا صاحب طرز ادیب، ایک خوش مذاق انشا پرداز اور ایک بہتر سخندان و سخن گو بنا دیا تھا۔ ابتدا میں مضمون نویسی کا آغاز مزاحیہ رنگ میں ہوا۔ مضامین فرحت کے سات حصے زیور طبع سے آراستہ ہوئے اور

[1] "ایک بھائی کی یاد" از مرزا حسین احمد بیگ

ایک سے زائد ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم بھی ہو گئے۔ دو حصوں کی اشاعت کا مواد ابھی باقی ہے۔ انجمن ترقی اردو کے سلسلے میں دیوان یقین، دیوانِ نظیر اکبرآبادی اور دیوانِ شاہ پر عالمانہ تنقیدیں بھی لکھیں۔ نظم کی ابتداء گو بعد میں ہوئی تاہم غزلوں، قطعوں، رباعیوں اور نظموں کو ملا کر کلیات کی ایک ضخیم جلد شائع ہو سکتی ہے۔[1]

مضامین فرحت دراصل ان کی ظرافت کے شہپاروں کے مجموعوں کے نام ہیں۔ ان میں مزاح و ظرافت کے علاوہ شاعری اور سوانحی تنقید و تذکرے بھی شامل ہیں۔ ادبی سرمایہ میں ظرافت ہی کا سرمایہ زیادہ ہے۔

## ظرافت کے نمونے

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین میں ایسے ان گنت ٹکڑے پائے جاتے ہیں جن کی عبارت آرائی اور واقعہ پیرائی اتنے پرمزاح ہیں کہ پڑھنے والے کو بے ساختہ ہنسی ہی آجاتی ہے۔ بسا اوقات تو ان کے خوش مذاق فقروں کو سانس روک کر پڑھنا پڑتا ہے۔ یوں تو ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں ایسے کئی فقرے نہ پائے جاتے ہوں، مگر چند خاص نمونوں کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" میں مولوی صاحب کی ٹوپی کا نقشہ اسطرح کھینچا ہے۔

> "جاڑے کا موسم ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ سر پر کنٹوپ ہے مگر بڑا دقیانوسی۔ کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں۔ کبھی اس کے دونوں پا کھے اوپر کی طرف سنبد ہے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرّے کا کام دیتیں۔ کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اسطرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔"[2]

مرزا صاحب کا ایک مضمون "ہم اور ہمارا امتحان" ہے جس میں ایک امیدوار امتحان وکالت کی دلچسپ کیفیت بیان کی گئی ہے۔ امیدوار کو پرچہ امتحان میں ایک سوال سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک مکان رہن رکھا گیا۔ مدت ختم ہونے کے بعد مالک مکان کا حق اس سے قطع ہو گیا تو اس نے دعویٰ ٹھونک دیا کہ مکان پر غاصبانہ قبضہ ہے۔ اس سوال کے فیصلہ کن جواب میں امیدوار نے جواب کے پرچہ میں یہ لکھا:۔

---

[1] "مرزا فرحت اللہ بیگ" از غلام یزدانی۔ [2] "مضامین فرحت" حصہ اول۔

"مکان منہدم کر کے زمین اور ملبہ آدھا آدھا دونوں میں تقسیم کر دیا جائے
اور چونکہ یہ تمام خرابی گواہوں کے پیچیدہ بیانات سے پڑی ہے اس لئے
مکان کے منہدم کرنے اور مقدمہ کا خرچہ ان سے دلایا جائے" ۔ ؎۱

دوسرا سوال یہ تھا کہ ایک نوجوان عورت کے خاوند کو ملازم نے مار ڈالا تھا۔ بیچاری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ شہادت میں جو گواہ پیش ہوئے انھوں نے واردات قتل کو نہ دیکھنے کے باوجود جھوٹی گواہی دی ۔۔ اس سوال کا فیصلہ کن جواب دیتے ہوئے امیدوار نے یہ تجویز کی :۔

"ان دونوں گواہوں کو دو سال سزائے قید بامشقت اور سو سو
روپے جرمانہ کی سزا دے کر ملزم کو بری کر دیا جائے۔ سرکاری طور
پر بیوہ مستغیثہ کا نکاح ملزم سے کر دیا جائے۔ اب رہے بچے تو
وہ دونوں یتیم خانہ میں بھیج دیئے جائیں" ۔ ؎۲

ان کا ایک مضمون "مردہ بدست زندہ" ہے۔ اس میں میت کے قبرستان تک پہنچائے جانے اور دفنانے کے واقعات مزاحیہ طنز نگاری کے اچھے نمونے ہیں۔ مثلاً :۔



"اگر میت کے ساتھ دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون
جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان
والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے، مرنے والے
کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل
کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کے تفویض کر دیا ہے۔ اور یہ
صرف اسلئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے
کا نام خارج کر دیں" ۔ ؎۳

"غلام" ایک آپ بیتی ہے جو خود غلام کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ غلام اپنے لباس کا ذکر یوں کرتا ہے :۔

"موٹے سے موٹے لٹھے اور گاڑھے کے کپڑے بنائے گئے۔ مگر کوئی
کپڑا بدن سے ثابت نہ اترتا تھا نہ اترا۔ پاجامہ پہلے ٹخنوں
سے گزر کر نیکری ہوا۔ اس کے بعد گھٹنوں تک آیا اور آخر

---

؎۱ "مضامین فرحت حصہ اول ۔ ؎۲ "مضامین فرحت حصہ اول ۔ ؎۳ مضامین فرحت حصہ دوم

گھستے گھستے جانگیہ بن گیا۔ اب رہی ٹوپی اور اچکن تو وہ ہمیشہ
قفس کلاس رہتی تھی اور کیوں نہ رہتی پہننا ہی کون مسخرا تھا۔ کبھی
عید برات کو پہن لی تو پہن لی۔" [1]

مرزا صاحب نے "آزادی گارستان اور داداجان" میں ایک دلچسپ جلاس کی کیفیت لکھی
ہے۔ داداجان ایک رکن کے بازو کی نشست پر اطمینان کے ساتھ بٹھلا دیئے گئے اور
نظام مالیہ کی امن سے متعلق تقریر شروع ہوگئی اور پھر عجیب رنگ پیدا ہوگیا:-

"یہاں امن کے ذرائع بتائے جا رہے تھے اور داداجان کا
پیچھے سے غل اٹھا کہ مار ڈالا، مار ڈالا۔ اب جو دیکھتے ہیں
تو داداجان اپنے برابر والے رکن کو دبائے گدگدیاں
کر رہے ہیں اور وہ ہیں کہ چیخوں پر چیخیں مار رہے ہیں۔
اوپر کی گیلری میں سے جو لوگ جھک کر یہ تماشہ دیکھنے لگے
تو ایک صاحب کا جھوک نکل گیا۔ گرے اور گرتے گرتے
بجلی کے جھاڑ کو پکڑ لیا۔ کئی بجلی کے گولے دنادن گر کے
پھٹے۔ کئی کنول اور قلیں ٹوٹ کر نیچے گریں اور یہ ہیں کہ جھاڑ
میں لٹکے جھولا جھول رہے ہیں۔ مخالف پارٹی والے اس ڈر سے
کہ کہیں گرفت ڈھیلی ہو کر یہ ہم پر نہ آپڑیں، اپنی اپنی جگہ چھوڑ
کر بھاگنے لگے۔ غرض ایک اودھم مچ گیا۔" [2]

"یادِ ایامِ عشرت فانی" فرحت صاحب کا وہ مضمون ہے جس میں انہوں نے اپنی تعلیمی دلچسپیوں
کو سمو دیا ہے۔ ایک مولوی صاحب کی انوکھی اور سخت سزا کا ذکر کرتے ہیں کہ:-

"دالانوں میں بیسیوں طاق تھے۔ کونے کے جو طاق تھے
وہ اس دوسری سزا کے کام آتے تھے۔ جس کو سزا دینی
ہوئی اس کو دو چار لڑکوں نے اٹھایا۔ مولوی صاحب نے
بھی ہاتھ بٹایا اور اس بیچارے کو اس طرح بٹھا دیا کہ اس
کا ایک پاؤں کونے کے ایک جانب کے طاق میں اور دوسرا



[1] "مضامین فرحت" حصہ سوم۔ [2] "مضامین فرحت" حصہ چہارم۔

پاؤں کو نے کے دو مہری طرف کے طاق میں۔ غرض اس طرح
اطمینان سے اس کو بٹھا مولوی صاحب آ کر جماعت کو سبق
دینے لگتے۔ یہ بھی نہ سوچتے کہ اگر یہ غریب دو گزا و نچے سے
گرا تو منہہ اور ناک کا کیا حال ہوگا اور کہاں جا بیجا چوٹ
لگ جائے گی۔ گر لڑکے بھی ان کے استاد تھے۔ وقت سے
پہلے طاقوں میں بیٹھنے کی مشق کیا کرتے تھے۔ بیچ میں بھی اگر
وقت مل گیا تو تھوڑی دیر یہ ریاضت بھی کر لی۔" [1]

مرزا صاحب کی ظرافت نگاری کے یہ چند ایسے نمونے ہیں جو اختصار کے پیش نظر درج کئے گئے۔ ایسے کئی ٹکڑے محض طوالت کے خوف سے یہاں درج نہیں کئے جا سکتے۔

## مرزا فرحت اللہ بیگ کی ظرافت نگاری کی خصوصیات

مرزا فرحت اللہ بیگ کی خوش مذاقی یا ظرافت واقعات ہی کی رہین منت نہیں۔ ان کا صاف ستھرا اسلوب بیان شستہ و رفتہ زبان عمدہ طرز نگارش اور نہایت



سادہ مذاق بھی ان کی ظرافت کے اہم ترین لوازمات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو چیزیں وہ پیش کرتے ہیں نہایت ہی آسانی اور سادگی سے ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ مصوری میں ملکہ حاصل ہے۔ اس لئے رنگ آمیزی غضب ڈھاتی ہے۔ گو انھیں دلی خیرباد کہے عرصہ ہو گیا مگر زبان ایسی زیادہ تر دلی ہی کی لکھتے تھے اور لب و لہجہ بھی بڑی حد تک دہلی اختیار کیا بلکہ متاثر بھی نہ ہونے پایا۔ یہی خاص بات ہے جو کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ حقیقی انشا پرداز ہونے کی حیثیت سے جو دیکھتے ہیں لکھتے ہیں اور اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی دیکھنے والے کی طرح محسوس کرنے لگتا ہے۔

وہ اکثر ایسے الفاظ اور محاورات اپنی عبارت میں لاتے ہیں جو دلی کے لوگ صرف گفتگو میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب انھیں سے بلا تکلف اپنے مضمون کو سجاتے ہیں۔ توازن میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ مکالمہ کا پورا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

تمکین کاظمی نے لکھا ہے کہ اس طرح انھوں نے اردو ادب میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا ہے۔ ایک مستقل باب کھولا ہے، ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔ آنے والی نسلیں اس چیز

---

[1] "مضامین فرحت" حصہ سوم

کو پیش نظر رکھکر اور چیزیں بنائیں گی۔ اس باب پر متن اور حواشی کا اضافہ کیا جائے گا۔ اس روشنی میں ہزاروں چیزیں دیکھی جائیں گی۔ لوگ پڑھیں گے، ہنسیں گے، کچھ اثر بھی لیں گے اور کچھ سبق بھی حاصل کریں گے۔ ؎۱

ظرافت یا خوش طبعی جس کا صحیح مطلب و مفہوم خود مرزا صاحب نے مختلف مواقع پر ظاہر کیا ہے بجائے خود ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے اور مرزا صاحب اس کے فن کار ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ایک معیاری تحریر ہے اور مرتب قلم پاروں کے مجموعے ہیں جو ایک مقصد کے حصول کی کوشش میں لکھے گئے ہیں جیسا کہ خود مرزا صاحب نے لکھا ہے:۔ "مضامین لکھنے میں میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک تو وہ پرانے واقعات تحریر میں آجائیں جو بزرگوں کی زبانی مجھ تک پہنچے ہیں تاکہ کچھ دن اور گزرنے کے بعد نسیاً منسیاً نہ ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ ان اہل قلم کے واقعات قلم بند ہو جائیں جنھوں نے زبان اردو کی اصلاح میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اردو زبان میں خوش مذاقی کے ساتھ اصلاح معاشرت کا پرچار کیا جائے۔" ؎۲

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:۔

"پطرس نے کم لکھ کر اردو ظرافت نگاری پر ظلم کیا ہے تو مرزا فرحت اللہ بیگ نے زیادہ لکھ کر اس پر ظلم ڈھایا ہے۔" ؎۳

**۲۰۵**

ہو سکتا ہے کہ زیادہ مطالعہ کرنے والے کو یہی محسوس ہو مگر مرزا فرحت اللہ بیگ کا کوئی مضمون کسی وقت بھی پڑھا جائے، پڑھنے والے پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتا اور ایک خاص اثر ڈالتا ہے۔ گو مرزا صاحب خود لکھتے لکھتے تھک گئے ہیں تاہم ان کے مکمل ظرافت نگار ہونے اور مزاح نگاری کی تاریخ میں ایک اچھا خاصا مقام پیدا کر لینے میں کوئی شک نہیں۔ خود ان کی تحریر ہے:۔

"اب میں خوش مذاقی کا کانڈرا یجیف ہو گیا ہوں اس لئے آئندہ مجھ سے کسی مضمون کی توقع رکھنا بالکل بیکار ہے۔ ہاں رائے زنی اور نکتہ چینی کے لئے بندہ ہر وقت تیار ہے۔" ؎۴

اگر بفرض محال ان کی ظرافت نگاری کے آخر قلم کاروں کو کسی قدر ڈھل مان بھی لیا جائے تو غالباً اس کی یہی وجہ ہو گی جو انھوں نے مذکورہ بالا اقتباس میں ظاہر کی ہے۔ تاہم حصہ اول سے حصہ چہارم اور پنجم تک جو بات نمایاں نظر آتی ہے وہ آخر کے دو حصوں میں کسی قدر دھندلی ہو گئی ہے۔

---

؎۱ "خوش مذاقی اور مرزا فرحت اللہ بیگ" ؎۲ "دیباچہ مضامین فرحت" حصہ دوم ؎۳ "طنزیات و مضحکات" از رشید احمد صدیقی ؎۴ دیباچہ

مگر اپنی جگہ وہ بھی بہت کافی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر سے متعلق ان کے ہم عصر مشاہیر نے جو آرائیں کی ہیں یہاں ان کو درج کیا جاتا ہے تاکہ ان کی تحریر کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی یا کم فہمی کا ازالہ ہو جائے
مولوی عنایت اللہ دہلوی نے لکھا ہے:-

"مرزا فرحت اللہ بیگ (بی۔اے) کے یہ مضامین پڑھے تو مولوی صاحب کا وہ جملہ پھر یاد آیا اور اب معلوم ہوا کہ تحریر کا دل نہ ہونا کس کو کہتے ہیں۔ حقیقت میں استاد کی تعلیم نے اپنے شاگرد سے یہ عیب ضرور نکال دیا۔ یا یہ کہئے کہ شاگرد شروع ہی سے ایسا ملا جو استاد سے کم نہ تھا۔ مرزا صاحب کے مضامین موضوع کا انتخاب، عبارت میں روانی، زبان پر قدرت، بیان میں زور بلا کا رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان ہو تو ایسی ہو اور بے ساختہ پن ہو تو ایسا ہو۔ مرزا صاحب نے جو دلی کے باشندے کیا دلی کی پرانی اینٹ ہیں، وطن کا نام رکھ لیا اور یہی کہنا پڑا کہ دلی پھر دلی ہے کچھ اور نہ باشد ــــ مرزا صاحب آورد کہاں سے لاتے آمد ہی آمد ہے اور جس قدر ہے بہت خوب ہے۔ واردات دلکش کی ایک داستان پیش کر دیتے ہیں جو دم روک کر پڑھنا پڑتی ہے۔ ان کی بے تکلفی پر کسی تکلف کا گمان نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز اور کیفیت کو پوری توجہ سے دیکھنے اور ہر بات کو دل سے سننے کا قدرتی ملکہ رکھتے ہیں۔ ہر نقش دل میں صحیح اترتا ہے اور یاد رہتا ہے۔ خیال کی تحریک پر زبان آپ سے آپ حاضر ہو جاتی ہے اور تصویر کے بادوبار لا میں مضامین کے دریا بہا دیتے ہیں۔ ان کی تحریر عکسی تصویر ہوتی ہے جس میں حسن و قبح، عیب و ہنر کچھ نہیں چھوٹتا۔ رنگ بھرتے ہیں مگر ہلکے اور قدرتی۔ سایہ اور روشنی کی جگہ برمحل الفاظ اور برجستہ جملے ہوتے ہیں۔ ہو، قلم سے حسن باطل کے مصور نہیں فطرت کے مرید ہیں اور زبان میں اردوئے معلٰی کا سحر" [1]

۲۰۶

[1] در تتمہ مضامین فرحت" حصہ اول

ڈاکٹر عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو نے تحریر فرمایا ہے :۔

"ان کا طرزِ تحریر بھی ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ بیان سادہ ہے، تصنع نام کو نہیں۔ ٹھیٹ دلی زبان لکھتے ہیں۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔ مرزا صاحب کو فنِ مصوری میں بھی دخل ہے اس لئے ان کی نظر چیزوں کے مختلف پہلوؤں پر کھلے ہوں یا ڈھکے، وہیں پڑتی ہے جہاں کوئی نکتہ کی بات ہوتی ہے اور جس مقام پر سے عام نظریں سرسری طور سے گزر جاتی ہیں۔ ان کی اس نظر کی بدولت مضمون میں جان پڑ جاتی ہے اور ان کا قلم خط و خال درست کرکے ایک اور ہی رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔" [1]

پروفیسر وحید الدین سلیم کی رائے ہے :۔

"ان پر زبان اردو جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ انکو مکانوں اور مکینوں کا حلیہ بیان کرنے اور واقعات کا نقشہ کھینچنے میں کمال ہے۔ جس جگہ اور جس زمانہ کا حال وہ بیان کرتے ہیں اس کا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جن اشخاص کی تصویر وہ کھینچتے ہیں ان کو ہم زندہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے خط و خال، ان کا لباس، ان کی نشست و برخاست، ان کی گفتگو اور ان کے حالات و خیالات سب پڑھنے والوں پر آئینہ ہو جاتے ہیں۔ دہلی کے خاص تعلیم یافتہ لوگوں کے سوا یہ روانی، یہ سادگی، یہ تصویر کشی، یہ شوخی و لطافت کسی اور شہر کے رہنے والے کو نصیب نہیں ہو سکتی ان سے ہندوستان کے ہر انشاپرداز کو ایک نیا سبق حاصل ہوگا۔" [2]

مندرجہ بالا آرا میں جن جن چیزوں کا وجود مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں اور مضامین میں پایا جاتا ہے۔ وہ تمام اکٹھی ہو کر ظرافت نگاری کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب ظرافت نگار کا بہترین تشخص نگار اور مصور ہونا ناگزیر ہے۔ زبان کی چاشنی، واقعات بیان کرنے میں اسی

---

[1] "دیباچہ مضامین فرحت" حصہ اول۔ [2] "دیباچہ مضامین فرحت" حصہ اول

وقت لطف پیدا کر سکتی ہے جبکہ واقعات کے پہلوؤں کی تبدیلی کے ساتھ زبان میں بھی مناسب تبدیلی ہوتی رہے۔ یہ ایک بہت بڑی چیز ہے جو مرزا فرحت اللہ بیگ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس سے ان کو ظرافت نگاری میں بڑی مدد ملتی رہی۔

**حروف آخر** مرزا فرحت اللہ بیگ کی شخصیت، ان کا مذاق، ان کی زبان، ان کے مضامین، غرض ان کی ہر خصوصیت کو مجتمع کر کے بحیثیت مجموعی ان کا مقابلہ کسی ہم عصر تو کیا اردو ظرافت کی پوری تاریخ میں کسی سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مزاحیہ لٹریچر کی تخلیق کے راستوں پر بہت سے لوگ گامزن ہیں مگر مرزا صاحب کے راستہ پر نہ کوئی گامزن ہو سکا ہے، نہ ہے اور نہ اس کی توقع ہے کہ کوئی مرزا صاحب سے مقابلہ کرنے کی جرات بھی کر سکے۔ کسی کے پاس نہ ایسی زبان اور نہ ایسی شوخ طبیعت، پھر دوسروں سے مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟۔

مرزا صاحب کا کردار اردو الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ محبت بھرا دل رکھتے تھے۔ جیسا کہ غلام یزدانی صاحب نے لکھا ہے:۔

"ہر دوست یہی سمجھتا تھا کہ اس سے زیادہ وہ کسی اور سے اتنی الفت نہیں رکھتے" [1]

اس کے علاوہ خود مرزا صاحب کا شعر ملاحظہ ہو:۔

فرحت کسی کے سامنے پھیلا نہ تیرا ہاتھ
ایک شان یہ بھی ہے تیرے طبع غیور کی

ان کی طبیعت میں سادگی کے ساتھ اولوالعزمی بھی تھی۔ وہ دنیا سے اٹھ گئے مگر دوسروں کے لئے انھوں نے ایک راہ ہموار کر دی۔ ہم کو اس راہ پر چلنا ہے۔ نئی نئی چیزیں تخلیق کرنا ہے۔ خود ہنسنا ہے اور دوسروں کو ہنسانا ہے۔

میر نثار علی کوثر متعلم
ام۔ اے (ابتدائی)



[1] مرزا فرحت اللہ بیگ، از غلام یزدانی۔

# گریز



میں چونک پڑی۔ شاید امی آواز دے رہی تھیں۔ ندا سمجھے ان والدین سے۔ دن بھر کام کالج میں مرتے رہے۔ جانے اب ساڑھے دس بجے رات کونسی مہم درپیش ہے۔ آنکھیں ملتی ہوئی پلنگ سے اٹھی۔ دروازہ سے باہر قدم رکھتے ہی پچھلے پاؤں لوٹ آئی ۔۔ دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ ساری تھکن گویا کسی بجلی کے کرنٹ سے لرز کر کافور ہو گئی ۔۔ یہ کون صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ امی نے آواز دی "لوٹ کیوں گئیں نازو۔ چلی آؤ۔ ان سے کیا پردہ ..... یہ تو احمد ہیں ..... تمہارے بھائی" میں چکرا گئی .... میرے احمد بھائی؟ دروازے کی درز سے دیکھا۔ ایک منحنی سے حضرت چھوی موی بنے، اپنے آپ کو سمٹائے ہوئے بیٹھے ہیں ..... اُنہہ ..... ایسے چھچھوندر قسم کے آدمیوں سے کیا جھجک۔ میں بدن چراتی ہوئی داخل ہوی۔ امی نے کہا "لے ذرا سا ناشتہ تو تیار کر لا ..... احمد ابھی چلے آ رہے ہیں تھکے تھکائے"۔ ایک بھاری آواز سنائی دی "کیوں تکلیف کرتی ہیں خالہ جان ..... اسٹیشن پر کچھ کھا لیا تھا۔ ابھی تو بھوک نہیں ہے" "چلو رہنے دو" امی مسکرائیں "تمہاری بچپن کی عادت نہ گئی"۔ وہ ان ناخواندہ مہمان اور ان جانے بھائی پر جھنجھلاتی ہوی ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی جیسے جیسے تیار کیا اور سینی میں رکھکر میز کے کنارے سے رکھ دی۔ سینی رکھکر لوٹتے ہوئے یکایک انکی نظریں اٹھ گئیں .... کیسی آنکھیں .... بڑی بڑی .. نم آلود .... جیسے چھلکتے ہوئے پیمانے" میں دریچے میں کھڑی سوچ رہی تھی۔ اپنے دماغ کا ایک ایک کونہ چھان مارا لیکن کوئی ایسے عزیز یا رشتہ دار نظر نہیں آئے جو ان صاحب کے احمد بھائی ہونے کا ثبوت ہو سکتے تھے۔ یہی سوال میں نے صبح امی سے کیا انھوں نے آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے کہا "اری یہ بہت دور کے رشتہ دار ہیں۔ تو بھول گئی؟ ..... جب تم دونوں تیسری چوتھی میں تھے تو ساتھ پڑھا کرتے تھے" ..... اور ایکدم میرا دماغ روشن ہو گیا۔

... بڑا عجیب قسم کا انسان تھا۔ بیوقوفی کی حد تک بھولا ..... مجھے بے اختیار ہنسی آگئی ..... ہم
کیسے کیسے نرالے کھیل کھیلا کرتے ۔ خصوصاً ..... شادی کا ..... اور ۔ نگین غبارے فضا میں تیرنے لگے
بڑانی یاد کے طائر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ گئے ...... "وہ نہیں بھی" میں بسورنے لگی "دلہن ہم نہیں بنیں گے
"واہ ، وہ کیسے" وہ دوستانہ لہجہ میں کہتا "ہماری دلہن تو شمسہ بنے گی آؤ شمسہ لو گھونگھٹ نکال لو"
ہماری چھوٹی" میں اسے گھونسہ لگاتی "یاد رکھو جو دلہن بنی .... ہاں ، اور پھر بے بسی سے " اچھا احمد
..... وہیں رو ٹھ جاتی ۔ وہ ہنستا ہوا کہتا "نہیں نہیں ۔ یہ رو ٹھنے کی شرط نہیں ۔ چلو آؤ کھیلیں" ......
...... اور پھر ایک دو سہرانی یادیں آنکھوں میں تیرنے لگیں "احمد" میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا"
تم نے وہ کتاب پڑھی ؟ احمد نے شوق سے بے تاب ہو کر سوال کیا" کون سی ۔ نازو کون سی کتاب؟
"وہ" میں شرمانے لگی ، "لاجلدی ۔ بھلا سا نام ہے ..... ظالم . ظالم محبت " "ہاں" وہ سر
ہلا کر بولا "نہیں پڑھی ..... " پھر آگے جھک کر "کیوں ؟ ... کوئی اچھی بات ہے کیا ؟ میں سکڑ گئی ....
پھر کھلے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی " ہاں ..... احمد ....." میں رک رک کر بولی "احمد ...
مجھے ایک بات سوجھی ہے ۔ لیکن ۔ آؤ" میں نے احمد کا ہاتھ تھام لیا اور باغ کی طرف ہولی ایک کنج میں
210 ہریالی پر دونوں بیٹھ گئے ۔ احمد بات معلوم کر لینے بے چین تھا۔ آخر وہ جب اطمینان سے بیٹھ
گئے تب ، میں نے وہ بات کہی ۔ اپنی انگلی پر دوپٹہ لپیٹتے ہوئے ، پلکوں کی اوٹ سے احمد کو دیکھا"
احمد ۔ کیوں نہ ہم محبت کر ڈالیں ، "کیا" اس کا منہ کھل گیا ، محبت ؟ کیوں" نازو گھبرا گئی نہیں
نازو" احمد گردن ہلانے لگا "محبت تو لیلیٰ مجنون کیا کرتے تھے ۔ دیوانے ..... ہم پاگل تھوڑے ہی
ہیں" واہ " میں نے ثبوت پیش کیا" اماں کس طرح ہم سے محبت کرتی ہیں ۔ کل ہی تو تمہاری اماں
یعنی میری خالہ ، اماں سے کہہ رہی تھیں کہ "مجھے نازو سے احمد سے بڑی محبت ہو گئی ہے ۔ ویسے
احمد غیر تھوڑا ہی ہے" احمد کی جیسے سمجھ میں آگیا" ہاں ..... اور طفیل بھائی بھائی جان سے محبت کرتے
ہیں" "تو ۔ تو پھر" میں کہا "کر ڈالیں محبت" "لیکن" احمد کچھ سوچتے ہوئے میں ایک پکے چیکو پر نظر ٹکا
جما کر بولا" ایک چیز رہی جاتی ہے" "کیا" میں بے چین ہو گئی "ہم" احمد بولا "محبت کس سے
کریں" ۔ بے شک سوال مشکل تھا ۔ آؤ سوچیں " ہم دونوں سوچنے لگے ۔ احمد سر کے بالوں میں
انگلیاں پھیرنے لگا ۔ یہ اس کا عزیز مشغلہ تھا ۔ جب کبھی وہ کوئی بات بھول جاتا ، ایسا کرنے سے
اسے وہ بات یاد آجاتی ۔ چنانچہ اس وقت بھی اسے ایک نکتہ سوجھ گیا ۔ "لو نازو ..... تم کر ڈالو
جمال سے محبت" ۔ میں چونک پڑی" کون جمال ؟" میں نفرت سے کہنے لگی" نہیں احمد .... بڑا خراب

ہے وہ۔ بالوں میں اس نے تیل نہیں ڈالا آج تک ۔۔۔۔ اور پھر میں تیز ہوکر بولی "بھول گئے۔ اس روز
کھیل میں اس نے تمہیں ڈھیلا پھینک مارا تھا۔" "ارے توبہ" احمد نے غلطی تسلیم کی "سچ مچ بڑا بدتمیز
ہے جمال۔۔۔ پھر [illegible] اس نے انگلیاں چٹخائیں۔" "رفیق اچھا رہے گا" میں یک لخت مسکرا دی "
ہاں رفیق میرا دوست ہے۔ ٹافی اور چاکلیٹ سے اس کی جیب ہمیشہ بھری رہتی ہے"۔ ایک روز
جب کہ میرا لنچ نا اسکول کو دیر سے پہنچا تھا اور میں بھوک سے پریشان تھی۔ رفیق نے اپنے کوٹ کی
جیب سے بہت سارے چاکلیٹ ٹافیاں مجھے دے تھیں۔" "اور تم نے کیسے ڈھونڈا؟"
"میں" احمد نے فکرمند لہجہ میں کہا "میرے لئے تم سوچو" میں نے حامی بھر لی۔ سب سے پہلے میرے
ذہن میں گلنار آئی۔ جو میری عزیز سہیلی تھی۔ میں نے احمد سے کہہ ڈالا۔ احمد نے فوراً انکار کیا "
ہرگز نہیں۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے ہیں۔ دعوت کے روز جب میں اسے مار کر بھاگنا چاہتا تھا اس
نے اپنے لمبے ہاتھ دراز کر کے مجھے دھر گھسیٹا تھا۔ ساری کہنی چھل گئی تھی" احمد کہنی سہلانے لگا۔
میں نے دوسرا نام سوچا پھر اچھل پڑی۔ سلطانہ۔ بڑی اچھی لڑکی ۔۔۔۔ احمد بھی اس انتخاب
پر اتنا خوش ہوا کہ مجھے بہت سارے پکے ہوئے چیکو توڑ دینے کا وعدہ کرلیا۔ وہ خوش تھا "

نازو۔۔۔ سلطانہ۔ بڑی اچھی ہے۔ گویا چینی کی گڑیا۔ پچھلی دفعہ جب وہ آگرہ سے یہاں آئی تھی تو
کتنی کہانیاں سنا ڈالی تھیں اس نے" بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سہ رنگین غبارے
پٹاخوں کی طرح پھٹ گئے۔ اندر کوئی گنگناتے ہوئے داخل ہوا "میرے اللہ" کہہ کر میں جھپٹی۔
"ارے توبہ" کہہ کر لوٹ گئے۔ "یا وحشت" امی بولیں جو مجھے بے تحاشہ اپنے کمرے کی طرف جھپٹتے
ہوئے دیکھا۔ میں کمرے میں پلنگ پر کٹے ہوئے پتنگ کی طرح گر پڑی۔ ٹھنڈا پسینہ جارہا تھا
جب طبیعت سنبھلی تو لاشعوری طور پر میں نے کپڑے جھٹکنے شروع کر دئے۔ یکایک مجھے ہنسی آگئی۔۔۔ میں کیا
سوچتی کھڑی رہ گئی تھی ۔۔۔ انھوں نے کیا سمجھا ہوگا۔ میری ہنسی کو سن کر امی کی آواز آئی "ارے کیا ہوا
ہے تجھے نازو۔ پاگل تو نہیں ہوگئی۔ لے ذرا چائے بنا دے" چائے بناتے وقت بھی میری مسکراہٹ
امی سے نہ چھپ سکی" خدا سمجھے تم لڑکیوں سے ۔۔۔۔ کچھ کہہ تو سہی کیوں کھلی جا رہی ہے۔ کہیں ہنسی
ہنسی میں نمک نہ ملا دے" اور میں نے سچ مچ خوب سا نمک گھول دیا۔ چوڑیاں کھنکھنائیں۔ احمد
نے اخبار ہٹا کر دیکھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پردہ کی اوٹ سے میز پر چائے رکھ دی۔ "میرے اللہ"
احمد کے لبوں الفاظ تڑپ گئے ایک گھونٹ لیا۔ ساتھ ہی حلق جل گیا" "ارے توبہ" میں نے ہنستی
ہوئی آواز میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔ احمد مسکرا دیا۔ ساتھ ہی اسکی نظر طشتری پر پڑی لکھا تھا

"کتنا دے نہیں سلطانہ" اور احمد کے چہرے پر کئی رنگ دوڑ گئے جیسے آنکھوں پر سے پردے اٹھ گئے ہوں۔ "ارے توبہ" احمد کے منہ سے نکل گیا "تو یہ بیچ بیچ نازو ہے" مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی اور ضبط کرنے کے باوجود دبی ہوئی ہنسی میں تڑپ کر نکل گئی۔ میں آئینہ کے سامنے سوچتی ہوئی کھڑی رہ گئی..... وہی جھجک ہے..... وہی ہنسی... گویا انھیں ابھی تک وہ سب باتیں..... محبت کی باتیں یاد ہیں..... اور..... کاش..... اگر..... میں نے دیکھا کہ آئینہ میں میرا عکس یک لخت غصہ آ گیا۔

اور گھر میں غدر سا مچ گیا ہے۔ شمع خالہ اپنی تمام پلٹن کے ساتھ نازل ہو گئی..... شور و غوغا... گہما گہمی... باجی عذرا نے مجھے اپنی باہوں میں بھینچ کر سوال کیا "یہ..... یہ کون ہیں"۔ میں مسکرا دی "ہیں ایک" "میں کب کہتی ہوں دو ہیں" باجی نے رخسار کے غازے کو ریشمی رومال میں جذب کرتے ہوئے تیوری چڑھائی "میری بلا سے" لیکن چند روز میں نے بنا کو باجی پر چھا جاتے ہوئے دیکھا۔ چائے کی کشتی سجا کر میں نے میز پر رکھ دی۔ اور یکایک باجی میٹھے لہجے میں بولیں "ارے نازو۔ ذرا دو میرے کمرہ سے بسکٹ کا ڈبہ تو اٹھا لاؤ" میں بسکٹ لیتے واپس آئی یہ یک لخت ڈبہ میرے ہاتھ سے چھٹ گیا سارے بسکٹ بکھر گئے۔ باجی دیوان خانے کے دروازہ پر پیالی پڑھا ئے کھڑی تھیں "مکارہ" میرے دل میں درد کی ایک ٹیس سی اٹھی۔ باجی کے چہرہ پر کئی رنگ دوڑ گئے۔

اس رات میرا دل نہ جانے کیوں ناچتا تھا۔ میں نے اپنے گرم گرم آنسوؤں سے تکیہ بھگو دیا دوسرا دن بڑا اداس گزرا۔ شام میں سب سینما گئے۔ میں نہ جانا چاہتی تھی لیکن باجی کے اصرار اور احمد کی دبے دبے درخواست نے جانے پر مجبور کر دیا۔ ایک باکس ریزرو کر لیا تھا۔ باجی بڑھ بڑھ کر بولتی تھی احمد جھجک جھجک کر اور کچھ شرما کر جواب دیتا۔ باجی نے یکایک سوال کر دیا "آپ کالج میں پڑھتے ہیں نا؟" احمد گھبرا گیا "جی ہاں" "پھر آپ کو باتیں کرنا کیوں نہیں آتیں؟" اس بے باک سوال پر میں چونک پڑی۔ احمد سٹپٹا گیا۔ اسی وقت کھیل شروع ہو گیا۔ فلم میں ایک کردار کے گرد پوری کہانی گھوم رہی تھی۔ ایک متمنی اور فلسفی سا نوجوان..... جو کسی عورت سے دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ ایک لڑکی نے محض اسے جذباتی بنانے کے لئے اس میں دلچسپی لی۔ لڑکی کی ان کوششوں کے دوران میں ہیرو کے خیالات کی ارتقار کو بڑے پُر اثر طریقے پر پیش کیا گیا تھا۔ وہ لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے اور یک لخت اس پر کھلتا ہے کہ یہ سب کھیل تھا وہ دل شکستہ ہو کر کہیں روپوش ہو جاتا ہے۔ لیکن لڑکی لاشعوری طور پر ایک خلا سا محسوس کرتی ہے۔ وہ واقعی اس فلسفی کو دل دے چکی تھی

کھیل ختم ہوا۔ میں گم سم بیٹھی تھی۔ کہ احمد نے نرمی سے شانہ ہلایا۔ "آج آپ کھوئی کھوئی سی کیوں ہیں؟"
باجی بول اٹھیں "شاید ہیرو کے انجام پر افسوس کر رہی ہیں" میں زبردستی مسکرا دی "یا ہیروئن کے"
احمد بولا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان نم آنکھوں میں مجھے سات سمندر موجیں مارتے دکھائی
دیے اس دن میں کچھ نہ سوچ سکی۔

جمعہ کے روز میں اپنی تصویر کو مکمل کر رہی تھی کہ باجی آنکلیں "نازو۔ کیا ہو رہا ہے......
مصوری؟ خوب!...... اچھی تصویر ہے احمد کو بتلایا؟ نہیں؟۔ کیوں نہیں بتلایا؟ اس کی رائے بڑی
صائب ہوتی ہے" میں چڑ گئی ہر بات میں احمد۔ ہر موضوع سے متعلق۔ ایسی ہی الفت ہے تو کیوں
نہیں اس سے...... اس سے آگے میں سوچتے سوچتے لرز گئی باجی رنگوں کو ایک دوسرے میں گھولنے
لگیں۔ پھر بولیں "ارے واہ تصویر کا عنوان کچھ نہیں رکھا...... کیا ہو سکتا ہے" وہ برش کو رخسار سے
لگا کر پرخیال انداز میں تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ "سبزہ زار...... کہسار...... ایک تنہا پگڈنڈی......
ایک دوشیزہ جال لئے خوش رنگ تیتری کے تعاقب میں دوڑتی ہوئی...... لیکن تیتری جال کی
پہنچ سے بلند معلوم ہوتی ہے" ایک منٹ سکوت رہا۔ جس کے دوران میں میں ان سے پیچھا چھوٹنے کی
دعائیں مانگتی رہی۔ میرا برش یونہی تصویر پر رنگ رہا تھا۔ یک لخت وہ چلائیں "سنو ر تحصیل لا
حاصل یہ کیا عنوان رہے گا؟" "نہیں" احمد داخل ہوا "تعاقب مسرت" اچھا عنوان ہو سکتا ہے
باجی کھل اٹھیں "دیکھا نازو۔ میں نہ کہتی تھی۔ کتنا اچھا عنوان تجویز کیا ہے" میرا خون کھول گیا
"تو پھر...... ہوگا...... میں کوئی عنوان نہ رکھوں گی۔ سن لیا" میں دل میں برپا طوفان کو پلکوں سے
روک سکی۔ اور بجلی تیزی سے باہر کہ دروازے پر رفیق نے سنبھالا "تو یہ ہے۔ یہ چھلاوہ بنیں
کہاں چلی تھی" میں اسے متعجب چھوڑ کر اپنے کمرہ میں دوڑ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

جب دوبارہ باہر آئی تو میں نے کچھ سوچ لیا تھا۔ اس دن رفیق اور میں نے خوب دل
کھول کر باتیں کیں۔ اتنی بلند آواز سے کہ باجی اور احمد دونوں سن سکیں۔ اتنے قہقہے لگائے کہ
باغ کے پھول اپنی پتیاں سکیڑ لیں ہم مسلسل دو گھنٹے تک کیرم بورڈ کھیلتے رہے۔ تاش کھیلتے وقت احمد
میرا ساتھی بننا چاہتا تھا۔ میں نے خشکی سے معافی چاہ لی۔ میں اور رفیق پارٹنر بنے۔ تمام ربر ہم ہارے
ہوئے۔ احمد کچھ پریشان سا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ساری چالیں الٹی سیدھی چل رہا تھا۔ آخر ہم فتح
مندانہ انداز میں ہنستی ہوئی اٹھی اور رفیق کا ہاتھ پکڑے باغ میں چل دی۔ باجی بھی مجھے حیرت سے آنکھیں پھاڑے
تکنے لگیں۔ شام میں رفیق کی موٹر کار آئی۔ میں نے پارک جاتے ہوئے احمد کو خدا حافظ کہا۔ آ...

اسکی نظروں میں کتنی یاس بھری تھی گویا کہہ رہی ہوں "نہ جاو نازو تمہارا دل رفیق کے ساتھ بہلیگا نہ یہاں میری لگ گئی مگر میں نے خوب ہی بھر کے تفریح کی۔ رفیق بھی بھری کشادہ دلی سے مطمئن تھا۔ اس رات میں نے کتنی خوشی محسوس کی تھی آج میں نے احمد اور باجی کو خوب خوب جلایا اور ستایا۔

دوسرے دن میں صبح صبح ہی کالج چلدی۔ اور شام میں دیر سے آئی۔ میں سکتے میں رہ گئی جب معلوم ہوا کہ شمیم خالہ مع باجی کے علی گڈھ جا چکی ہیں۔ احمد گھر پر نہ تھا معلوم ہوا کہ بازار کچھ سامان خریدنے گیا ہے۔ میں یونہی کمرہ کی طرف سے گزری۔ دروازہ کھلا تھا۔ یکایک میں چونک سی پڑی۔ پھر رفع شک کی خاطر دروازہ سے دیکھا... سوٹ کیس کھلا تھا۔ لیکن اس میں کا سامان پلنگ پر بکھرا ہوا.... نازک کنگھیاں، ریشمی رومال، ایک بنارسی ساڑی ایک مخملی کیس میں زمرد کی انگوٹھی جگمگاتی ہوئی" میرا دماغ چکرا گیا۔ اپنے کمرہ میں پہنچ کر میں نے سوچنے کی کوشش کی۔ آخر مطلب کیا ہے اس تمام تفصیل کا۔ اور یکایک میرا دماغ روشن ہوگیا۔ وہ باجی.... اور احمد... تحفے تحائف تک نوبت پہنچ گئی.... لیکن.... باجی تو گئیں... پھر؟" میرے خیالات کا تسلسل ایک ہلکی آہٹ سے ٹوٹ گیا۔ احمد دروازہ میں کھڑا تھا۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے بال پریشان، آنکھیں مخمور۔ ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ۔ "میں آجاؤں؟" میں نے رکھائی سے کہا "آجائیے" "نازو" وہ میری کرسی کی پشت سے آکھڑا ہوا۔ "تم کیسی ہوگئی ہو۔ کیا بن رہی ہو..... میں کیا سمجھوں؟" میں اپنی انگلی پر ساری کا گوشہ لپیٹی ہوئی خاموش رہی۔ اس کی آواز کا سوز میں نے بھی محسوس کیا۔ "سن رہی ہو تم" میں پھر بھی چپ رہی "جواب دو نازو۔ کل سے میں سخت پریشان ہوں" میں بل کھا کر رہ گئی۔ باجی جو نہیں ہیں گھر میں۔ اسی لئے نہ۔ میں نے بیزارگی ظاہر کرتے ہوئے کہا "کہیے کیا کہنا ہے۔ میں مصروف ہوں" "نازو" وہ رک گیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "تمہیں ایسا زیب نہیں دیتا..... میں اسے کیا کہوں۔ سمجھنے سے معذور ہوں۔" میں تڑپ کر رہ گئی۔ کون ہوتے ہیں یہ مجھے ٹوکنے والے۔ مجھ سے ایسی باتیں کر رہے ہیں گویا یہ ان کا حق ہے... یہ مرد..... "میں بھی نہیں سمجھی" میں نے گرم ہو کر کہا "آپ کس طرح مجھ پر تحدید عائد کرنا چاہتے ہیں" خدا کی پناہ! میرا اتنا کہنا تھا کہ بھونچال آگیا۔ ادھر آسمان الٹا ادھر ماہتاب الٹا۔ احمد چیخ اٹھے "کیا کہہ رہی ہو نازو!" یک لخت وہ رک گئے "اچھا جو تمہاری مرضی...." انھوں نے ایک لمحہ کے لئے مجھ سے آنکھیں چار کیں اور پھر بے ساختہ دریچے کے باہر دیکھنے لگے "نازو" ان کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔ کیسی حسرت بھری تھی اس ایک لفظ نازو میں "خدا حافظ.... ہاں.... رفیق کو میرا سلام

کہدینا" وہ آہستہ آہستہ کمرہ سے باہر چلے گئے۔ دو منٹ تک میرا دماغ ماؤف رہا۔ یک لخت کھلے سوٹ کیس کا خیال آتے ہی میرا دماغ کام کرنے لگا۔ میرا پچھلا غم و غصہ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح ابھر پڑا...... راج پھوڑا.... فریبی.... میں کتاب ڈھونڈتی ہوی باہر نکلی۔ طاق سے کتاب لے کر واپس ہو رہی تھی کہ امی جان دالان سے گھبرای ہوی چلی آئیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے عجیب لہجہ میں کہا "نازو۔ یہ کیا کیا تو نے.... کیا احمد برا تھا" میں چکرا گئی۔ امی بولیں " میں نے سوچا تھا کہ تم دونوں کی جوڑی اچھی رہے گی۔" "ولیکن امی" میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

"اور لڑکی غضب کیا جو حمیدہ سلطانہ کا نام بھی اپنی بجائے تجویز کر دیا" جیسے کئی جوہری بم مجھ پر پھٹ پڑے۔ حمیدہ..... رفیق — ہمارا آٹھ برس پہلے کا انتخاب آج پورا ہونے کو تھا... رفیق۔ مجھے احمد کا آخری جملہ یاد آیا

"رفیق سے میرا سلام کہہ دینا" انھوں نے سمجھا میں رفیق کو چاہتی ہوں۔ اور باجی ؟..... معلوم ہوا وہ تو محض تفریح کر رہی تھیں۔..... وہ تحفے...... زمرد کی انگوٹھی...... دراصل میرے لئے تھے مگر...... فقط



# انور علی خان متعلم سال اول

# چند سیاسی لطیفے

سیاست کے راستے کو پرخار کہا جاتا ہے۔ لیکن ڈھونڈھنے والے کو اس خشک اور بے گناہ راستے میں بھی بعض دفعہ ایسے ایسے رنگین پھول مل جاتے ہیں جنھیں جمع کرکے ایک گلدستہ سجایا جاسکتا ہے انسان کو ہنسنے والا ذی روح کہا گیا ہے۔ ظرافت اور مذاق فطرت انسانی میں داخل ہے۔ ہنسنے میں جتنے لمحات گزرتے ہیں ان کو زندگی میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہہ اور بات ہے کہ کسی میں یہہ جذبہ بدرجہ اتم ترقی کرجاتا ہے اور کوی اس عطیہ ہی کو کھو بیٹھتا ہے۔ ہمارے لیڈر، ہمارے قایدین جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بے حس غافل قوم کو خواب غفلت سے جگانے اور قوم کی قسمت سنوارنے کی فکر میں گزرتا ہے۔ بعض بعض دفعہ اپنی ان سیکڑوں پریشانیوں کے باوجود دوران مباحثہ وگفتگو میں حاضر جوابی، برجستہ گوئی، اور رقیبانہ چشمک کی ایسی ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کسی اسمبلی یا پارلیمان کی رپورٹ پڑھ ڈالئے، کسی لیڈر کی سوانح عمری کا مطالعہ کیجئے کسی کانفرس کی رپورٹ پر نظر ڈالئے تو اس کا ثبوت ملیگا کہ خشک وسنجیدہ سیاسی موضوعات پر تقریر کرتے ہوئے ان قایدین نے ظرافت کی چاشنی سے ان بے جان تقاریر میں جان ڈالدی ہے۔ ایسے ایسے مباحثوں کے دوران میں جب کہ مباحثہ اس نقطہ پر پہنچ جاتا ہے کہ سننے والے کو یہہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ سیاسی دنگل میں یہہ دو پہلوان اب لڑ بیٹھنے کو ہی ہیں ایک نہ ایک حریف کوی ایسا چٹکلہ چھوڑتا ہے جو جوش کھاے ہوئے دودھ پر پانی کا کام کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا ایوان قہقہوں کی گونج سے معمور ہوجاتا ہے۔ بعض مرتبہ ہمارے قایدین اپنی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی وجہ سے اپنے مسائل کو پیچیدہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم سے کسی دوست نے یہہ سوال کیا کہ تم تین بھای ہو۔ اس میں

ہے دو شاعر ہیں - ایک خود محمد علی جوہرؔ دوسرے ان کے بڑے بھائی ذوالفقار علی گوہرؔ تیسرا آخر شوکت علی کا کیا تخلص ہے - اس پر محمد علی جوہر نے فوراً جواب دیا "شوہرؔ" - اس پر تمام ہنسنے لگے یہہ سچ ہے کہ شوکت علی کے چار بیویاں تھیں -

اور ایک لطیفہ سن لیجئے -

مولانا محمد علی چونکہ اسمبلی میں زیادہ حصہ نہیں لیتے تھے - اس لیے انھیں اسمبلی وغیرہ سے بہت کم سروکار رہتا تھا - لیکن اخبار نویس یا کبھی ہمدرد اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے وہ وہاں پر چلا جاتے تھے - ایکبار اوپر گیلری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نیچے سے ان کے ایک گہرے سوراجی دوست نے کہا جب یہاں تک چلے آئے ہو تو دو قدم اور سہی ہماری جماعت میں آؤ اور باقاعدہ شریک ہو جاؤ تا کہ ملکر کام کریں مولانا نے کہا میں آپ کی جماعت میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں - میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا منظر دیکھ رہا ہوں - اس پر تمام خاموش رہ گئے -

لائیڈ جارج سابق وزیر اعظم انگلستان ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں تقریر کر رہے تھے کہ ہمیں سوئزرلینڈ کی آزادی کے لئے لڑنا ہوگا، ہمیں عمانی حکومت کی آزادی کے لئے لڑنا ہوگا، ہمیں ڈنمارک اور ناروے کو آزاد کروانا چاہئے غرض وہ ہر ایک ملک کا نام لیتے تھے اور یہہ کہا کرتے کہ ہمیں اس



آزادی کے لئے لڑنا ہوگا - جب وہ ایک ہی قسم کی تقریر پارلیمنٹ میں کر رہے تھے تو ایک رکن پارلیمنٹ اس تقریر سے اکتا گئے اور وہ اٹھ کر کہنے لگے کہ ہمیں جہنم کی آزادی کے لئے بھی لڑنا ہوگا - اس پر لائیڈ جارج کہنے لگے کہ ہاں یہہ سچ ہے کہ ہر ایک کو اپنا وطن بہت ہی عزیز اور پیارا ہوتا ہے اور ہمیشہ اس کو اپنے وطن کی فکر لاحق ہوتی ہے لہذا اس کی آزادی کے لئے ہم آپ کی خاطر ضرور لڑینگے -

اس پر پارلیمان میں ایک قہقہہ بلند ہوا -

ایک دفعہ کسی خاتون نے مسٹر چرچل سابق وزیر اعظم انگلستان سے کہا کہ اگر میں آپ کی بیوی ہوتی تو آپ کو فوراً زہر دیدیتی - مسٹر چرچل کب خاموش بیٹھنے والے تھے - انہوں نے جواب میں کہا کہ خاتون اگر میں آپ کا شوہر ہوتا تو ضرور زہر کھانے دیری نہ کرتا -

مولانا محمد علی مرحوم ایکمرتبہ عربی وضع اختیار کئے ہوئے اسمبلی تشریف لے گئے - اتفاقاً وہاں پر ان کی ملاقات پنڈت مدن موہن مالویہ سے ہوی - مالویہ جی نے مولانا کو عربی لباس میں دیکھا اور کہنے لگے اوہو آپ ہیں مولانا میں تو اس لباس سے سمجھا کہ کہیں بیگم صاحبہ بھوپال تو تشریف نہیں لارہی ہیں - اس پر محمد علی کب خاموش بیٹھنے والے تھے - جھٹ کہنے لگے معاف رکھئے - بیگم صاحبہ بھوپال

ایسی شیر دل خاتون ہے کہ وہ اس زنانہ مجلس میں آنا پسند نہیں کرتیں۔ یہہ کہکر وہ آگے بڑھے تھے کہ ان کی ملاقات مسٹر چیپل سے ہوی۔ مسٹر چیپل نے مولانا کا تعارف کسی انگریز عہدہ دار سے کروایا اس وضع قطع اور لباس کو دیکھکر انگریز بھی کہنے لگا کہ مولانا آپ تو اس لباس سے پورے عرب معلوم ہوتے ہو۔ اس پر مولانا نے جو کہا وہ واقعی قابل سماعت ہے۔ وہ کہنے لگے میں چودہ برس تک انگریزی لباس پہنتا رہا اور تم میں سے کسی نے مجھے یہہ نہیں کہا کہ تم پورے انگریز نظر آرہے ہو اب جب کہ میں اپنا مذہبی لباس پہنا ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ میں بالکل عرب نظر آرہا ہوں اس تڑاق پڑاق جواب کو سنکر وہ انگریز بھی کچھ پریشان سا ہو گیا۔

انگلستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر ڈسریل سے کسی نے یہہ دریافت کیا کہ بد قسمتی اور آفت میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے ایک مثال کے ذریعہ یہہ واضح کیا کہ اگر گلاڈسٹون وزیر اعظم دریائے ٹیمس میں گرجائیں تو وہ ایک بد قسمتی ہے اور اگر کوئی انہیں وہاں سے نکال دے تو وہ ایک آفت ہے۔

شاہ فیصل اول والی عراق ہمیشہ یا تو شیروں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اور اس طرح اپنا دل بہلاتے تھے مگر اب موجودہ والی عراق شاہ فیصل دوم اپنا بیش ترین وقت مغربی تعلیم و تمدن پر صرف کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس کی وجہ سے جو ترقیاں ہوئیں ان کو وہ شوق سے دیکھا کرتے ہیں حال ہی میں تیل کے چشموں کی فراہمی کے لئے گول میز کانفرنس جو قائم ہوی تھی اس میں ایک ماہر تیل نے یہہ کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں مسائل کو بہت جلد اس وقت سمجھ سکتا ہوں جب کہ سیکل چلاتا ہوں۔ اس پر شاہ فیصل دوم والی عراق نے کہا کہ پھر آپ کیوں نہیں موٹر سیکل چلاتے تاکہ ملک کے مسایل بہت جلد طے ہو سکیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کی زندہ دلی اور شوق کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ کراچی میں مولانا محمد علی کے خلاف عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو استغاثہ کی جانب سے ان کے خلاف گواہ گزر رہے تھے۔ مولانا خاموش ہی تھے۔ اس کاروائی میں کوی حصہ نہیں لے رہے تھے۔ ایک موقعہ پر عدالت نے استفسار کیا کہ کیا آپ گواہ پر جرح کریںگے۔ لیکن انھوں نے گواہ پر جرح کی بجائے اس کی مزاج پرسی کی اور بیٹھ گئے۔ اس پر عدالت میں ایک بڑا قہقہہ بلند ہوا۔

ہمدرد اخبار کی پہلی سالگرہ کے موقعہ پر محمد علی نے مشاہیر دہلی اور اپنی صحافتی برادری کو ایک پرتکلف ڈنر دیا۔ مہمانوں کی طرف سے میزبان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حکیم اجمل خان مرحوم کھڑے

ہنسے اور کہنے لگے خدا کرے کہ ایسی سالگرہ ہر تیسرے جنسہ ہوا کرے۔ اس پر مولانا محمد علی کہنے لگے تو پھر اخبار کے سالانہ چندے بھی اسی حساب سے وصول کئے جائینگے۔ اس پر حکیم اجمل خان کہنے لگے محمد علی تو سیاست کے ساتھ ساتھ ظرافت میں بھی سب سے بازی لے گئے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ مسٹر چرچل وزیر اعظم انگلستان مونچھیں رکھا کرتے تھے۔ وہ تقریر کیے جا رہے تھے اور مسٹر چرچل جب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تو کہا جاتا ہے کہ سامعین میں سے اکثر ایک اطمینان کی نیند لیتے تھے۔ غرض جب وہ تقریر ختم کرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے تو ایک لیڈی نے اکتا کر مسٹر چرچل سے کہا کہ "مسٹر چرچل نہ تو مجھے آپ کی مونچھیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اور نہ آپ کی موجودہ سیاست اس پر مسٹر چرچل نے فوراً کہا محترم خاتون آپ کو میری تقریر تو تقریر میری مونچھوں سے بھی سابقہ نہیں پڑیگا۔

مسلم لیگ کے عاملہ کا اجلاس خفیہ ہوا کرتے ہیں۔ اس میں جو مسائل طے پاتے ہیں وہ سوائے ارکان عاملہ کے کسی کو نہیں معلوم ہوتے۔ ایک مرتبہ مس فاطمہ جناح کسی خاص اہم مسئلہ کے متعلق بیگم مولانا محمد علی مرحوم سے دریافت کیا کہ عاملہ میں اس کے متعلق کیا طے ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ مرحومہ کب ایسے باتوں میں آنے والی تھیں وہ کہنے لگیں کہ بجائے مجھ سے دریافت کرنے کے آپ اپنے بھائی قائداعظم جناح سے کیوں نہیں دریافت کرتیں۔

لنکن جو ممالک متحدہ امریکہ کا پہلا پریسیڈنٹ تھا وہ ایک مرتبہ جوتا صاف کر رہا تھا ان کے ایک دوست اس وقت آگئے اور تعجب سے کہا کہ آپ اپنا جوتا صاف کر رہے ہیں۔ لنکن نے جواب دیا آپ اپنا جوتا نہیں تو دوسروں کا جوتا صاف کرتے ہیں۔

سکندر اعظم سے ایک شخص نے ایک روپیہ کا سوال کیا۔ سکندر نے کہا ایسی ذرا سی چیز مجھ سے کیا مانگتا ہے جو میرے لایق نہیں۔ ایسی چیز مانگ جو کہ واقعی تیرے قابل ہو۔ تب اس شخص نے کہا ملک عطا کر۔ سکندر نے کہا یہ تیرے لایق نہیں۔

انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر گلاڈسٹون ہمیشہ ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرتے تھے۔ لوگوں کو یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ آپ وزیر اعظم ہوکر تیسرے درجہ میں سفر کرتے ہیں اور آپ کا لڑکا ابھی سے درجہ اول میں سفر کرتا ہے مسٹر موصوف نے جواب دیا کہ میں ایک معمولی کسان کا لڑکا ہوں اور وہ وزیر اعظم کا بیٹا ہے۔

ایکدفعہ شہنشاہ نپولین شکار کھیلتا ہوا دور نکل گیا جنگل میں ایک کسان سے دریافت کیا

کہ آیا لوگ شہنشاہ سے خوش ہیں یا نہیں۔ کسان نے جواب دیا کہ میں شہنشاہ کو کبھی نہیں دیکھا مگر
لوگ عموماً ان سے خوش ہیں اس لئے میں اس کو دیکھنے کا بہت خواہش مند ہوں۔ نپولین نے جلدیا
کہ آؤ میں تمہیں تمہاری خواہش پوری کرتا ہوں۔ یہاں سے تھوڑی دور شہنشاہ کا ڈیرہ ہے
اس کو دیکھ لو۔ کسان بادشاہ کے ساتھ ہولیا۔ مگر راستے میں کہنے لگا کہ وہاں تو تمام شکاری وردیا
پہنے ہوئے ہونگے اس لئے میں کس طرح شہنشاہ کو پہچان سکونگا۔ نپولین نے جواب دیا کہ وہاں
پر تمام لوگ شہنشاہ کو ٹوپیاں اٹھا کر تعظیم بجا لائنگے اور جو ٹوپی پہنے ہوئے ہوگا وہی شہنشاہ
ہوگا۔ جب نپولین اور وہ کسان کیمپ میں گئے تو تمام لوگ ٹوپیاں اٹھا کر تعظیم بجا لائے۔ نپولین
نے دہقان سے پوچھا کہ شہنشاہ کو دیکھا یا نہیں۔ دہقان نے جواب دیا نہیں۔ نپولین نے سوال
کیا ارے یہاں پر تمام ٹوپیاں نکال دئیے ہیں اور جس کے سر پر ٹوپی نہیں ہے وہی تو شہنشاہ
ہے کسان کہنے لگا بجا ہے مگر یہاں پر میں اور آپ ٹوپی پہنے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
میں نپولین ہوں یا آپ۔ نپولین دہقان کے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اس کو بہت انعام دیا۔
سنا گیا کہ مولوی بہادر خان مرحوم نے گاندھی جی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور وہ سیواگرام
گئے۔ گاندھی جی نے کہا میں نے سنا ہے کہ تم مولانا آزاد سے بھی اچھی تقریر کرتے ہو۔ مجھے تم سے ۲۲۰
ملنے کی خواہش بہت تھی اس وقت گاندھی جی کے درشن کے لئے لوگ آرہے تھے چرن چھوتے پھول
رکھتے اور چلا جاتے ایک معتقد نے بجائے پھول کے دو نفیس کشمیری سیب گاندھی جی کی خدمت میں
پیش کئے۔ گاندھی جی نے اس کو قبول کرلیا گاندھی جی ایک سیب بہادر خان مرحوم کو دینا چاہتے تھے
یہ دیکھکر مرحوم نے اپنے دونو ہاتھوں کی ہتیلیاں ایک ساتھ جوڑ کر کھولدیں تاکہ سیب لیں۔ ان
کشادہ اور شفاف ہتیلیوں کو دیکھکر گاندھی جی نے دونو سیب یہ کہکر دئے کہ میں آپ کو ایک ہی سیب
دینا چاہتا ہوں مگر اتنی بڑی ہتیلیوں کو دیکھ کر دونوں سیب دینے طبیعت چاہتی ہے۔ بہادر خان
مسکراتے ہوئے کہنے لگے اب جب کہ آپ نے کشادہ دل کے ساتھ ہمیں یہ عطیہ دیا تو ہم نہیں چاہتے
کہ سب کچھ لے لیں۔ اس لئے آئیے ہم تقسیم کریں۔ یہ کہکر ایک سیب گاندھی جی کو دیدیا۔ پاکستان کی
طرف لطیف اشارہ محسوس کرکے گاندھی جی کچھ اتنی دیر تک مسکراتے رہے کہ دیکھنے والوں کا بیان
ہے کہ انھوں نے اس سے قبل گاندھی جی کو اتنا مسرور نہیں دیکھا تھا۔

امیر تیمور جو لنگ سے تاریخ کے صفحات میں بہت مشہور رہیں ان کے دربار میں دولت خان نامی
جو ایک نہایت بہترین گویا تھا آیا۔ اس کے گانے سے امیر تیمور بہت ہی محظوظ ہوئے۔ امیر تیمور نے

مذاقاً کہا دولت کس طرح اندھے کے گھر آئی ۔ دولت خان کہنے لگے اگر دولت اندھی نہ ہوتی تو پھر کس طرح لنگڑے کے گھر جاتی ۔

نپولین جب روس پر حملہ کیا تو ایک روسی نے کہا کہ روس اپنی عزت کے لئے لڑ رہے ہیں اور فرانسیسی صرف دولت کے لئے ۔ اس وقت نپولین نے جواب دیا کہ جس کسی کے پاس جس چیز کی کمی ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ لڑ رہا ہے لہذا اب روسیوں کے پاس عزت کی کمی ہے اس لئے وہ عزت حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں ۔

# کونی شعاعیں[1]

جوہری توانائی اب کوئی پراسرار حقیقت نہیں رہی۔ یہ اور بات ہے کہ انسان ابھی اسپر قابو نہیں پاسکا۔ اور اسے حیات کے تعمیری اغراض کے لئے استعمال کرنے پر غور ہی کر رہا ہے۔ جوہر کی اصلیت پر عرصے سے کام ہو رہا تھا اور اسکی بے پناہ قوت کا بھی مدت سے انسان کو علم تھا لیکن سب سے بڑا مسئلہ جس نے سائینسدانوں کو سالہا سال تک حیران کیا وہ جوہر کو توڑنے کی ترکیب تھی وہ بھی اس جنگ کے دوران میں نوع انسانی کے ہاتھ لگ گئی۔

انسان کی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ نئی نئی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے اور کائنات کے سربستہ رازوں کے انکشاف میں اسے ذہنی آسودگی کا پر کیف احساس ہوتا ہے۔ اب جب کہ "جوہر" اور اسکی پراسرار قوتیں راز نہیں رہیں دنیا کے بڑے سائینسدان ایک اور مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کئے ہوئے ہیں۔ تقریباً ہر بڑے ملک میں اسپر کام ہو رہا ہے۔ لیکن اب تک ان سب کی مجموعی کوششوں کے باوجود "کونی شعاعوں" کی ماہیت اور ان کے منبع اور انکی بے پناہ قوت کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہو سکیں۔

جوہر کے بالعکس کونی شعاعوں کی تحقیق میں بڑی مشکلات کا سامنا ہے۔ جوہر پر تحقیق دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں ایک بند تجربے خانے میں آسانی سے کیجا سکتی تھی۔ لیکن کونی شعاعوں پر کام کرنیکے لئے فضا کی بلند ترین سطحوں تک پہنچنا ناگزیر ہے۔

---

[1] Cosmic Rays.

جس کی وجہ سے ہمیشہ موسم کا خیال اور فضائی تغیرات کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ غبارے [illegible] میل اونچے اڑائے جا سکتے ہیں اور راکٹ کی وجہ سے تو بلندیوں کو طے کرنے میں اور آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن کونی شعاعوں پر تحقیق ابھی ابتدائی منازل میں ہے۔ سنا جا رہا ہے کہ روس نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔ لیکن چونکہ روسیوں کی زندگی کا ہر پہلو آج کل سیاست کے تابع ہو گیا ہے اس لیے انکی علمی وسائنسی تحقیقات کے متعلق کچھ معلوم کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔

کونی شعاعوں کی دریافت اسی صدی کی ابتدا کا واقع ہے۔

## ابتدائی تجربات

جب کسی برقائے ہوئے جسم کے اطراف ہوا رواں شدہ (Ionised) ہو جاتی ہے تو یہی ہوا موصل (Conducter) بنجاتی ہے۔ اور بار (Charge) بتدریج کم ہونے لگتا ہے۔ برطانیہ کے دو سائنسدان رتھر فورڈ (Rutherford) اور میک لینان (Mclennan) نے دریافت کیا کہ اگر باردار برق نما کو ہوا بند دھاتی ڈبے میں جس کی دیواریں نصف انچ دبیز سیسے کی ہوں بند کر دیا جائے تو بار کی تخفیف کو بڑی حد تک روکا جا سکتا ہے۔



بار کی تخفیف برق نما کی کمزور محجوبیت (Insulation) کی وجہ سے عمل میں نہیں آتی تھی بلکہ اسکا باعث چند اعلیٰ نفوذ پذیر شعاعیں تھیں۔ ابتداً ان شعاعوں کو ریڈیم کی جیہ شعاعیں (Gamma Rays) سمجھا گیا جو زمین سے خارج ہو کر دھات میں گھس جاتی ہیں مگر سائنسدانوں نے آگے چل کر معلوم کیا کہ سیسے کی دیوار کتنی ہی دبیز کیوں نہ کر دی جائے برق نما میں بار برابر کم ہوتا جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ یہ پر اسرار شعاعیں جنہیں نفوذ پذیر شعاع پذیری (Penetrating radiation) کہنا چاہئے زمین سے نہیں بلکہ فضا سے آتی ہیں۔

اس نظریے کی تصدیق کے لیے یہ ضروری تھا کہ اگر برق نما کو فضا میں بلندی پر پہنچایا جائے تو ان شعاعوں کا اثر کم ہو جائے۔ سنہ ۱۹۱۰ء اور سنہ ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر گوکل (Dr. Gockel) ایک دبیز سیسے کی چادر میں لپٹے ہوئے برق نما کو لیکر غبارے کے ذریعہ ۲،۵ میل کی بلندی پر پہنچ گیا مگر وہاں معلوم

ہوا کہ اس بلندی پر شعاع پذیری بجائے کمی ہونیکی بجائے اور اضافہ ہوگیا ہے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے دو پروفیسر ہس (Hess) اور کال ہوسٹر (Kol Horster) نے اسی طرح غبارے میں ۵ ۶ ۷ میل کی اونچائی پر پہنچ کر دیکھا کہ شعاع پذیری میں زمین کے بمقابل وہاں آٹھ گنا زیادہ شدت پیدا ہوگئی ہے۔ ان تجربات سے یہہ ثابت ہوگیا کہ شعاع پذیری فضا سے نہیں بلکہ کائنات کے کسی اور حصہ سے آرہی ہے۔ اسی لئے ان شعاعوں کو "کونی صفات کی حامل" شعاعین کہا گیا[1]

پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے ان تجربات میں کچھ دن کے لئے رکاوٹ پیدا ہوگئی لیکن ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر آر۔ اے ملکان (R. A. Millikan) نے چار برق نما ایسے بنائے جن میں ریکارڈ کرنے والے تپش پیما، بار پیما اور ایک متحرک عکس لہ تھی۔ یہہ برق نما ایک چھوٹے سے غبارے میں جس میں کوئی آدمی بیٹھا نہ تھا سان انٹونیو (San Antonio) کے قریب اڑائے گئے۔ یہہ غبارہ دس میل کی بلندی تک پہنچ گیا تھا۔ شعاع پذیری کی شدت اس تجربے میں زمین سے ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر ملکان کے تجربے کو جرمن سائنسدانوں کے تجربوں سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ اور اسکے پیش کردہ نتایج کو دوسرے تمام تجربات سے صحیح تر خیال کیا جاتا ہے۔

## کونی شعاعین کیا ہیں؟

ڈاکٹر ملکان اور اس کے مقلدین کا خیال ہے کہ کونی شعاعین برقی مقناطیسی موجیں یا فوٹان (Photons) ہیں۔ یا بقول ایک صحافی "روشنی کی گولیاں ہیں" یہہ برقی مقناطیسی موجیں جو شعاعوں سے بھی کم موجی طول رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر آرتھر کامپٹن (Dr. A. Compton) پروفیسر شکاگو یونیورسٹی کہتا ہے کونی شعاعین منفی برق پاروں کے ذرات ہیں۔ چونکہ منفی برق پاروں کو اپنے راستے سے مقناطیس کے ذریعہ ہٹا دیا جاسکتا ہے اسلئے کونی شعاعین بھی جب باہر سے زمین کے مقناطیسی میدان تک پہنچتی ہیں تو زمین انہیں جذب کرلیتی ہے اور جاذبیت کا عمل خط استوا سے زیادہ قطبین پر ہوتا ہے۔

ح[1] کونی (Cosmic) یونانی لفظ (Komikos) سے لیا گیا ہے جسکے قدیم معنی "دنیاوی" کے ہیں۔ مگر اسوقت کائنات کے معنی میں مستعمل ہے۔

واقعہ دراصل یہ ہے کہ جب کونی شعاعیں بالا کرہ سے زمین تک پہنچتی ہیں تو راستے میں فضاء
کے جوہروں سے ٹکراتی ہیں۔ یہ ٹکراؤ اس شدت کی ہوتی ہے کہ جوہر ٹوٹ جاتے ہیں
اور ان جوہروں کے منفی اور مثبت برقی پارے آزاد ہو جاتے ہیں یہی منفی برقی
[illegible] پارے جو بنتے ہیں اور اسی طرح سے دوسرے آلات پر اثرانداز ہوتے ہیں گویا
برقی مادہ پر کونی شعاعوں کا راست نہیں بلکہ بالواسطہ اثر پڑتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر کارل ڈی اینڈرسن (Dr. Carl D. Anderson) نے جو
ڈاکٹر ملکان کا مددگار تھا یہ نظریہ پیش کیا کہ کونی شعاعوں میں مثبت برقی پارے بھی ہوتے
ہیں یہ مثبت برقی پارے ان پروٹانس سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں جو جوہر کے مرکزے
میں پائے جاتے ہیں۔ ان ننھے مثبت برقی پاروں کو اسنے (Positrons) کا نام
دیا۔ کیمبرج کے ڈاکٹر پی ایم ایس بلیکٹ (Dr. P.M.S. Blackett) نے پوزیٹران پر قیمتی
تحقیق کی ہے۔ لیکن اس سے کونی شعاعوں کی ماہیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ڈاکٹر ٹامس
ڈبلیو جانسن (Dr. T. W. Johnson) جس نے پہاڑ میں کونی شعاعوں پر تجربے کئے ہیں کہتا ہے



کہ کونی شعاعیں صرف منفی برقی پاروں پر مشتمل نہیں بلکہ انکا ۳۰٪ سے زائد حصہ مثبت ذروں
پر مشتمل ہے جو یا تو پروٹان ہیں یا پوزیٹران اور باقی ۷۰٪ حصہ فوٹان (Photon) ہے۔

کونی شعاعوں پر تحقیق کے سلسلے میں گذشتہ (۱۵) سال سے سائنسدانوں نے فضائے
قائمہ (Stratosphere) میں غباروں کو بلند ترین سطحوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔
۱۹۳۲ء میں رجینر (Regener) نے ۱½ میل کی بلندی تک غباروں کو اڑایا تھا۔ لیکن
یہ بہت کم فاصلہ تھا کیونکہ فضائے قائمہ تقریباً اسی بلندی سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے
سال اس نے مسلسل تجربات کئے اور سترہ میل کی بلندی تک غباروں کو پہنچانے میں کامیاب
ہوگیا۔ ان غباروں میں کوئی آدمی نہ تھا بلکہ برقی نما نصب تھے جن پر کونی شعاعوں کے اثرات
کی تصویر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک آلہ کے ذریعہ خود بخود کھینچتی جاتی تھی۔ اس تجربے
کے دو خاص نتائج تھے۔ ایک یہ کہ فضا کی کثافت میں کمی کے ساتھ ساتھ کونی شعاعوں کی
شدت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ دوسرے فضائے قائمہ میں ان کی شدت میں اضافہ کا تناسب
فضائے متغیرہ سے بالکل مختلف تھا۔

۱۹۳۳ء میں سوویٹ روس کے تین سائنسدان برن بام (Birnbaume) پروکوفیف

ڈوفیو (Prokofiev) اور گیوڈناف (Gudenoff) نے ماسکو میں ایک غبارہ کے ذریعے ۱۲
میل کی بلندی تک پرواز کی انسان اس سے قبل اس بلندی تک پہنچنے کامیاب نہیں ہوا
تھا۔ ان کا غبارہ اس وقت تک کے بنے ہوئے تمام غباروں میں سب سے بڑا تھا
جس میں پچیس ہزار مکعب میٹر گیس کی گنجائش تھی۔ ان لوگوں نے اپنے ساتھ اتنی
مائع آکسیجن لے لی تھی کہ آسانی سے چالیس گھنٹوں تک سانس لے سکیں۔ ان کے ہمراہ
کونی شعاعوں کی شدت ناپنے کے آلے کے علاوہ فضا کی کثافت معلوم کرنے کا آلہ
اور فضائے قائمہ کے دوسرے کیمیائی اور برقی اثرات کا پتہ لگانے کے لئے مختلف
آلات تھے۔ علاوہ ازیں ایک ریڈیو بھی ساتھ تھا کہ زمین تک اطلاع کا سلسلہ
جاری رہے۔

پرواز کی انتہائی بلندی پر فضائے قائمہ کی حرارت صفر فارنہیٹ سے ۸۰
درجہ نیچے تھی۔ یہ غبارہ ۸ گھنٹے ۱۹ منٹ تک فضا میں رہا۔

اسی سال امریکہ میں اوہو کے قریب لفٹننٹ کمانڈر نے (۶۱۲۳۴
۲۲۹ فٹ بلندی تک پرواز کی اور چھ گھنٹے ۲۴ منٹ تک فضا میں رہا۔

## کونی شعاعوں کا منبع

ان مسلسل اور صبر آزما تجربات کے باوجود سائنسدان ابھی تک کونی شعاعوں
کے منبع کا پتہ لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ جب کونی شعاعیں
زمین سے خارج ہوتی ہیں نہ فضا میں بنتی ہیں تو ان کا منبع ضرور کائنات کے کسی بعید
ترین گوشے میں ہوگا۔

جس طرح سورج کی سطح پر روشنی اور حرارت میں تغیر کی وجہ سے خاص
اوقات میں سیاہ دھبے پیدا ہوتے ہیں اور زمین پر اکثر مقناطیسی طوفانوں
کا باعث بنتے ہیں اسی طرح بیشتر ستاروں میں بھی سیاہ دھبے موجود ہیں۔ ڈاکٹر
سوارم (Swarm) ناظم بارٹل انسٹی ٹیوٹ کا خیال ہے کہ کونی شعاعوں کا منبع
شائد ستاروں کے سیاہ دھبے ہی ہوں۔ سر جیمس جینس (James Jeans)
مشہور ماہر فلکیات کہتا ہے کہ شائد کونی شعاعیں موت کی پرچھائیں ہیں جو
جوہر کے پھٹنے کی وجہ سے بعید ترین ستاروں میں پیدا ہوتی ہیں۔ کائنات

کے ایسے ہی حوادث ہیں جو ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ہماری دنیا بتدریج لیکن بالیقین انجام سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر ملکان کہتا ہے کہ کائنات کے بعید ترین گوشوں میں جب منفی برقپارے اور مثبت برقپارے آپس میں جوہر کی تعمیر کے لئے ملتے ہیں تو ایک عظیم توانائی خارج ہوتی ہے جو روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کے بعد دو لاکھوں سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔ یہی توانائی "کونی شعاعیں" ہیں کونی شعاعوں کے منبع کے متعلق ابھی تک سائنسدانوں نے کوئی یقینی بات نہیں بتائی۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر سوادرم، ڈاکٹر ملکان اور سر جیمس جینس سب غلط ہوں اور کونی شعاعوں کا منبع ان کے بتائے ہوئے مقامات ہرگز نہ ہو لیکن پھر یہ کہاں ہوگا؟ مستقبل کی تحقیق اس کا جواب دیگی۔

## انکشاف

۲۲۶- کونی شعاعوں کے وجود کو کئی طریقے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تین طریقے عام ہیں۔ (۱) برق نما کے ذریعے (۲) سحابی کمرے (Could chamber) کے ذریعے (۳) گیگرملر (Geiger Mueller) کے آلے کے ذریعے چونکہ کونی شعاعوں کا طول موج بہت چھوٹا ہوتا ہے اس لئے انھیں لا شعاعوں کی طرح دیکھا نہیں جا سکتا بلکہ صرف ان کے اثرات کے ذریعے سے پہچانا جا سکتا ہے

ان آلات کے علاوہ آجکل (Dr Compton Oosmic Ray Neon Flasher) بہت مشہور ہو گیا ہے جس کو شکاگو یونیورسٹی کے نوبل انعام یافتہ پروفیسر Compton کمپٹن نے تیار کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر ٹامس جانسن کا (Cosmic Ray Hodoscope) سب سے زیادہ ترقی یافتہ آلہ ہے۔ اس آلہ کے ذریعہ کونی شعاعوں اور تاب کار شعاعوں میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ اس آلہ میں ایک متحرک کیمرہ بھی نصب کیا گیا ہے جو کونی شعاعوں کے راستے کا عکس مرتسم کر لیتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کونی شعاعیں ایک منٹ میں چالیس مختلف راستوں سے نازل ہوتی ہیں اگر ان کے راستے میں سیسہ یا اور کوئی دھات رکھ دی جائے تو یہ وہ

منفی ہو جانے ہیں۔

## کونی شعاع کا استعمال:

سائنسدانون کا خیال ہے کہ ہر کونی شعاع کی توانائی جوہرون کے شدیدترین ردعمل سے دس لاکھ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہ شعاعین لاکھون بلکہ کروڑون وولٹ کی قوت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اگر ان پر قابو حاصل ہوگیا تو انسان کو بغیر کسی خرچ کے طاقت کا عظیم الشان خزانہ ہاتھ لگ جائیگا۔ اگر کونی شعاعون سے پانی کے چند قطرون کے جوہرون کو توڑا جائے تو اس سے اس قدر توانائی حاصل ہوگی کہ اس سے واشنگٹن جیسے بڑے شہر کو پوری رات روشن رکھا جاسکتا ہے۔

جوہری توانائی کے حصول سے دنیا آج جتنی حیرت زدہ ہوگئی ہے کونی شعاعون کی تحقیق میں کامیابی اس سے کئی گنا زیادہ تعجب کا باعث بن جائیگی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہون کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی



محمد عظمت اللہ
متعلم سال اول

# اسلام میں معاشرہ کا تصور

از
ڈاکٹر سید عبداللطیف

عرصہ گذرا ایک انگریز شاعر میتھو آرنلڈ نے "انقلابات" کے موضوع پر چند اشعار قلمبند کئے جو حسرت اور یاس و گداز سے لبریز اور انتہائی درد میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

"Before man parted for this earthly strand,
While yet upon the verge of heaven he stood,
God put a heap of letters in his hand
And bade him make with them what word he could.

انسان کے کرۂ ارض پر اپنی جدوجہد شروع کرنے سے قبل اس وقت جب کہ وہ ابھی آسمان سے نکلنے ہی کو تھا۔ خداوند قدوس نے اس کے ہاتھ میں حروف کا ایک انبار رکھ دیا اور انسان کو حکم دیا کہ وہ اس سے جو بھی لفظ بنا سکے بنائے۔

And man has turned them many times:
made Greece, Rome, England, France:--
Yet, not in vain essayed Way after way,
changes that never cease)
The letters have combined
Something was made."

انسان نے ان حروف کو بارہا الٹا پلٹا ہے، یونان بنایا، روم، انگلستان، فرانس:-
پھر بھی سعی ناکام رہی یکے بعد دیگرے ایسی ایسی تبدیلیاں جن کا کوئی ٹھکانا نہیں!
جب بھی الفاظ ملے، کچھ نہ کچھ بنایا ہی گیا"

سچ ہے، کچھ نہ کچھ تو بنایا ہی گیا، لیکن شاعر کی تشفی نہیں ہوئی۔ انتہائی یاس کے عالم میں وہ اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

"Ah! an inextinguisable sense
Haunts him that he has not made what he should
That he has still, though old, to recommence,

"حیف! وہ احساس اس کے کبھی جدا نہ ہونے والا یہ خیال ہمیشہ اس کے ذہن میں جاگزیں رہتا ہے کہ اس نے وہ نہیں بنایا جو اسے بنانا چاہئے

"And empire after empire,
at their height of away,
feet this booing sense come on;
Have felt their huge frames not
constructed right,
And dropped, and slowly died upon
their throne."

تھا۔ اور یہ کہ ابھی اسے کو کافی عرصہ گذر
چکا ہے، پھر سے ابتدا کرتی ہے اس لئے کہ اس کو
ابھی تک لفظ اللہ کی مرضی کا علم نہ ہوا تھا
اور سلطنت کے بعد سلطنت انتہائی
عروج کو پہونچ کر بھی اسی جذبہ کے قبل از قبل
عود کر آنے کو محسوس کرتی رہی ہیں انھوں نے
یہ بھی محسوس کیا کہ ان کا ڈھانچہ گو عظیم تھا
لیکن پھر بھی اس کی تکمیل صحیح طور پر نہیں ہوئی
تھی اس لئے وہ تباہ و تاراج ہوئیں اور بالآخر
ختم ہو گئیں۔



انسانی معاشرہ کی کہانی کا یہ لب لباب ہے جو آرنلڈ کے ذہن نشین ہوا ہے۔ لیکن شاعر کی رسائی صرف یورپ کی حد تک ہے۔ اگر صرف یورپ ہی کی حد تک ہم محدود رہیں تب بھی ان افکار کے بعد خود یورپ میں انسان نے اس کے بعد جو کھیل نئے الفاظ بنانے کے کھیلے ہیں اور جس کا سحر اس دیس کے باشندوں پر ابھی باقی ہے اس سے آرنلڈ قطعاً ناواقف ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو نہیں معلوم ان جدید اور آئے دن نئے نئے کھیل کھیلنے پر اس کے جذبات کیا ہوتے اور وہ کس قدر یاس و حسرت سے ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔

میتھو آرنلڈ کے لئے یہ امر کوئی زیادہ مشکل نہ تھا کہ وہ بنی نوع انسان کی تاریخ کا وسیع مطالعہ کرنے کے لئے اپنے بر اعظم کے حدود سے کچھ آگے بھی دیکھتا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ آیا کبھی اور مقام پر انسان نے ربانی قوتوں کی جولانگاہ کے آگے سر تسلیم خم کیا ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار یاس و حسرت سے معمور ہیں۔ پھر بھی یہ ضرور ہے کہ وہ ایک چیز پر زور دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انشاء اللہ کے الفاظ میں جس جذب اندرون کا اظہار انسان کرتا ہے اس کی تائید کسی اور لفظ میں نہیں کہ جس سے اس کو حقیقی مسرت و انبساط حاصل ہو۔ بہ الفاظ دیگر کوئی معاشرہ اس وقت تک اپنے آپ کو عرصہ دراز تک قائم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ کسی روحانی جواز زندگی کی اس سے تشفی بخش طور پر تکمیل نہ ہو سکے۔ یہ خواہش کہ حکومت الٰہی کا کرۂ ارض پر تسلط ہو اور حکم ربانی ہی کارفرما رہے جس طرح کہ بہشت میں ہوتا ہے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس قسم کے کسی جواز کی عدم موجودگی ہے کہ جس سے

انفرادی زندگی محکوم ہو اور جس کے باعث بیرونی دنیا سے انسان کا کوئی روحانی تعلق قائم رہے۔

## فطری مذہب

یہ بات نہیں ہے کہ اس قسم کے قانون فطرت سے انسان ناواقف ہے یا اُسے اس کا علم نہیں۔ فرقان مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ تو خود جذبۂ روں ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ. ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.

تم صحیح دین پر ثابت قدم رہو۔ یہ دین باری تعالیٰ کا وہ راستہ ہے جس پر گامزن ہونے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ خدا کے ان فطری اصولوں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ ایسے ہیں جو اس سے ناواقف ہیں۔

قرآن مجید میں بار بار اس جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان جن چیزوں کو بچشم خود دیکھتا ہے وہ ان سے ہی غفلت برتتا ہے کارگاہ قدرت کی بوقلمونیاں فضائے بسیط میں گردش کرنے والے سیارے کہ جن سے زمین کو شب و روز کا دوران حاصل ہوا ہے اور نور و تاریکی کا تبادل یہ بادلوں کے قافلے کے قافلے جو زمین کی آبیاری کے لئے آسمان پر منڈلاتے رہتے ہیں یہ چھوٹا سا بیج جسے انسان زمین کی تاریکیوں میں دفن کرتا ہے اور جو ایک لہلہاتے شاداب پودے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور انسان کی بقا کے لئے اس کو غذا فراہم کرتا ہے اور خود اس کا اپنا وجود جو ایک قطرۂ خون سے ترقی کر کے منصۂ شہود پر ایک ہنگامہ خیز صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اس کے رفقاء حیات جو اس کے سکون قلب کا باعث ہوتی ہیں یہ سب کچھ اور ایسی کتنی ہی چیزیں ہیں جو پکار پکار کر اس بات کا اظہار کر رہی ہیں کہ یہاں تمام چیزوں کا ایک مقصد وجود اور ایک قانون کارفرما ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے انسان کا وجدان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ؛

اے پروردگار تو نے یہ سب بیکار پیدا نہیں کیا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.

ہم نے زمین و آسمان اور ان تمام چیزوں کی جو ان دونوں کے درمیان موجود ہیں کھیلنے کے طور پر تخلیق نہیں کی۔ ہم نے ان کو حق و صداقت کے ثبوت کے لئے وجود عطا کیا ہے مگر اکثر لوگ اس کو جانتے ہی نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ

کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ ہی کی وہ ذات ہے جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کر دیتی ہے۔

وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى:

اسی نے شمس و قمر کو مسخر کر رکھا ہے جو ایک [illegible] اپنے راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ:

اسی نے ستاروں کی تخلیق کی ہے تاکہ [illegible] ارضی اور بحری تاریکیوں میں اپنا راستہ معلوم کر سکو ہم نے اپنی نشانیوں کو ان لوگوں کے لئے بالتفصیل بیان کر دیا ہے جو ان سے واقف ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ. ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ. ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا. ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ. فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ.

یقیناً ہم نے انسان کو جوہر خاک سے پیدا کیا ہے پھر ہم نے رحم میں اس کو نطفہ بنا دیا۔ اس کے بعد ہم نے اس نطفہ کو ایک گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل کر دیا۔ پھر اس گوشت کے لوتھڑے کو ایک مجسمہ کی شکل دی اور اس مجسمہ میں ہڈیاں بنائیں اور ان ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنا دیا۔ تب اس کو ایک [illegible] تخلیق کے طور پر پیش کیا۔ اس لئے تمام برکتیں اللہ ہی کیلئے ہیں جو بہترین خالق ہے۔



وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً. إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ.

باری تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں کے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں ہیں سے تمہارے ہی لئے بیویوں کو اس کے لئے پیدا کر دیا ہے تاکہ ان میں سکون قلب پاؤ۔ اور تمہارے درمیان محبت و ہمدردی بھی پیدا کی۔ بلاشبہ ان چیزوں میں ان لوگوں کے لئے ربانی نشانیاں موجود ہیں جو ان پر غور و فکر کرتے ہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ

تخلیق زمین و آسمان اور تمہاری آپس کی لسانی اور رنگ کے اختلاف بھی اسی حق تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ مگر یہ نشانیاں ان لوگوں کے لئے ہیں جو ان کو سمجھ بھی سکتے ہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ.

تمہارا رات اور دن میں سو جانا اور فضل باری کی خواہش ظاہر کرنا بھی اسی کی نشانیوں سے ہے۔ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لئے ہے جو ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَ

یہ بھی اس کی نشانی ہے کہ وہ تمہیں بیم و رجا کے طور پر

وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ؏

برق دکھلاتا ہے ۔ اور آسمان سے بارش برساتا ہے جس سے مردہ زمین کو پھر تروتازہ کر دیتا ہے۔ عقلمندوں کے لئے ان میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں

تَبٰرَكَ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۔ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ۔

وہ ذات کتنی بابرکت ہے جس نے آسمانوں کے سات طبقے بنائے اس کی اس تخلیق میں کوئی تفاوت و بے اعتدالی نظر نہ آئے گی ۔ پھر ایک اور مرتبہ دیکھو ۔ کیا تمہیں کوئی نقص یا خلل نظر آرہا ہے ؟ بار بار دیکھتے جاؤ ۔ بالآخر تمہاری نظر تھک کر ناکام رہ جائے گی

## متضاد عمل

اسلام تو کسی ایسی بات کی جانب اشارہ نہیں کرتا کہ خدا نے انسان کے ہاتھوں میں اسے جہانبانی کے لئے رخصت کرتے ہوئے چند حروف رکھ دئے اور حکم دیا کہ وہ ان سے کوئی بھی لفظ بنا لے بلکہ کلام مجید میں تو اس سے بالکل متضاد چیز بتلائی گئی ہے ۔ انسان کو تو وہ لفظ خود بتلایا گیا تھا اور نہ صرف اس کو اس سے روشناس کرایا گیا بلکہ اس کے معنیٰ و مطلب بھی اچھی طرح ذہن نشین کروادئے گئے اور مبادی وہ اسے فراموش کر جائے اور اس کی ترکیب و ترتیب سے لاعلم رہ جائے اس لفظ کو اس کی فطرت ہی میں ثبت کر دیا گیا ۔ اور حکم دیا گیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ قائم رکھے کھیلنے کے لئے نہیں اور نہ ہی اس کی ترکیب کو بگاڑنے کے لئے بلکہ اس لئے کہ وہ اس کو استعمال کرتے ہوئے وہ نہ صرف خود بلکہ ساری دنیا کے ساتھ پُر امن طریقہ پر زندگی بسر کرے ۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ ۔ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ۔ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ؏

جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے یہ کہا کہ دیکھو میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ۔ تو فرشتوں نے عرض کیا کہ اے خدا کیا تو زمین پر ایسے شخص کو خلیفہ بناتا ہے جو فساد برپا کرتا اور خونریزی کرتا ہے ۔ حالانکہ ہم تو تیری تسبیح و تحمید و تقدیس کرتے رہتے ہیں ۔ خدا تعالیٰ نے کہا کہ میں ان تمام چیزوں کو جانتا ہوں جو تمہارے احاطہ علم سے خارج ہو ۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔

آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کے نام سکھلائے پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کرکے کہا کہ اگر تم حق بجانب ہو تو ذرا ان چیزوں کے نام تو بتلاؤ ۔

قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ. قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ. فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۔

فرشتوں نے عرض کیا کہ بار الٰہا تیری ذات ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ ہم صرف وہی جانتے ہیں جس کا تونے ہمیں علم دیا ہے بیشک تو تمام چیزوں کو جاننے والا اور ان کی حقیقتوں کو اچھی طرح سمجھنے والا ہے۔ تب آدم سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے آدم ان چیزوں کے نام بتلا دو۔ جب آدم علیہ السلام نے ان کے نام بتلا دئے تو ارشاد باری ہوا کہ کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا میں زمین و آسمانوں کی تمام مخفی چیزوں سے واقف ہوں۔

اس طرح "اسماء" یعنی اسرار ارض و سماء اس پر روشن کر دیے گئے یا "اشیاء" کا مفہوم یا ان کے وجود کے جواز کو واضح کیا گیا اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس سے تقاضا کیا گیا کہ وہ "وحدت وجود" کا اقرار کرے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ ۔

جب تیرے پروردگار نے اولادِ آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو اخذ کر کے انہیں اپنے نفوس پر گواہ بنایا اور یہ کہا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے بیک آواز جواب دیا کہ ہاں۔

اس طرح کے جذبات و احساسات سے لیس ہو کر فطرتِ انسانی نے اپنے آپ کو خلافتِ الٰہیہ کا بوجھ اُٹھانے کے قابل بنا لیا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۔

ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی۔ لیکن یہ اس کے حامل نہ ہو سکے بلکہ اس سے گھبرا گئے۔ صرف انسان اس کا حامل بن سکا۔

اور اس بارِ عظیم کو اُٹھانے میں معاون ہونے کے لئے اُسے احساسِ توازن سے سرفراز فرمایا گیا۔ تاکہ وہ اُس "لفظ" کے "حروف" کو ان کے صحیح مقام پر رکھ سکے اور اس سے کہا گیا کہ اِس کا اس باب میں امتحان لیا جائے گا۔

اللّٰهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ ۔

صرف اللہ ہی کی ذات ہے جس نے کتاب کو حق و صداقت اور صحیح توازن کے ساتھ نازل فرمایا۔

الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ. الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۔

وہ خدا جس کی ذات رحمت ہی رحمت ہے اسی نے قرآن کی تعلیم دی اور انسان کو پیدا کر کے اس کو گویائی عطا کی شمس و قمر

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ . وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ . أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ . وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۔

ایک سلک کے تابع ہیں اور ستارے اور درخت سجدہ ریز ہیں۔ اسی نے آسمان کو بلند کیا اور ایک میزان قائم کردیا تاکہ تم غلو نہ کرسکو۔ تم انصاف کے ساتھ ناپ تول کرتے رہو اور کبھی بھی اس میں کمی نہ کرو۔

ان استعاروں میں اسلام کے مقدس صحیفہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ارض و سماء اور جو کچھ اس کے مابین واقع ہے اس کی تخلیق کوئی بازیچۂ اطفال نہیں بلکہ ہر ایک شئے کا وجود اس کا مظہر ہے کہ کوئی خاص سنجیدہ مقصد کے لئے یہ عمل ہوا ہے۔ ہر شئے فطرت کے مقررہ قوانین کو پورا کرتے ہوئے اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کرتی ہے اور یہ کہ فطرت انسانی میں احساس توازن و تمیز ودیعت کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے وجود کے قوانین کی تعمیل و تکمیل کرے۔ فرقان مجید کا کہنا بھی یہی ہے کہ "یہی اصلی دین ہے دین متین، حکم ربانی، جو انسان کی فطرت میں ثبت کیا گیا ہے" لیکن انسان نے اپنے آپ کو ظالم اور جاہل ثابت کیا ہے" اور اس نے روئے زمین پر فساد پھیلایا ہے "

## نسلِ انسانی کی طرح اسلام کی قدامت

۲۲۵

پس زندگی کے اس قانون اور اس دین متین کو اس کے ذہن میں تازہ رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے "مرسلین" یا پیغمبر روانہ کئے گئے تاکہ زبان انسانی ہی سے ربانی پیام ان تک پہنچے اور یہ لوگ وحی کے ذریعہ پیغام الٰہی حاصل کرکے انسانی فطرت کے قوانین کے مطابق کام کی تکمیل کروائیں اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی ان انسانوں میں بود و باش اختیار کرکے خود ان قوانین پر عمل پیرا ہوکر تمام کے لئے ایک نمونہ ثابت ہوں۔ ان کی بعثت کا مقصد اس توازن کو برقرار رکھنا تھا جس میں انسانوں کی خود غرضیوں اور گمراہیوں کی وجہ سے خلل اندازی ہوئی تھی اور انسانوں کو ایک متحدہ اور ہم آہنگ زندگی گذارنے میں مدد دینے پر بھی یہ پیغمبر مامور تھے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۔

تمام انسان ایک وحدت میں تھے۔ اس کے بعد ان میں اختلافات پیدا ہوتے گئے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا

انسانوں کی متحدہ جماعت تھی۔ مگر جب انہیں اختلافات رونما ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بناکر مبعوث فرمایا۔ ان کیساتھ حق و صداقت سے لبریز ایک کتاب بھی نازل فرمائی تاکہ اس کی مدد سے لوگوں کے آپسی اختلافات کو دور کرسکیں۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ

تم سے پہلے بہت سے سانحے گزر چکے ہیں۔ تم خود اس سرزمین کا سفر کرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے ۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ.

یقیناً ہم نے حق و صداقت کے ساتھ خوشخبری دینے والے اور عذاب حق سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ۔ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا بھیجا نہ گیا ہو ۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِى الْاَوَّلِيْنَ. وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ .

ہم نے کتنے نبیوں کو امم سابقہ میں مبعوث کیا۔ کوئی ان میں ایسا نہیں آیا جس کا انھوں نے مضحکہ نہ اڑایا ہو۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ .

ہم نے بہت سے رسولوں کو بھیجا جن میں سے بعض کے حالات تو تمہیں بتا دئے اور بعض کے نہیں ۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔

تمہارے لئے ایسا دین بنایا جس کی وصیت ہم نے نوح علیہ السلام سے کی تھی اور جس کی تم پر وحی اتاری اور جس کی ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ سے بھی وصیت کی تھی کہ دین کو مستحکم کریں اور اس میں تفرقہ نہ ڈالیں۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ ! وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۔

اے پیغمبرو ! یہ تمہاری اُمت ایک متحدہ جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں اس لئے مجھ سے ڈرو ۔

اس طرح کلام مجید میں اس کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ جس مذہب کی اشاعت پیغمبر عرب نے اپنے لوگوں میں فرمائی اس میں ان سے اس کا مطالبہ کیا کہ وہ انھیں اور زمین کے چپے چپے پر خدا کی وحدانیت کا اعلان کریں اور بتائیں کہ وہی ہر چیز کا خالق ہے جس کی محبت ہمہ گیر ہے اور انسانوں میں یک جہتی اور اتحاد و اتفاق و باہمی محبت کی تعلیم دی۔ یہ کوئی نیا مذہب نہیں یہ تو وہی دین فطرت ہے جو فطرت کا جزو لاینفک ہے وہی جو ہر قوم کے نبی پر نازل فرمایا گیا اور کلام مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبین یا توحید الٰہی کی حقانیت کا پیام لانے والوں میں سب سے آخری پیامبر ہونے کی بشارت دیتا ہے کیونکہ آپ ہی کی وساطت سے اس عقیدہ کی تکمیل کو پہنچانے والی تعلیم دی گئی اور توحید کے مفہوم کو اتنی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا کہ اس میں اور کسی قسم کے اضافہ یا ترمیم کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ فرمان مجید پیغمبر عرب کو " رحمۃ للعالمین" سے بھی مخاطب فرمایا گیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

رسول اللہ صلعم کی بعثت ایسے زمانے میں ہوئی جبکہ انسانیت خیالات و احساسات کی نراجی کیفیات [illegible] اور تہذیب کے آثار عرصہ سے دورِ جاہلیت کے زبردست بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔

## توحید ربانی اسلامی معاشرہ کا سنگِ بنیاد ہے۔

اس ممتاز عقیدہ کی سچائی کی شہادت ابتک تاریخ دیتی رہی رہے گی کہ آنحضرت صلعم کے بعد سے اب تک اسلام کے اس عظیم الشان عقیدہ نے دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے مذہبی خیالات پر اتنا گہرا اور دور رس اثر مرتب کیا ہے کہ ان کی مزید وضاحت کے لئے اسی صداقت بیان سے پیرایہ مستعار لینا ہوگا جس کی انتہائی مخالف حالات میں بھی پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاعت فرمائی اور جس کے لئے اپنی ساری زندگی وقف فرماکر آپ نے انسانیت کے لئے ایک دائمی میراث چھوڑی ہے۔ موجودہ دور کے ممتاز و پیش پیش رہنے والے مسیحی مبلغ ریورنڈ سی ایف اینڈ روز نے اپنے ایک حالیہ مضمون "اسلام کے طریق عمل" میں تحریر فرمایا ہے۔

"مشرق و مغرب پر اسلام نے جو عظیم احسانات کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے انسانی تاریخ کے ایک نازک موقع پر عقیدہ توحید ربانی کی اہمیت واضح کی کیونکہ مشرق و مغرب میں ۶۰۰ تا ۱۰۰۰ عیسوی کے دوران میں جو تاریک زمانہ چھایا ہوا تھا اس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ یہ عقیدہ خود مسیحی دین اور ہندومت میں بھی بے شمار مجازی خداؤں، دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے ہجوم میں گم نہ ہوجائے۔ یورپ و ہندوستان ہر دو کے لئے ایک ایسے دور میں جبکہ یہ براعظم تاریکی و جہالت و ضلالت سے گھرے ہوئے تھے اسلام ایک زبردست شہادت کے طور پر خداوند قدوس کی وحدانیت ثابت کرنے کے لئے رونما ہوا اور ان کے لئے ایک اصلاحی تحریک کے طور پر پیش ہوا یورپ و ہندوستان کے بالمقابل اپنے مرکزی مقام سے اسلام نے حقیقت میں جو درس صداقت دیا ہے اس پر کسی قسم کا زور بیان صرف کئے بغیر یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ امر مشتبہ ہے یا نہیں کہ خدا کے متعلق اس قسم کا خیال و تصور جو ذہن انسانی میں جگہ حاصل کرچکا ہے موجودہ دور ذی نفسیات میں کسی انسان کے دماغ میں بھی آسکتا تھا۔"

توحید ربانی کا یہ عقیدہ جس کو ختم المرسلین آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا وہ در اصل اُمتِ محمدی یا معاشرہ اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ ایک بالکل سیدھا سادہ عقیدہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

محمد رسول اللہ" کوئی معبود سوائے اللہ کے نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں۔ اور جو کوئی اس عقیدہ پر ایمان لاتا ہے وہ فوراً اس امت میں شامل ہو جاتا ہے اور ایک ایسے اخوت کے رشتہ اتحاد میں منسلک ہو جاتا ہے جہاں رنگ و نسل یا جاہ و مرتبہ زندگی کا کوئی مقام نہیں اور جہاں کردار کی بلندی اور اخلاق کی درستی و استواری ہی ترجیح کا معیار قرار پاتے ہیں۔ جہاں ہر شخص کو دوسروں کے ساتھ رشتہ اخوت کے فرائض بجا لانا ضروری ہے اور ان فرائض کی انجام دہی کے بغیر وہ اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اور جہاں اس طرح کی زندگی گذارنا ہی خدائے تعالیٰ کی حقیقی عبادت ہے۔

اسی بناء پر فرقان مجید اُمت اسلامیہ کو "خیر الامتین" یعنی بہترین جماعت سے مخاطب کرتا ہے۔ جس کے ہر رکن کو رضائے الٰہی یا قانون ربانی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہوتا ہے یا جو اصطلاح اس سے قبل استعمال کی گئی ہے اسی میں "فطرت انسانی میں جو توازن قائم کیا گیا ہے" اسکی وضاحت اور اس کا انکشاف کلام مجید میں فرمایا گیا ہے۔ قانون ربانی نہ تو کوئی سخت قانون ہے نہ ہی اس کی مرضی یا حکم ایک جابر حاکم کی مرضی کی طرح ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ — خدا تمہاری آسانی چاہتا ہے نہ کہ تمہاری دشواری۔



لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا : — خدا کسی پر بھی اتنی ذمہ داری عائد نہیں کرتا جو اس کی وسعت سے باہر ہو۔

اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسان کو خود اپنے اور اپنے ہم جنس بلکہ پوری کائنات کے ساتھ پُرامن طریق زندگی اور ان سے ہم آہنگی کے ساتھ رہنے بسنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ اسلام کے معنی ہیں سلامتی یا تسلیم یعنی اپنی ساری صلاحیتوں کو خدا کی مرضی کے حوالے کر دینا اور خدا کی مرضی وہی قانون زندگی ہے جسے اس کی لا محدود حکمت نے ہمارے لئے بنایا ہے تاکہ ہم آپس میں مل جل کر اور امن و سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اس طرح اس کے وحدت وجود کا مظاہرہ کریں۔ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی امن اور ہم آہنگی و یگانگت کے اس قانون کے نقطۂ نظر سے دیکھے۔

قرآن مجید اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کہے :-

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ — یقیناً میری نماز میری قربانی میری زندگی اور موت صرف اس خدا کے لئے ہے جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔

اس طرح سے اگر زندگی کا محاسبہ کیا جائے تو انسان کا ہر عمل روحانی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔
فلسفہ ثبوتیت کا قائل، آگسٹ کونت کے نظام فلسفہ کا پیروڈاکٹر جے ایچ برجس نے
۱۸۶۹ء میں ایک خطبہ میں جو عبادت و عمل" کے عنوان پر دیا گیا تھا کہا ہے :۔
"مسلمان کا عقیدہ صرف ایک ہی لفظ اسلام یعنی عبادت اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی یعنی رضائے الہی کے حوالے کرنے میں پوشیدہ ہے یہ لفظ حضرت محمد نے صرف اپنے پیروؤں تک محدود نہیں رکھا۔ آپ سے پہلے یہودی اور مسیحی پیروؤں نے بھی انکو بلاتکلف استعمال کیا بہ نسل انسانی کے مذہب کے لئے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں مل سکتا اور اگر مغربی زبانوں میں کوئی لفظ اس کے مفہوم کو پوری طرح ادا بھی کر سکتا ہے تو وہ "رلیجن RELIGION" کا لفظ خود ہے جو کان لاطینی الفاظ سے نا آشنا ہیں ان کے لئے اس کی بھی تشریح ضروری ہے۔ ہمارے لئے لفظ اسلام اسی طرح جس طرح کہ حضرت محمدؐ کے پیروؤں کے لئے، کھلا ہوا اور واضح ہے کہ اس کے دو ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے والے پہلو ہیں۔ عبادت و عمل۔ حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ عبادت کرو اور خیرات دو۔ یہاں خیرات دینے کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے یعنی ہر قسم کی بھلائی جو انسان کسی دوسرے انسان کے لئے کر سکتا ہے جس کا تصور وقت کی ضروریات کے لحاظ سے بہتر عقل و فہم کی اضافی صورت میں انسان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کی صورت میں ہو سکتا ہے عبادت کرو اور عمل کرو کا پیغام عہد وسطی کے اس عظیم ہستی نے دیا ہے عبادت کرو اس طرح جیسے کہ عمل سے کچھ نہیں ہوگا اور عمل کرو اس طرح کہ گویا عبادت سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ یعنی عبادت میں عمل اور عمل میں عبادت کا کوئی جداگانہ عنصر نہ ہو"
ہر دور اور ہر ملک میں انسانوں کے روحانی پیشواؤوں نے بار بار مختلف طریقوں سے مختلف زبانوں اور رموز میں بیان کیا ہے۔ میں نے کنفیوشس کے عقیدہ میں بھی اسی بات کو پایا ہے جس نے اس عقیدہ کے تحت پچیس صدیوں تک چینیوں کو ایک ہی معاشرہ میں مربوط کر دیا ہے۔ اسی چیز کو میں نے ہندوستان کی قدیم مذہبی حکومتوں میں دیکھا ہے۔ مصر کے ان آثار میں بھی پایا جاتا ہے جو جدید علم کے بل بوتے بتدریج منکشف ہوتے جا رہے ہیں۔ فیثا غورث کی ابتدائی کاوشوں میں بھی میں اسی کی جھلک دیکھتا ہوں جو ابتدائی ہونے کے باوجود زندگی کی منظم بنیادوں کے

لے سود مند ہے۔ اور بالآخر اسی بات کو میں نے اس جگہ بھی دیکھا جس کے متعلق
زیادہ تر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ اس قسم کے علم کے سرمایہ کی اجارہ داری حاصل
ہے یعنی یہودی صحیفوں اور مسیحی انجیل اقدس میں بھی مجھے یہی بات نظر آئی۔
اس لحاظ سے اسلام یا پھر ہماری انگریزی زبان کے لحاظ سے ریاضت یا اعلیٰ
ترین ذات کے آگے مکمل اطاعت یا راضی برضائے الٰہی ہونا ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ اور
ہر ملک میں زہد و تقویٰ رکھنے والوں کی زندگی کو حقیقی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ انہوں نے
اپنے آپ کے لئے ایک نصب العین اور مسلک کو ایک حقیقت کی صورت میں پیش کرنے
کے لئے انہوں نے وہ سب کچھ کیا ہے جو ان سے ممکن ہو سکتا تھا، بالفاظ دیگر اصول
نے عبادت و عمل ہر دو چیزیں الگ کی ہیں"
رضائے الٰہی بالآخر ہے کیا کہ جس کی تکمیل کے لئے انسان کی تخلیق عمل

## انسان کا مقصدِ حیات

میں لائی گئی ہے دوسرے الفاظ میں انسان کا دنیا میں مقصدِ حیات
اس رضائے الٰہی کے مطابق کیا ہے جس کی ترجمانی قرآن مقدس میں فرمائی گئی ہے؟

۲۴

دنیا میں انسان کا کام دوگونہ ہے ایک تو عقیدہ یا ایمان اور دوسرے اس کے مطابق عمل
مسلمان کو صرف عبادت اور عمل کا حکم ہی نہیں دیا گیا جیسا کہ ڈاکٹر برجس کا خیال ہے بلکہ اس کے برخلاف
"یقین و عمل" اسلامی زندگی کے اجزاء ہیں، اسلام میں عبادت روح کا ایک عمل ہے اور اسی لئے عمل
کے عنوان کے تحت یہ کام بھی شریک ہو جاتا ہے۔
مسلمان کا عقیدہ وحدت وجود کے تصور میں مرکوز ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔
چنانچہ صرف خدائے تعالیٰ ہی تمام قوت اور علم کا منبع ہے اور اس کے علم و ارادہ کے بغیر کوئی چیز روبہ عمل
نہیں لائی جا سکتی خواہ انسان اسے اپنی جگہ فہم و فراست کے مطابق اچھا یا برا سمجھے اس قسم کے رضائے
الٰہی پر جو اپنے مقصد میں جو اول تا آخر رحمت ہی رحمت ہے عقیدہ رکھنا لابدی ہے اور اس کے ساتھ
ساتھ یہ عقیدہ بھی فطری طور پر لازمی ہو جاتا ہے کہ صرف یہی پیش نظر مادی و طبعی کائنات ہی خدا کی تخلیقی
قوت اور ارادہ کا واحد مظہر نہیں ہے بلکہ ایک ایسی اَن دیکھی دنیا بھی وجود رکھتی ہے جو اَن دیکھی قوتوں کی
جولانگاہ ہے۔ ان قوتوں میں سے بعض کو قرآن مجید نے ملائکہ یا فرشتوں کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور یہ اپنی
فطرت کے قوانین کو پورا کرتے ہوئے اور اس مشترکہ مقصد کو نظر میں رکھ کر جو ذات باری تعالیٰ کی توحید میں
پوشیدہ ہے۔ انسانوں کی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں چونکہ انسان کی نظر خدا کا ادراک نہیں کر سکتی اور

خود خداوند قدوس اپنے جلوۂ حقیقت کو انسان کی نگاہوں پر آشکار کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ رضائے الٰہی انسان ہی کے لئے ظاہر ہوتی ہے اور اسی کی وساطت سے یہ عمل ہوتا ہے تاکہ وہ اسے بخوبی سمجھ سکے۔ ایسے برگزیدہ انسانوں یعنی پیغمبروں اور ان پر نازل کئے ہوئے مقدس صحائف اور بالآخر حیات بعد ممات پر ایمان مسلمان کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے خدا کے بتلائے ہوئے راہ عمل کے مطابق یا اس سے غفلت برت کر جس طریقہ سے بھی انسان نے اس دنیا میں اپنی زندگی بسر کی ہے اور اس کا جو کچھ بھی ردِ عمل اس کی روح میں پیدا ہوا ہے حیات بعد ممات میں انسان اسی سے واقف ہوکر ایک نئی زندگی گزارے گا جس کی ان مقدس صحائف میں توضیح کی گئی ہے۔

متذکرۂ بالا۔ چھ عقائد جن سے انسان کا عقیدہ تشکیل پاتا ہے اتنے سادہ ہیں کہ انسان کی فہم عامہ کے لئے فوراً قابل قبول قرار پاتے ہیں بشرطیکہ فرقان حمید کے قول کے مطابق کوئی شخص کائنات میں بکھری ہوئی اور زندگی کے عام روزمرہ مشاہدہ میں آنے والے اور محسوس ہونے والے تجربوں کی ہزارہا نشانیوں پر غور و فکر کرے اس کے ساتھ ساتھ یہ عقائد اس طرح سے فطری طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور وحدت وجود کے مرکزی عقیدہ کے "کہ جس کا موجودہ عقلی دنیا میں بھی کوئی مدمقابل نہیں"! گرد گھومتے ہیں اور منطق اور موجودہ سائنسی کارناموں سے کامل توافق رکھتے ہیں کہ ایک انتہائی متشکک انسان تک بھی ان کی صداقت کو محسوس کرتا ہے۔ ان عقائد کے بیان پر بحث و تمحیص سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ عقائد انسان کو ایک سماجی وجود یا معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے جس انداز سے متاثر کرتے ہیں اس کی اہمیت کو پوری طرح سے سمجھ لیا جائے۔

## کائنات میں انسان کا مقام

سب سے پہلا سوال جس پر ہمیں بحث کرنی ہے وہ یہی ہے کہ اسلام انسان کو کائنات میں کیا مقام عطا کرتا ہے اور یہ کہ آیا یہ مقام ان عقائد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے موزوں ہے؟ فرقان حمید انسان کو کائنات کی کسی مخلوق سے کمتر قرار نہیں دیتا اقدار الٰہی کا اعتبار کرتے ہوئے معیار میں انسان سورج چاند یا افلاک کے ستاروں کے جھرمٹوں سے جو انسانی تاریخ کے قدیم ادوار میں لائق پرستش ہوئی تھی یا پھر درخت، مویشی، آگ پانی، پتھر یا اُن اَن دیکھی قوتوں جنھیں فرشتوں سے موسوم کیا جاتا ہے کسی سے بھی کم رتبہ قرار نہیں دیا گیا۔ کلام مجید میں تو انسان کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اس کی تخلیق "احسن تقویم" سے ہوئی ہے اور اسے مسجودِ ملائکہ بنایا گیا یعنی فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور جو کچھ ارض و سما پر ہے سب اسی کی خدمت کے لئے ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي ‏ — ان تمام چیزوں کو جو ارض و سما میں ہے تمہارے لئے

الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ :

تابع کر دیا۔ بلاشبہ ان میں اس قوم کے لئے نشان ہدایت ہیں جو غور و فکر کرتی ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً :

کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ خدا تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو جو زمین و آسمانوں میں ہیں تمہارے تابع کر دیا ہے اور اپنی ظاہری و باطنی نعمتوں سے تمہیں کامل طور پر نوازا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ،

اسی نے رات اور دن، سورج اور چاند اور ستاروں کو تمہارے تابع بنا دیا ہے یہ تمام اسی کے حکم سے مسخر ہیں ان میں ان لوگوں کے لئے ہدایت کی نشانیاں موجود ہیں جو سمجھ سکتے ہیں۔

---

اس طرح انسان کے مقام کو کائنات میں بلند کر کے اور اسے خدا کے عین بعد درجہ دے کر اس کو دوسری مخلوق پر اس طور پر بھی فوقیت عطا کی گئی کہ اس کو زمین پر خلافت الٰہی کے درجہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

۲۴۲

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔ قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۔ قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتوں نے جواب دیا کہ کیا تو ایسے شخص کو خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد برپا کرے گا اور خونریزی کا مرتکب ہوگا۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تحمید و تقدیس بیان کرتے رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جواباً کہا کہ میں ان تمام چیزوں کا علم رکھتا ہوں جو تمہارے احاطہ علم سے باہر ہیں۔

---

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰكُمْ :

خدا ہی نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کے مراتب کو دوسروں سے بلند کر دیا تاکہ تمہارا اس پر امتحان لے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنا دیا ہے اس لئے تم لوگوں کے درمیان حق و صداقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کرو۔ اور کبھی نفسانی خواہشات کی اتباع نہ کرو ورنہ یہ تمہیں راہ خدا سے گمراہ کر دیں گے۔

**آزاد عامل** ۔ یہی مقام اور وقار ہے جو انسان کو بقیہ مخلوق سے ممتاز کرتا ہے اور اُسے زندگی کے دشوار گذار راستہ پر اسی مقام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کے کامل احساس کے ساتھ سفر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اس کو اس کی فطرت کی دوسری صداقت سے بھی واقف کروایا گیا ہے قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ انسان کی روح کو آلودہ کرکے پیدا نہیں کیا گیا اس کی روح بے داغ ہوتی ہے نہ وہ اچھوت بنایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کو کسی ایسے اولین گناہ کے ارتکاب کا مورد قرار دے کر پیدا کیا جاتا ہے کہ جو اس سے پہلے کی زندگی میں سرزد ہوا ہو اور جس کا اسے اب کوئی علم نہ ہو یا اس کے کسی جد امجد سے سرزد ہوا ہو ۔ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق ایک ایسی متوازن روح کے ساتھ انسان کو پیدا کیا گیا ہے جس میں کوئی اندرونی کمزوری نہیں پائی جاتی اور نہ اس کو اپنے عمل کے لئے سوا کسی اور کے بار کو برداشت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ۔ اس طرح سے اس کا رشتہ خدا کے ساتھ اس کے ہم جنسوں میں مساوی کر دیا گیا اور اس سلسلے میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز برقرار نہیں رکھا گیا۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔

جو راہِ مستقیم پر گامزن ہوتا ہے وہ خود اپنے ہی بھلائی کے لئے ایسا کرتا ہے اور جو راہ راست سے بھٹک جاتا ہے اس کا نقصان خود ہی اُٹھائے گا ۔ کسی کی کسی پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔

اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۔

میں کسی کے عمل کو خواہ وہ کسی مرد کا ہو یا عورت کا ضائع نہ کروں گا تم میں سے بعض بعض سے تعلق رکھتے ہیں ۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؛

میں نفس کی قسم کھاتا ہوں اور اس ہستی کی بھی قسم کھاتا ہوں جو اس نفس کو درست کیا اور اس میں یہ صلاحیت ودیعت کر دی کہ وہ اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکے جس نے اس کو پاک رکھا وہ کامران رہا اور جس نے اس کو تباہ کر دیا وہ ناکام رہا

**متناقص قول** قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیتوں کی آخر الذکر آیت کی صداقت متناقص خیال کی صورت میں پیش کی گئی ہے کہ جو بظاہر محال سہی لیکن اس کا ہر جز و مبنی بر صداقت ہے ۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۔

ہم نے بہترین انداز میں انسان کی تخلیق کی ہے ۔ پھر ہم نے اس کو ادنیٰ ترین درجہ تک گرا دیا ۔

ہر زمانہ میں ہر متفکر نے فطرت انسانی کی اس متناقص چیز کو تسلیم کیا ہے چنانچہ شکسپیئر نے ہملٹ کی زبان سے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔

"What a piece of work is man! how noble in reason! how infinite in faculty! in form and moving how express and admirable! in action how like an angel! in apprehension how like a God! the beauty of the world! the paragon of animals! And yet, to me, what is this quintessence of dust? Man delights his not me, no nor woman neither."

ہر مذہب کا کام یہ رہا ہے کہ انسان کی زندگی کے معیار میں اُسے زوال پذیر ہونے سے بچائے رکھے بعض لوگ ایمان یا عقیدہ کو نجات کا راستہ قرار دیتے ہیں لیکن اسلام میں نجات کا ذریعہ صرف عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ "دیانت دارانہ عمل" کو مساوی طور پر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ راہِ عمل ہے جو اس کے احسن تقویم کی محافظ ہے۔ قول متناقص کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسکی وضاحت کرتے ہوئے قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے۔



ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ؕ

پھر ہم نے اس کو ادنیٰ ترین مقام تک گرا دیا۔ مگر ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ایک اجر عظیم دیا جائے گا۔ اب کون اس فیصلہ کی تکذیب کرسکے گا۔

## روحانی قانونِ حیات

پس اس طرح ایک آزاد عامل اور خلیفۃ اللہ بن کر زندگی بسر کرنے اور روئے زمین پر کام انجام دینے کے لئے انسان کو مقرر کیا گیا ہے۔ اس کا مرتبہ خلافتِ الٰہی فہم و ادراک کے لحاظ سے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے بشرطیکہ ہم اسلام کے خدا کے متعلق تصور کی روشنی میں اس کی خصوصیات کی وابستگی کے ساتھ اپنے آپ کو دیکھیں۔ "یقین و عمل محکم" سے خود کو خصوصیاتِ الٰہی سے متصف کرنا عمل ہے اور اس کے بعد پھر کیا کچھ ہے؟ اس کا جواب ہادیٔ برحق پیغمبرِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دہن مبارک سے ارشاد فرمایا ہے۔

التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی عیال اللہ ۔

اللہ کے احکام کی تعظیم کرو اور اللہ کے اہل و عیال (مخلوق) سے شفقانہ برتاؤ کرو۔

پھر ارشاد گرامی ہوتا ہے :-

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ

" ساری مخلوق خدا کے اہل و عیال ہیں۔ خدائے تعالیٰ کو وہی سب سے زیادہ عزیز ہے جو اس کی مخلوق کو عزیز رکھتا ہے ۔"

فرقان حمید خود گہربار ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف جماعتوں اور قبیلوں میں منقسم کر دیا۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں اسی کا مرتبہ باری تعالیٰ کے پاس بلند ہے جو تم سب میں زیادہ پرہیزگار و پارسا ہے خدا تمام چیزوں کو جانتا اور ان سے باخبر ہے۔

مِنْ أَجْلِ ذَٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۚ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ چیز فرض کر دی تھی کہ جو شخص بھی کسی کو جو کسی کا قاتل نہیں تھا یا زمین پر فساد برپا نہیں کیا تھا قتل کر ڈالا، تو گویا اس نے نسل انسانی کو قتل کر دیا اور اگر کسی نے کسی کی جان بچائی تو گویا اس نے انسانیت کو بچا لیا۔

اس لئے خلافت الٰہیہ کے کام کو اس حد تک انجام دینا چاہیئے اور اس کے مفہوم کو بہ احسن وجوہ اس طرح سمجھا دینا چاہیئے کہ انسان یہ کام نہ صرف اپنے ساتھیوں ہی کے لئے کرے بلکہ دنیا کی ہر زندہ شئے کے لئے جو اللہ کی مخلوق ہے اس کا کام ہو جو اسی پروردگار کی تخلیق ہے اور بالآخر اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں "

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم ۚ مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ

وہ حیوان جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور وہ پرندے جو اپنے دونوں پروں سے فضا میں اڑتے ہیں بالکل تمہاری طرح ایک امت کی حیثیت رکھتے ہیں ہم نے اپنی کتاب میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ سب بعد میں اپنے رب کے پاس جمع ہونے والے ہیں۔

**خصوصیات الٰہی کا اظہار** یہ کام کس طرح انجام دیا جائے ؟ یقین و عمل، یقین بغیر عمل کے سکونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ روح الوہیت پر نرا فلسفیانہ تخیل فضول ہے

تاوقتیکہ اس سے قوت ارادی متحرک نہ ہو یا حیات انسانی میں اس سے قدسی صفات کا جذبہ عمل ہم آہنگ نہ ہو۔ بعض یوگیوں جیسی روحانی ریاضتیں یا روحانی نمایاں کام انسان خواہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں محرک اخلاق طرز زندگی فراہم کرنے میں نہ تو مددومعاون ثابت ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے کردار پر سبقت لیجا سکتے ہیں جس طرح کہ دماغ یا روح کی شفقت و تربیت ان دونوں چیزوں کو انجام دیتی ہے اسی طرح یہ بھی بیکار ہو جائے گا۔ اس قسم کا محرک اخلاق اس شخص کے لئے ممکن نہیں ہے جو خانقاہ یا غاروں میں گوشہ نشینی کی زندگی کے ذریعہ انفرادی طور پر روحانی نجات کا متلاشی ہوتا ہے یا اس شخص کے لئے بھی جو تارک الدنیا ہوکر روح کی تربیت ہی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے زمین پر خدا کی خلافت قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ برخلاف اس کے اس شخص کے لئے خدا کی خلافت قائم کرنا بہت آسان ہے جو خود کو الہٰی خصوصیات میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق رنگ لیتا ہے اور خود اپنی عبادت اور اپنے ساتھیوں کی خدمت کے ذریعہ تکمیل کو پہونچاتا ہے۔

ربانی خصوصیات اس ذات قدسی صفات کے اسماء کی طرح مختلف ہیں۔ ان کا شمار ناممکن ہے۔ اس لئے کہ فطرت انسانی کے مطابق اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس ذات اقدس کی خصوصیات و ۲۴۶ حیطہ عمل کا پوری طرح تصور کر سکے۔ اور ہمارا مقصد بھی یہ نہیں کہ اس سوال کے اس پہلو پر ہم کوئی فلسفیانہ توضیحا کا دفتر کھول دیں ہمارا مقصد تو اس سے کہیں تعمیری ہے اس لئے یہ بتلا دینا کافی ہوگا کہ مسلمان کو قرآن حکیم کے الفاظ میں اس پر یقین رکھنا چاہیئے کہ " خداوند تعالیٰ ہی کے لئے تمام اعلیٰ نام ہیں اور ساری فضیلت اسی کو حاصل ہے اس لئے کہ وہی تمام ارفع صفات سے متصف و کامل ہے۔ اس مطمح نظر کے ساتھ قدسی صفا کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمان کو قرآن مجید و حدیث میں اس کی زندگی کے متعلق جو واضح باتیں بیان کی گئی ہیں ان کو پوری طرح سمجھ کر زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض ممکن ہے کہ لازمی طور پر خالص فلسفہ یا تصوف کی حدود میں آجائیں لیکن ان کی کثرت خدائے محبت اور اس کے متعلق علم اس کی قوت و قدرت اور انصاف و رحمن و رحیم کی صفات سے واقفیت اور انسان کے اخلاقی اعتبار سے پاک طینت ہونے پر ربانی تعلق خاطر کا احساس بآسانی معاشرہ کے مطالعہ کا موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ خود بھی مرعوب کن فہرست ترتیب دیتے ہیں اور ان سے ہی خود کسی ایک صفت سے متصف ہونے کی افادیت ظاہر ہے کہ جس سے قدسی صفات کی ذات بہر صورت متصف ہے۔ اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے خداوند قدوس کی ذات قدسی صفات ہر قسم کی نسبت سے بالا و برتر ہے اور ان تمام صفات میں بہت زیادہ ہم آہنگی کی مظہر ہے۔

## ادراک وسیادت

ذات قدسی صفات کی ان صفات میں سے جن صفات میں انسان کو اپنے آپ کو رنگ لینا چاہیئے تاکہ وہ خلیفۃ اللہ کے منصب کا اہل ہو اور اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے اولین ضرورت اس صفت کی ہے جو زندگی اور قوت متحرک کی محرک ہوتی ہے یہ بتلایا جاچکا ہے کہ قرآن مجید اس کی وضاحت فرماتا ہے کہ ارض وسماء میں جو کچھ ہے وہ سب انسان کی بھلائی اور اس کی ہی خدمت کے لئے ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ ان کے آئین فطرت سے واقف ہو اور ان سے مناسب کام لے۔ یہی طریقہ ہے سیادت کے حصول کا اور اس سیادت کے حصول کا واحد ذریعہ ادراک وعلم ہے جس کا حصول پیغمبر اسلام کے احکام کے مطابق "ہر مسلمان کا فرض ہے"

تعلموا العلم لانه معالم الحلال والحرام ومنار سبل اهل الجنة وهو الانس فی الوحشة والصاحب فی الغربة والدلیل علی السراء والضراء والسلاح علی الاعداء والزین عند الاخلاء یرفع الله به اقواماً فیجعلهم فی الخیر قادة وائمة تقتص آثارهم ویقتدی بفعالهم وینتهی الی رایهم۔

علم حاصل کرو۔ کیونکہ یہ صاحب علم صحیح اور غلط وحلال چیزوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ راہ بہشت میں مشعل کا کام دیتا ہے یہ بے یار و مددگاری میں ایک ساتھی ہے۔ مسرت کی طرف رہبری کرتا اور مصیبت و تکلیف میں سہارا دیتا ہے دشمنوں کے مقابل ایک ہتیار ہے تو دوستوں میں باعث زینت ہے خدا تعالیٰ اقوام عالم کے مراتب اسی کے ذریعہ بلند فرماتا ہے اور انھیں اچھے امور میں رہبر بناتا اور قیادت عطا کرتا ہے۔ آیندہ لوگ ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور ان کی اتباع کرتے ہیں اور ان کی صائب رائے کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔



---

کلام مجید میں ارشاد ربانی ہوا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۔

اے مومنو! جب خدا اور رسول ایسی چیز کی طرف بلائیں جو تمھیں ایک زندگی عطا کرتی ہے تو تم فوراً لبیک کہو۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ. وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۔

یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بلکہ خود ان کے نفوس میں قدرت الٰہی کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۔

اگر سطح ارض کے تمام درخت قلم کا کام دیں اور سمندر کا پانی جس میں سات اور سمندر ملائے جائیں، روشنائی کا کام دے اور ان سے لکھے جائیں تب بھی کلمات اللہ ختم نہ ہو سکیں گے۔ بلاشک وشبہ خدا تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا.

جہالت کی مثال اس تاریکی کے مانند ہے جو ایک بے پایاں سمندر پر چھائی ہوئی ہے۔ جس کو ایک بڑی موج ڈھانکے ہوئی ہے اور اس پر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ تاریکی ہی تاریکی ہے جس میں ہاتھ بھی بمشکل دکھائی دیتا ہے۔

ادراک و علم اسلامی تصور کے لحاظ سے ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہے۔ جس میں وسیع و عریض عالم کی حیات کا ہر پہلو جو انسان کے اردگرد موجود ہے اس سے قریبی اتصال رکھنے کے باوجود کافی دور بھی ہے اس معنی میں کہ اس سے علیٰحدہ ہے۔ انسان کی زندگی ماضی کے متعلق اس کی پوری معلومات کے ساتھ ترقی پذیر ہے۔ اس لئے علم کا حاصل کرنا اور ادراک کو کام میں لانا اس پر نہ صرف اس کی نفسیاتی اور طبعی کیفیات کے استعمال کا لوازمہ ہیں بلکہ روحانی عمل بھی اسی میں شامل ہے اور اسلام میں تو اس کو کسی چیز سے منع نہیں کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ وہ اس پردہ غیب کی چیزیں معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے کہ جو اس سے اخفا میں رکھی گئی ہیں اور جہاں اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس کی عام فہم وجہ یہی ہے کہ اس سے ناواقف رہ کر ہی وہ اپنی زندگی کار آمد طریقہ پر بسر کر سکتا ہے۔ اسی لئے اسلام سختی کے ساتھ ہر اس طریق عمل کی مخالفت کرتا ہے جو ذاتی مفادات پرستوں نے دوسروں کو علیٰحدہ رکھ کر انہیں ربانی نے فطری چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رکھنے کی کوشش کی ہیں اس لئے کہ فطرت ہی ہر قوت اور خوشی کا سرچشمہ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کی حمایت کے مطابق اس تک صداقت پر مبنی علم اور ادراک اس تک پہنچاتی ہے۔ اور اس کو اس کا پورا پورا موقع دیتی ہے کہ وہ فطری قوتوں کو ان کا سائینٹفک علم حاصل کر کے کام میں لائے اور اس طرح اپنے لئے مادی آرام و سہولت بہم پہونچائے

## میزان

لیکن اس کے لئے ایک شرط رکھی گئی ہے اور اس میں اسلامی اور موجودہ یوروپی تہذیب کا بنیادی فرق ہے۔ اسلام انسان سے کہتا ہے کہ وہ اپنے فطری توازن یا میزان کو ذہن میں برقرار رکھے اور اس طرح جو کچھ پیغمبران خدا نے الہام یا وحی کے ذریعہ اس تک پہنچایا ہے اس کا سائینٹفک علم حاصل کر کے اس پر پوری طرح عمل پیرا ہو اور اس طرح اس پر عمل کرے کہ دوسری الہٰی صفات بھی اس میں شامل ہوں یعنی وہ خدائے تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردانہ و مشفقانہ سلوک کرنے کی صلاحیت پیدا کرے اس لئے کہ اسی مقصد کے تحت خلیفتہ اللہ بنا کر اس کو روئے زمین پر بھیجا گیا ہے۔ اگر میں اس کو اس طرح بیان کروں تو غالباً ٹھیک ہوگا کہ سائنس جس شخصی فطری قوت کو کام میں لاتی ہے اگر اس کو اس جذب ربانی سے موسوم کر دیا جائے اور اس میں وہ توازن قائم کر دیا ئے جو پوری تخلیق کے لئے ضروری ہے تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ یہی اسلام کا اولین مقصد ہے۔ اور اسی کو اسلام کے فیضان سے واقفیت حاصل کرنے یا اسے سمجھنے کے لئے ذہن میں رکھنا

بے انتہا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمان کے فرائض میں کیا کچھ داخل نہیں ہے: "یقین و عمل" جو عقیدہ کی بنیاد ہے، جن صفات سے اس کے ادراک اور قوتوں کو متصف ہونا ہے اس کی قرآن مجید میں پوری طرح وضاحت فرمادی گئی ہے جس کا ذہن نشین رکھنا ضروری ہے اس لئے ہر باب کے آغاز پر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" (یعنی شروع کرتا ہوں نام سے اللہ پاک کے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے) اور مسلمان کو دن میں کئی مرتبہ جس بات کا اعادہ کرنا پڑتا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ. اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ آمین

تمام تعریف اس خدا کے لئے سزاوار ہے جو بڑا ہی مہربان اور نہایت رحم والا ہے جو قیامت اور روز جزا کا مالک ہے اے خدا! ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ہمیں راہ راست دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ دکھا جس پر چلنے سے تو نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے اور ان لوگوں کے راستہ پر چلنے سے ہمیں بچا جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے اور جو گمراہ ہو گئے ہیں

۲۴۹

قرآن حمید کے ان الفاظ کے مطابق عام عبادت کے یہ الفاظ انسان کے فرائض میں بڑی حد تک جاگزیں ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح اپنے سارے دن کے کاروبار میں ان صفات الٰہی کو جن کا حوالہ دے کر یعنی رحمن و رحیم اور مالک یوم الدین کہہ کر اس نے انہی اسلام کی پر امن اور منظم زندگی گذارنے کی پروردگار سے استدعا کی ہے وہی جذبہ اس کے ہر کام میں کارفرما رہتا ہے۔

یہاں جس پروردگار کا مسلمان نام لیوا ہے وہ رب العلمین رب کا عربی میں مطلب یہی ہے کہ وہ ذات قدسی صفات جو اپنی ساری مخلوق کو پیدا کرنے والا اور اس کو غذا پہنچانے والا ہے اور سب سے شفقت کا برتاؤ کرتا ہے اس طرح خداوند قدوس کو رب العلمین یا سارے عالم کے رب سے مخاطب کر کے یعنی ظاہر و باطن دیکھے اور ان دیکھے ہر دو عالم کا رب کہہ کر وہ اپنے آپ کو پوری مخلوق کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے اس لئے کہ اس کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ وہ صرف ایک ہی ذات اقدس کو لائق پرستش سمجھتا ہے جس سے وہ امداد کا طالب ہو سکتا ہے۔

اور وہ کیا امداد ہے جس کا وہ اپنے رب سے طالب ہوتا ہے "ہمیں سیدھی راہ چلا، ان کی راہ پر جن پر تیری عنایت رہی ہے نہ کہ ان کی جن پر تیرا غضب نازل ہوا یا جو گمراہ ہو گئے" وہ صرف اس توازن فطری کا طالب ہے جو قدرتی طور پر اس کے دماغ میں متوازن طور پر قائم کیا گیا ہے تاکہ یہی میزان اس کے افکار محسوسات و عمل میں برقرار رہے۔

یہی روحانی قانون زندگی ہے جس پر معاشرہ اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اسلام اسی سے اپنے ہر حقیقی رکن کو ایک مقدس نعرہ محبت وعمل بنا دیتا ہے "میری زندگی میری قربانی اور میری موت سب کچھ اللہ پاک کے لئے ہی ہے" اس کے اثبات کے لئے وہ اپنی ساری صلاحیتوں کو پیش کر دیتا ہے ادراک و محسوسہ ساری قوتیں جو ادراک کے باعث پیدا ہوتی ہیں مخلوق کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے اور اس طرح خلافت الٰہی کے منصب کو پورا کرکے منشائے ایزدی کی تکمیل کرتا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔

نیکی کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق یا مغرب کی طرف پھیر دو۔ اصل نیکی تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، قیامت پر، فرشتوں، کتاب الٰہی اور نبیوں پر ایمان لائے۔ خدا کی محبت میں اپنا مال قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور گداؤں کو دے اور غلاموں کو آزاد کرائے نماز پابندی ادا کرتے رہے اور زکوٰۃ نکالے، جب کبھی کسی سے وعدہ کرے تو اس کو پورا کرے، ہر امتحان اور مصیبت میں صبر سے کام لے ایسے لوگ ہی مخلص اور متقی ہیں۔

**۲۵۰**

---

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔

تم خدا کی پرستش کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو اور والدین، قرابت دار، یتیموں، مسکینوں اور رشتہ دار پڑوسیوں اور دوسرے پڑوسیوں اور ہم سفروں، مسافروں اور غلاموں کیساتھ مہربانی اور نرم دلی کے ساتھ برتاؤ کرو۔

## اخلاق و اصول قانون

بھلے اور برے میں امتیاز فرقان حمید اس طرح ہمارے ذہن نشین کراتا ہے اور اسی کا ذکر ان احکام میں ہے جن کا ہم ابھی تذکرہ کر چکے ہیں یعنی اللہ کے بتلائے ہوئے طریق عمل کا احترام کرو اور اس کی مخلوق کے ساتھ شفقت آمیز برتاؤ کرو۔ مسلمان جو بھی کام انجام دے محسوس کرے یا سوچے وہ سب ان ہی احکام کے تابع ہونا چاہئے۔ اور یہی حقیقی عمل ہے۔ دوسری جانب جو کوئی بھی ایسی چیز وہ محسوس کرے یا انجام دے جو ان احکام کے خلاف ہے تو وہ قرآن مجید کے الفاظ میں غلط عمل سے موسوم ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کی زندگی کے اعلیٰ ترین حقائق کو تمیز کرنے کا جواز بتلا دیا گیا ہے اور اسلامی اخلاق میں یہی چیز کارفرما ہے خواہ یہ خود اس کی ذات کی بھلائی سے مقصود ہو یا پھر اس کے

ساتھیوں یا ہم جنسوں کا کوئی کام ہو اس کے ہمسایہ ہوں یا اجنبی یا وہ تک بھی جو اس کے دشمن ہیں یا غیر ناطق مخلوق کے ساتھ بھی اس کا وہی طرز عمل ہو گا جو اسلامی شعار کے مطابق ہے۔ رحم، اخلاص، عفت، محبت پیار و تلطف، دیانتداری، صداقت، معاہدہ کا احترام، قوت برداشت درگذر، اعتماد، انصاف، مہربانی علاوہ اسی قسم کی صفات صرف تعیشات یا پسندیدہ مواقع کے افعال نہیں بلکہ صداقت پسند زندگی کے لئے لازمی ہیں۔ اس کی مخالف قوتیں جیسے ظلم، ناانصافی، بربریت، آویزش، غلاظت، بے ایمانی، جھوٹا دغا، دھوکا، سٹے بازی، فریب، برائیاں غیر وفاداری اور کمزور سے ناجائز فائدہ اٹھانا جو معاشرہ کی تحلیل کا باعث ہوتے ہیں نہ صرف بداعمالیاں ہیں بلکہ اسلام میں ان کا مرتبہ عظیم گناہوں کا ہے۔

معاشرہ کی اخلاقی و اصلاحی پہلو پر اسلام کس قدر محتاط ہے اور اس کے اراکین کے مابین بہترین تعلقات کے قیام کا اس دین متین میں کتنا خیال رکھا گیا ہے اس کا اندازہ اس بلند ترین معیار سے کیا جا سکتا ہے جو دوسروں کے ساتھ ہمارے سلوک کے سلسلہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ

اے مومنو! ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے۔ کیونکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ وہی قوم اس سے بہتر ہو، نہ کوئی عورت کسی عورت کا مذاق اڑائے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہی عورت اس مذاق اڑانے والی سے بہتر ہو۔ تم آپس میں ایک دوسرے کی مذمت نہ کیا کرو اور نہ ایسے عرفی ناموں سے پکارو جو گالی کے معنی میں۔

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ

دوسرے کے حالات بلا وجہ معلوم کرنے میں تجسس نہ کرو۔ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کریگا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھالے۔ یقیناً تم اس سے کراہت کرو گے۔ خدا سے ڈرو تو وہ تمہاری توبہ قبول کرے گا اور تم پر اپنی رحمت نازل کرے گا۔

عمل کو اسلام میں اس وسعت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عبادت کے لازمی اجزاء، روزہ، زکوٰۃ اور حج اس عمل کے نمایاں اور اہم خدوخال ہیں اور ان سے نظم و ضبط اور تزکیہ نفس اور ہم جنسوں کے ساتھ بغیر اپنی ذات کی منفعت یا ذاتی مفاد کے خدمت اور اتحاد و اتفاق اور یگانگت کا جذبہ بڑھانے کا عمل پہلے ایمان والوں میں اور پھر ساری انسانیت میں ان کی وساطت سے پیدا کرنا ہے۔

یہاں جو کچھ دائرہ عمل میں نے اپنے لئے متعین کر لیا ہے اس میں یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اس اسلامی

شریعت کا تفصیلی طور پر تذکرہ کروں جو اسلامی معاشرت کی قانون سازی کرتا ہے اور اس طرح اس کا ایک اہم حصہ بناتا ہے لیکن میں یہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اس کے اصول وہی ہیں جن پر اب تک تجزیہ کیا گیا ہے۔
یہ شریعت یا قانون اسلامی سب سے بڑا عطیہ ہے جو اسلام نے جدید دنیا کو دیا ہے۔ ایک ایسا ترکہ ہے جو اس زمانے میں سمجھ بوجھ کا متقاضی ہے اور اس کا امکان ہے کہ اس جذبہ کے تحت جس پر خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دوران زندگی میں عمل ہوتا تھا اس کا احیاء ہوگا۔ یہ قانون عرب کے دور دراز خطہ میں نافذ ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ حضرت صلعم نے ان مقامات پر جہاں صحیفہ مقدس نے خاموشی اختیار کی وہاں جدید حالات اور دیگر مقامات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے درآنحالیکہ کوئی پیش رفت ایسی نہیں ہوئی تھی اپنے نطق مبارک سے ایسے قانون جواز پیدا کردیے کہ جن کی موجودگی سے امت اسلامیہ کا قانون وضع ہوا۔ ایسے قوانین جن کا مقصد اس کے ارکین میں اتحاد و یگانگت قائم کرنا اور ان کی مادی اور اخلاقی فلاح و بہبود کو آگے بڑھانا۔

۲۵۲ احسان

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ان اخلاقی قوانین کا احترام کرے تاکہ وہ اس طرح ایک باعزت و احترام زندگی بسر کرے۔ اس طرح زندگی بسر کرنے اور زندہ رہنے کے حق کی مقاومت بزدلانہ یا کمزوری کے نقطہ نظر کے تحت قبول نہ کیا جائے۔ شخصی غلطی یا بے انصافی بہ آسانی معاف کی جاسکتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام بدلہ لینے کی جگہ معافی ہی کو فضیلت دیتا ہے لیکن اگر درگذر سے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں یا اس سے خاطی میں مزید خطا کاری کا جذبہ پیدا ہوتا یا ظلم و زیادتی بڑھتی ہے تو ایسی صورت میں بدلہ لینا لازمی و ضروری ہوجاتا ہے لیکن اس میں غلو کرنے سے قرآن مجید محتاط رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ | نیکی اور بدی کبھی بھی مساوی نہیں ہو سکتے۔ برائی کا بدلہ نیکی سے دو۔ تب وہ شخص جس کو تم سے سخت عداوت تھی تمہارا گہرا دوست بن جائے گا۔ |
| وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا. فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ | برائی کا بدلہ اسی قدر برائی سے ہو اگر کسی نے اس کو معاف کردیا اور اس کی اصلاح کردی تو اس کا اجر منجانب اللہ ضرور ملے۔ یہ معلوم رہے کہ خدا کبھی بھی ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ |
| وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ | وہ لوگ جن کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا جاتا ہے تو وہ اپنی مدافعت کرتے ہیں۔ |
| وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم | وہ شخص جو ظلم کا شکار ہونے کے بعد اپنی مدافعت کرتا ہے اس |

مِنْ سَبِيْلٍ -      پر ان کی مدافعت کی وجہ کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ -      کسی کے ظلم پر صبر کرنا اور اس کو معاف کرنا یقیناً اعلیٰ ظرفی اور علو ہمتی کی دلیل ہے۔

اس طرح اسلام نے اہسا کے عقیدہ کی اصلاح کی ہے جس کی قول کی حد تک تعظیم کرنے کے باوجود عجیب و غریب طریقہ پر عمل میں وہ لوگ جو بہ بانگ دہل اس کے حامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ تاریخ نے اس ناموزوں جذبہ پرستی کے عقیدہ کو مسلسل او رکاری ضرب لگانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اس لئے کہ یہ عقیدہ فطرت انسانی کے آویزش کے جذبہ سے یکسانیت پیدا نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف اسلام کا مطمح نظر مصالحت آمیز ہے جس میں عفو و درگذر پر زور دیا گیا ہے اس امید پر کہ جو بھی اذیت پہنچائی گئی ہے اس کی جزوی طور پر تعدیل ممکن ہو جا سکے اور اس کے بعد بہتر تعلقات قائم ہو جا سکیں۔ لیکن اسلام کسی طرح سے بھی بزدلانہ عمل کی تائید نہیں کر سکتا اور نہ اس کی تقدیس کر سکتا ہے خواہ اس عمل کو کسی طرح سے بھی پیش کیا جائے اسلام اس کو ایک اچھی صفت نہیں قرار دے سکتا کہ دوسرا گال بھی مزید اذیت کو دعوت دینے یا ہتک کو بڑھانے کی خاطر پیش کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ انسانی فطرت کے وقار کے منافی ہے۔ درحقیقت ایک کمزور انسان کو معاف کر دینا اذیت دہندہ کے لئے کوئی نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ مسلمان کو عفو کا حکم دیا گیا ہے بشرطیکہ اس میں اس عمل کی مردانگی کے ساتھ انجام دہی کی صلاحیت ہو اور اس لئے بھی کہ عفو اس قسم کے حالات میں رضائے الٰہی کے عین مطابق ہے اور اس سے بہتر نتائج کے حصول کی بہت زیادہ توقع ہوتی ہے۔ حقیقی اہسا یہی ہے اور جو صحیح جذبہ کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں وہ درحقیقت قابل احترام ہیں لیکن اس کو عام انسانیت کے لئے ایک اصول نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان کے لئے خصوصیت کے ساتھ مذاہب کی بنیاد رکھی گئی ہے اس طرح اگر کوئی شخص اس پر مجبور ہو کہ وہ کسی اذیت کا اسی طرح جواب دے تو بھی اس کی اس عمل میں محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اس لئے کہ بدلہ روحانی عمل کو ختم کر دیتا ہے اگر اذیت دہندہ کو سزا دینا معاشرہ کی بھلائی یا عام بہبودی یا خود اس کی اصلاح کے مدنظر نہ ہو۔ اگر شخصی منافرت یا جماعتی جذبہ کے تحت یہ عمل کیا جائے تو یہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔ یہ بالکلیہ مدافعتی حق ہے جس کا استعمال اسی صورت میں کیا جائے کہ یہ انفرادی اور معاشرتی زندگی ہر دو میں اس احساس کے ساتھ ہو کہ اس سے بھلائی مقصود ہو اور جس کی ذمہ داری عقیدہ و مذہب کے مطابق اس پر عائد کی گئی ہو اور یہ شرط ہمیشہ ذہن نشین رکھی جائے خواہ اذیت دہندہ مسلمان ہو یا کسی اور قوم سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ عمل اسی مذہب کے پیروؤں کا ہو یا غیر مسلموں یا ذمیوں کے خلاف ہوا ہو جو اسلامی سیاسی جماعت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔

الامن ظلم معاهدا او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئا بغير طيب نفس فانا حجيجه يوم القيامة

یاد رہے کہ قیامت کے روز میں اس شخص کی حمایت کروں گا جو ایک ذمی ہے گر تم نے اس پر ظلم کیا ہے یا معاہدہ کو توڑ ڈالا ہے یا اس پر ایسی ذمہ داری عائد کی ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہے یا اس کی ملکیت میں سے کسی چیز کو اس کی رضامندی حاصل کئے بغیر تم نے لی ہو۔

---

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ

اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں جھگڑ بیٹھیں تو تم ان میں صلح کروا دو اگر ان میں سے کوئی جماعت دوسری جماعت کے ساتھ سرکشی کرتی ہے تو اس باغی جماعت سے جنگ کرو حتیٰ کہ وہ خدا کے فیصلہ کو قبول کرنے پر مائل ہو جائے۔ اگر وہ ایسا کرے تو پھر تم ان دونوں میں صلح کرا دو مگر انصاف و عدل کا لحاظ رہے۔ خدا انصاف کرنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

---

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا

جو کوئی بھی کسی نیک چیز کی سفارش کرے گا اس کو اس کا اجر بھی ملے گا۔ اور جو بری چیزوں کی سفارش کرے گا اس کے نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔ خدا ہر چیز کو پہلے ہی سے جانتا ہے۔

۲۵۴

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۔

ان لوگوں کو بھی جنگ کی اجازت دی گئی ہے جن پر ظالمانہ حملہ کیا گیا ہے خدا ان کو نصرت و کامرانی عطا کرنے پر بہر طور قادر ہے۔

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۔

کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے۔ اور محض اس لئے نکالا گیا ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ بعض کی مدافعت بعض لوگوں سے نہ کرتا تو یقیناً گر جائیں؛ خانقاہیں، یہودیوں کے عبادت خانے اور وہ مساجد جن میں اکثر اللہ کا نام لیا جاتا ہے منہدم کر دے جاتے۔ خدا اس شخص کی مدد کرتا ہے جو کار خدا کا بیڑا اٹھاتا ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نہایت قوی اور با اقتدار ہے۔

---

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۔

راہِ خدا میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے مقابلہ کرتے ہیں مگر حد سے تجاوز نہ کرنا کیونکہ خدا تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔

---

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم بھی صلح کے لئے راضی ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو یقیناً وہ تمام چیزوں کو خوب سنتا اور جانتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خُلُقًا مُسْتَقِيْمًا ۔

اے خدا مجھے صحیح اخلاق سے نواز۔

اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَعْتَدِيَ اَوْ يُعْتَدٰى عَلَيَّ اَوْ اَكْتَسِبَ خَطِيْئَةً اَوْ ذَنْبًا لَا تَغْفِرُهٗ ۔

اے خدا میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں کسی پر ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں، کسی پر دست درازی کروں یا کوئی مجھ پر دست درازی کرے یا کوئی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جاؤں جس کو تو معاف نہیں کرتا۔

**اسلامی جمہوریت** یہ ہے وہ بلند کردار جس کی تشکیل انسانیت کی بھلائی کی خاطر اسلام کو مقصود ہے ایک ایسا کردار جو حقیقی طور پر روئے زمین پر ہر انسان کو خلافت الٰہی کا حامل بنا لے ہر حیثیت سے خواہ انفرادی ہو یا خاندان یا معاشرہ کے رکن کی حیثیت سے یا خادم ملک کی حیثیت ہو یا قائد قوم کی جس میں حکومت کا جذبہ ودیعت کیا گیا ہو۔ اس ودیعت کردہ جذبہ کے مطابق اُسے حقیقی طور پر کام انجام دینا چاہیئے۔



كلكم راعٍ وكلكم مسئول عن رعيته.

تم میں سے ہر ایک ایک چرواہا ہے اور اپنے ریوڑ کی خیر خواہی کا ذمہ دار بھی۔

هُوَالَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۔

اسی نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کے مدارج بعضوں سے بلند تر کر دیا تاکہ تمہارا امتحان لے کہ کس طرح تم اس کو کام میں لاتے ہیں۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔

اے داؤد۔ ہم ہی نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا ہے۔ لوگوں میں حق و صداقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلے کرو اور نفسانی خواہشات کی اتباع نہ کرو کیونکہ یہ تمہیں راہ خدا سے گمراہ کر دیں گے۔

متذکرہ بالا آیتوں میں جب نسل انسانی کے آزمائش میں پورے اترنے کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ایسی نسل انسانی ہے جس کو خلافت الٰہی کے منصب کا حامل بنا کر پیغمبر اسلام نے اپنے پرخلوص عمل سے اپنی جانب راغب فرمایا۔ ان سے اور ان کے بعد اس منصب جلیلہ کے اپنے آپ کو قابل بنانے والوں سے مخاطب ہو کر ہی فرقان حمید میں ارشاد ہوا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔

تم بہترین امت ہو جو انسانیت کے لئے پیش کئے گئے ہو۔ تم نیک کاموں کے انجام دینے کا حکم کرتے اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔

ہم نے تم کو ایک میانہ رو امت بنایا ہے تاکہ تم تمام لوگوں پر گواہ رہو اور رسول خدا تم پر گواہ رہے۔

یہی تھے وہ لوگ جنھوں نے اسلامی جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی ان میں سے ہر ایک کے متعلق پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا کہ ان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی کہ رہبر تاروں کی کہ جن کی قیادت میں سیدھی راہ ملے گی۔ اور جو لوگ اس جمہوریت کی تاریخ اور اس کی کارروائیوں سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس انسان اعظم نے اپنے صحابیوں کی نسبت کتنے صحیح خیالات ظاہر فرمائے تھے۔ یہ ایسے لوگوں کی جماعت تھی جن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی رضائے الٰہی اور احکام ربانی کی ہر طرح تابع تھی جن کا حاکم سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہ تھا اور اسی کی مملکت کی حفاظت کے لئے یعنی کرۂ ارض پر الٰہی حکومت کے لئے ان میں سے ہر ایک میں سچی خدمت اور کامل جذبہ وفاداری کے ساتھ کام انجام دینے کا جذبہ کارفرما تھا۔ ایسی الٰہی حکومت کی مملکت جس میں ساری مخلوق کا ایک متحدہ خاندان زیرنگین ہو ان میں سے ہر ایک اس اعلیٰ ترین جذبہ عمل کا حامل تھا کہ جو انسانیت کی بھلائی کے لئے انسان کے دل و دماغ میں موجود ہوتا ہے

اسلام کی یہی جمہوریت ایسے افراد پر مشتمل تھی جن میں انسانیت کے وقار کا پورا پورا احساس موجود تھا۔ جن کے اِں تفوق یا برتری کا کوئی محل و موقع نہ تھا سوائے اس کے کہ اچھے اخلاق اور جذبہ اخوت اور ایک دوسرے کی بھلائی مقصود تھی۔ یہ ایک ایسا معاشرتی نظام تھا جس کے تحت ایک دوسرے سے مربوط تھا۔ فرقان حمید کے الفاظ میں حبل اللہ کو تھامے ہوئے تھے اور انسانی فطرت کے نیک و پاکیزہ جذبات و عادات کی یکسانیت ان کے پیش نظر تھی۔ وہ خود پرستی اور جاہ طلبی کے مرکز گریز عناصر پر تحدید عائد کئے ہوئے تھے اور اس طرح ساری انسانیت کے لئے انھوں نے متحدہ خوشی اور چین و امن کا راستہ قائم کر دیا تھا۔

موجودہ زمانہ میں دین متین کے پیروؤں میں جو سنجیدہ مطمع نظر کے حامل ہیں وہ اسلام کے زرین دور پر پرحسرت و متفکر نگاہ ڈالتے ہیں اور اسی دور کی واپسی کے متمنی ہیں کیا یہ ایسا سیاسی رابطہ تھا کہ جس سے سب چین و امن سے تھے اور عمومی حیثیت سب کو حاصل تھی اسی لئے سب چاہتے ہیں کہ اس قسم کی عمومیت پھر سے قائم ہو؟ تاریخ اسلام میں واقعات کی رفتار اور پیروان دین متین کا مختلف

دن میں انتشار جو مختلف سیاسی اثرات کے تحت عمل میں آیا اس کے باعث ممکن ہے کہ اس کا کوئی فوری جواب مل سکے درآنحالیکہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ لیکن جو بات بہت زیادہ اور فوری اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی زندگی کے پھر سے احیاء اور مضبوط بنیادوں پر اس کے قیام و ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مذہب کی روح اور اسلامی معاشرہ کی جس اخلاقی بنیاد پر تشکیل عمل میں آئی ہے اور جس اخوت کے باعث یہ معاشرت میں اپنے بلند مقام کا حامل ہے اور انہی مخصوص نوعیت کے باعث جس کا اظہار کسی اور جماعت نے نہیں کیا ہے انسان کی طویل تاریخ میں اس معاشرہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہے گی۔ اسلام کا یہ ہمہ گیر مقصد ہونے کے باعث معاشرتی وحدت کی بہبود و فلاح اس میں ہے کہ اس کا اولین تعلق بنی نوع انسان کے ہر فرد کی بھلائی اور صیانت سے ہو۔ اس لئے کہ اسلام بشرطیکہ اسے عمل کا موقع دیا جائے تو اصطلاحاً ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں خلافت الہیہ کے حامل اشخاص کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے جو بیش قیمت اثاثہ کے طور پر کسی بھی ملک کی خدمت انجام دیں گے جہاں کہ ان کا وجود ہو اور اس طرح اس کی فلاح و بہبود ہوگی۔ عالم اسلام میں اس وقت جو زاجی کیفیت ہے اس کا باعث مذہب نہیں بلکہ اس سے غفلت ہے جس طرز عمل کے باعث آنحضرت صلعم کے صحابیوں کو کامرانیاں اور خوش بختیاں حاصل ہوئیں اس میں آج بھی وہی قوت

۲۵۷

عمل باقی ہے۔ اگر آج کل کے مسلمان باوجودیکہ انہیں بری طرح جھنجھوڑا جا رہا ہے اس اپنی امانت کا بار برداشت کرنے میں ناکام ہوں تو لازمی طور پر یہ ایسے دوسرے ہاتھوں میں منتقل کردی جائے گی جو اس کے اہل ہوں اس لئے کہ یہ امانت منجانب اللہ ہے اور ساری انسانیت کے لئے ہے۔ یہی بات برنارڈ شا نے بھی بیان کی ہے۔

"I have alway held the religion of Mohammed in high estimation because of its wonderful vitality. It is the only religion which appears to me to possess that assimalatry capability to the changing pherse of existence which can make itself apeal to every age. I have studied him——the wonderful man, and in my opinion, far from being an Anti Christ, he must be called the Saviour of Humanity. I believe that if a man like him were to assume the

"میں نے ہمیشہ (حضرت) محمدؐ کے مذہب کا اس کی حیرت انگیز قوت کے باعث احترام کیا ہے۔ اس لئے کہ صرف یہی ایسا مذہب ہے جس کے متعلق مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ اور موجودات کے تمام تغیرات کے باوجود حسب حال ہے اور تمام کے لئے موزوں ہے میں نے ان کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ انہائی زبردست اور عجیب و غریب انسان۔ اور میرے خیال میں تو وہ مسیحیت کے مخالف ہرگز نہیں بلکہ انہیں تو انسانیت کا سب سے بڑا پیامبر کہنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ

اگر ان کے جیسا کوئی انسان اس موجودہ زمانہ کی دنیا کا آمر ہوتا تو وہ اس کے مختلف فیہ مسائل کا حل " اس طرح دریافت کر لیتے کہ اس سے اس امن و خوشحالی کا دور دورہ ہوتا جس کے لئے ہم عرصہ دراز سے ترس رہے ہیں۔ میں نے (حضرت) محمدؐ کے دین کے متعلق پہلے ہی پیشین گوئی کی تھی کہ جس طرح آج کے یورپ کے لئے یہ قابل قبول ہوتا جا رہا ہے اسی طرح مستقبل کے یورپ کے لئے بہت زیادہ قابل قبول ہوگا۔

dictatorship of the modern world, he would succeed insolving its problems in a way that would bring it the much needed peace and happiness. I have prophesied about the faith of Mohammed that it would be acceptable to the Europe of tomorrow, as it is beginning to be acceptable to the Europe of today.1."



کیا معلوم کہ اسلامی وفاق انسانی اس طرح معرض وجود میں آئے !

آخر

مترجمہ محمد مصلح الدین صدیقی ایم۔اے

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو مجلہ عثمانیہ

1. The Genuine Islam, 8 Singapore, Vol. 1: No. 1. 1396.

# نقد و نظر

**سہیل کی سرگزشت**: مصنفہ رشید احمد صدیقی، انچارج شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈہ۔ شائع کردہ نفیس اکیڈیمی حیدرآباد دکن قیمت چار روپیہ سکہ عثمانیہ۔ ضخامت ۲۳۰ صفحات کاغذ معمولی، کتابت، طباعت اچھی۔

کتاب کے نام سے شبہ ہوتا ہے کہ "شہاب کی سرگزشت" کی طرح کوئی ناول ہے، مگر مصنف کا نام پڑھتے ہی یہ شبہ فوراً دور ہو جاتا ہے کیونکہ رشید احمد صدیقی مضامین نگار ہیں ناول نگار نہیں۔ چنانچہ یہ کتاب بھی ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھیں کے نکالے ہوئے سہ ماہی رسالہ "سہیل" میں شائع ہوئے تھے۔

کتاب ایک تعارف جس میں محمد انتظام اللہ صاحب نے مصنف کی سوانح عمری مختصراً پیش کی ہے، اور آٹھ مقالوں پر مشتمل ہے۔



ان میں سے پہلے چھ مقالے "رسالہ "سہیل" کے اداریے ہیں اور باقی دو "پیام اقبال" اور "اردو شعر و شاعری پر ایک نظر" ہیں۔

اداریوں میں زیادہ تر اردو کی ترقی کے وسائل، اردو ادب کے مختلف ادارہ جات اور کارناموں پر بحث ہے لیکن ہر مضمون میں اُن کی مخصوص مزاحیہ شگفتگی کی چاشنی موجود ہے جس سے خشک سے خشک موضوع بھی پرلطف بن گیا ہے۔ ایک مضمون میں جامعہ عثمانیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور چند مشورے بھی دئے ہیں۔ اُس کے اقتباس سے ان کے طرزِ بیان کی شگفتگی کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

" حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کو بعض حیثیات سے تمام ہندوستان میں ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے اس کے کارنامے اس وقت کسی تعارف یا تفصیل کے محتاج نہیں۔ لیکن جس چیز کی کمی اس وقت ہم محسوس کرتے ہیں وہ اس کا غیر معمولی قناعت اور خاموشی کے ساتھ محض اپنی مقامی حیثیت پر اکتفا کر لینا ہے۔ لفظ "مقامی" کسی قدر خطرناک اور گمراہ کن ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ وہ اُردو کی موافقت میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں " اُردو علی گڑھ یا " اردو انگلشن" قائم کرنے پر آمادہ ہو جائے بلکہ محض اس اعتبار سے کہ وہ ہندوستانی زبان کی اعلیٰ تعلیم گاہ ہے جس کی خدمات مفید اور امید افزا ہیں، جس کے فارغ شدہ طلبا اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے کسی دوسری یونیورسٹی سے کم نہیں ہیں، جس کا معیار تعلیم بیرون ہندوستان دیگر اعلیٰ درجے کی یونیورسٹیوں کے نزدیک بھی مسلم ہے

اُس کو حیدر آباد دکن کی حدود سے نکل کر اپنے مقاصد اور نصب العین سے دوسری علمی جماعتوں کو آگاہ اور آشنا کرانا چاہیئے "

اِن تمام اداریوں میں اکثر جگہ علیگڈھ کی اہمیت اور اردو ادب کی ترقی میں اُس کے کارناموں کو اُجاگر کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے ۔

"پیامِ اقبال" اور " اردو شعر و شاعری پر ایک نظر" بہت ہی سُلجھے ہوئے مضامین ہیں جو مصنف کی اعلیٰ تشریحی اور تنقیدی قابلیت کا آئینہ ہیں ۔

بہر حال اردو ادب کے لئے مضامین کا یہ مجموعہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اور اردو کے ہر بہی خواہ سے ہم اسے مانگ کر نہیں بلکہ خرید کر پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں ۔

( م - ا - ص )

---

**اسلامی معاشیات** :- مصنفہ مولانا مناظر احسن الگیلانی صدر الشعبہ الدینیہ فی الجامعۃ العثمانیہ۔ رائل سائز حجم ۴۵۳ صفحات مجلد۔ کتابت طباعت بہت اچھی - کاغذ معمولی - گرد پوش دیدہ زیب - قیمت ستارہ روپیہ بارہ آنے حالی ۔ ملنے کا پتہ : سید عبد الرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدر آباد دکن ۔

خاتمۃ الکتاب میں فاضل مصنف نے تشریح کر دی ہے کہ یہ کتاب وہی ہے جس کے " متفرق ابواب مختلف مقالوں کی شکل میں ہندوستان کے بعض علمی مجلات معارف سیاست وغیرہ میں بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ بجز چند مختصر مقالوں یا کسی مختصر رسالے کے سوا جہاں تک میں جانتا ہوں اس موضوع پر اردو ہی نہیں بلکہ عربی یا اسی قسم کی دوسری زبانوں میں بھی غالباً اب تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ہے "

فاضل مصنف علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ نے کئی کتابیں کئی مقالے تصنیف کئے ہیں۔ وہ لوگ جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ تمام مذاہب (جس میں وہ بزعم خود اسلام کو بھی شامل سمجھتے ہیں) معاش گریز رجحانات کے حامل ہیں " اور افیون کا سا اثر رکھتے ہیں چنانچہ مذہب کو صرف نجی معاملات تک محدود رہنا چاہیئے، تمدن سیاست اور معاشیات میں مذہب کو دخل دینا غلط ہے ' وغیرہ " فاضل مصنف نے ان ہی لوگوں کی اس زبردست غلطی کو دور فرمایا ہے ۔ آپ نے بیشمار آیتوں ' احادیث اور روایتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام میں تلاش معاش نہ صرف ضروری اور لابدی قرار دیا گیا ہے بلکہ اُسے خدا کی بہت بڑی عبادت تصور کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں زراعت صنعت و حرفت اور تجارت پر مختلف دلنشیں پیرایوں میں کئی دفعہ توجہ دلائی گئی ہے۔ سرمایہ کو قرآن مجید اللہ کے فضل سے تعبیر کرتا ہے " اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دولت کی محبت کو انسان کی فطرت قرار دیتا ہے لیکن قرآن

دولت کے اکتناز اور جمع کرنے کا سختی سے مخالف ہے اور ایسے لوگوں کو مستحق عذاب گردانتا ہے۔ قرآن حکیم کا اصول ہے کہ "جو انسان جتنی محنت کرتا ہے اُسے اُتنا ہی ملتا ہے"۔

بہرحال چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے اس نے انسان کی تمام خواہشات ضروریات کا موزوں اور مناسب خیال رکھا ہے۔ وہ سرمایہ داری اور دولت کی پرستش نہیں سکھاتا بلکہ اسے روحانیات اور اخلاقیات کا پابند بناتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی سرمایہ کی افراط کے باوجود زبوں حالی اور معاشی کشمکشوں اور جنگوں میں پھنسے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان قوموں نے ایک الٰہی اخلاق اور عالمگیر انسانیت کے تصور کو بھلا دیا ہے، اور اسلام اسی تصور کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہتا ہے تاکہ انسان کی نگاہیں صرف دنیاوی زیب و زینت ہی میں نہ پھنس کر رہ جائیں بلکہ ہمیشہ اپنے مقصد اولین و آخرین پر جمی رہیں۔

بہ حیثیت مجموعی کتاب کو ایک طویل مقالہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسمیں معاشی نظام کے مختلف ابواب پر ترتیب وار اور باقاعدہ بحث نہیں بلکہ ایک ہی موضوع کو ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ بحث کے دوران میں قابل مصنف نے اخلاقی نصیحتیں اور مغرب کی بے راہ روی پر نکتہ چینی بھی کی ہے، مگر یہ نکتہ چینی مولویانہ قسم کی ہے جسمیں استدلال کا اتنا زور نہیں جتنا خدا کے عذاب کی دھمکیوں کا ہے۔

(م - ا - ص)



---

**ٹیس** :- مصنفہ آزاد صحرائی۔ ناشر ادارۂ داستان۔ کاغذ معمولی، کتابت طباعت ٹھیک ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحات، قیمت دو روپیہ چار آنے

یہ مصنف کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے پہلے انجم صہبائی بی۔ اے کا تعارف اور ابراہیم جلیس بی۔ اے کا دیباچہ شامل ہے۔

تقریباً تمام افسانوں کے موضوع نام نہاد "جدید رجحانات" اور "سماجی حقیقتیں" ہیں جو آجکل کے تمام چھوٹے بڑے افسانہ نگاروں کے ہزار بار دُہرائے ہوئے اور پامال موضوع ہیں۔ اور شاید جبتک "خونین انقلاب" نہ آجائے موضوع رہیں گے۔ طرز بیان، موجودہ ادیبوں کے عام طرز بیان کی طرح نیم متفکرانہ اور نیم طنزیہ ہے۔ جدید افسانوں کی طرح پلاٹ اور کردار نگاری مفقود ہے اور اس لئے انہیں افسانے سے زیادہ مضامین سمجھنا چاہیئے جس میں افسانہ نگار خود اپنے تاثرات اور خیالات کے بہاؤ کو قلم بند کرتا چلا جاتا ہے اور ان خیالات میں کسی ربط اور تسلسل کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہتی کیونکہ ذہن میں جو خیالات اور تاثرات یکے بعد دیگرے آتے ہیں ان میں خود ربط اور تسلسل نہیں ہوتا ہے۔

ان افسانہ نما مضامین کے موضوع مزدور اور سرمایہ دار (جس کے آخر میں مزدور کھونسے کا بدلہ گھونسہ لینے کے لئے ظالم مہاجن کی طرف بڑھتا ہے) ظالم اور مظلوم کی کشمکش، پیٹ کی بھوک اور جدید قسم کی محبت (جس میں عاشق اپنی محبوبہ کو مشفقانہ انداز میں نصیحت کرتا ہے کہ یہ وقت محبت کرنے کا نہیں بلکہ ظالم سماج کے خلاف لڑنے کا ہے) ہیں۔ اور تقریباً ہر افسانے کے کردار مظلوم اور بھوکوں کے ستائے ہوئے ہیں اور کچھ اس قسم کے عزائم کا اظہار کرتے ہیں۔

" وہ چاہتا ہے کہ ان ارضی دیوتاؤں اور خداؤں ان پرماتماؤں اور منموں کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑا کر ان کا تماشا دیکھے ہنسے قہقہے لگائے اور پھر ان کی تکا بوٹی اڑادے، ریزہ ریزہ کردے اور ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی (غالباً ایورسٹ جس پر آج تک کوئی نہیں چڑھ سکا) پر لے جاکر کہیں دور نہ پھینک دے۔ ... آزاد اڑتے ہوئے پنچھی کی طرح یا پھر خیال کی طرح آزاد۔" (پتھر کی مورتیاں)

مصنف کا انداز بیان بحیثیت مجموعی دلکش ہے تشبیہوں میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اکثر جگہ کامیاب ہے مثلاً " اس کی پیشانی پر بل کئے ہوئے کھیت کے مانند کئی لکیریں ابھر آئیں"۔ بعض افسانوں مثلاً " ہوس کے دیوتا " اور " پتھر کی مورتیاں " میں خلوص اور دلی کوفت کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ اگر مصنف افسانوں میں کردار نگاری پلاٹ اور تسلسل واقعات اور خیالات کا ربط پیدا کرنے کی کوشش کرے تو ایک کامیاب افسانہ نگار بن سکتا ہے۔



افسانوں کے عنوان حسب ذیل ہیں:۔ آگ۔ وہ تصویریں۔ خون۔ پتھر کی مورتیاں۔ شہنشین سے۔ ہوس کے دیوتا۔ نالۂ دل۔ یہ انسان۔

(م۔ ا۔ ص)

---

**تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات:۔** " لجنۃ تالیف وترجمہ ونشر" قاہرہ کے رکن اور مصر کے مشہور بیرسٹر محمد عبداللہ عنان کی عربی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ مترجم نے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور عبارت کی روانی اس طرح برقرار رکھی ہے کہ اصل تحریر کا شبہ ہوتا ہے۔ اردو کو اس قسم کی گرانقدر تصانیف سے مالامال کرنے کا کام ترجمہ کی دقت اور پھر سلیس زبان اور بہتر پیرایہ میں ادا کرنے کی صلاحیت کے فقدان کے باعث وہ ترقی نہ کر سکا جس کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی۔ ایسی صورت میں ہر ایسی کوشش جو اس مقصد کی تکمیل کے لئے کی جارہی ہو یقیناً بہت زیادہ حوصلہ افزائی و ستایش کی مستحق ہے۔ پھر جب ترجمہ میں اصل کی سی خوبی موجود ہو تو اس کی دل کھول کر داد نہ

دینا سراسر ظلم ہے۔

اسلامی تاریخ کے مختلف موضوعات یقیناً آج کل کی دنیا کے لئے حیرت انگیز ہیں لیکن ان سے اسلامی تاریخ کا ہر دور مالا مال ہے۔ اسلامی سیاسیات، معاشرت اور اسلامی مشن کی وضاحت کی خاطر ان کی زیادہ سے زیادہ اور وسیع تر اشاعت ہی اسلام کی بہترین خدمت ہوسکتی ہے تاکہ موجودہ دور کے عوام ان قصہ ہائے پارینہ میں بھی مستقبل کے روشن پہلو ڈھونڈھ نکالیں۔ نفیس اکیڈیمی (عابد روڈ) نے محمد عبدالوہاب صاحب ظہوری کا یہ ترجمہ شائع کرکے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات طباعت بہتر۔ گردپوش دیدہ زیب۔

ملنے کا پتہ نفیس اکیڈیمی عابد روڈ حیدرآباد دکن
قیمت چار روپے چار آنے سکہ عثمانیہ۔
(س۔ا)

---



## تبادلۂ خبر



Dr. ABUL HASAN

Stood first in the M. B. B. S. examination, 1947; was awarded Miss Zorbanu Parekh Gold Medal for obtaining first rank in midwifery.



M. GAZIAUDDIN

Appeared first class amongst the first classes in the Intermediate and B. Sc. examinations. He obtained the first Azam Gold Medal.



MD. WAHEEDUDDIN KHAN

*B.Sc. (Junior)*

A distinguished sportsman, a good bowler and Captain of the University Cricket team (1947—48)



M. A. RAHMAN M.Sc.

Lecturer in chemistry, stood first in M.Sc. in 1946, has been awarded foreign Scholorship for advanced studies in General chemistry.

in October 1934 and devoted myself exclusively to the pursuit of Academic studies and Research.

Even after my retirement Mr. Qazi was a constant visitor, and for a number of year served as a Co-examiner in the B.A. paper on Astronomy. He valued with me the answer-books at my house until late in the night with much in convenience to himself. He would not agree to my going over to the University at Adikmet for performing this task.

As long as he was in Hyderabad he came to me without fail for Id greetings and we had hearty conversation on academic and social matters. I perceived at the time that his health was gradually being undermined. His duties multiplied and he would not think of delegating some to his colleagues. In this way he missed his opportunities of doing research. Prior to going home on the year's leave above referred to, he came to me to a farewel dinner. By that time I had many papers published in various American and other journals, mainly on Astrophysics and Meteoric Astronomy. He said he would devote himself to the same pleasant task immediately, he retired from service. But fate had destined otherwise. He carried this desire with him to his grave. He leaves widow of five boys.

May God shower His blessings, on his soul and give his wife and children the fortitude to bear this bereavement.

Mr. Qazi was a very conscientious man, highly mindful of his duties, and loyal to his institution. An excellent teacher, a faithful friend and a true Muslim.

MOHD. ABDURRAHMAN KHAN,<br>
Ex-principal<br>
(*Osmania University*)

College and was appointed member of the committee for translating Scientific and mathematical terms apart from being a fellows of the University and member of the Liquidate and of the various Boards of Studies. In this capacity I had ample opportunities of discussing academic matters with Mr. Qazi; and the Technical Terms committee meetings, with Arabic and Urdu scholars etc. as colleagues, were a veritable intellectual feast. Later when I became Principal of the Osmania University college in October 1924 I had his loyal and nearly co-operation in raising the newly developed university to a position of honour and renown in India and the academic world abroad. He was later promoted to the newly created post of Vice-Principal and relieved me of a good amount of routine college work discharging his professional duties as usual with unabated zeal and efficiency.

When I started the Research Journal he served on the Board of advisers with the other members of the professional staff. In 1927 when I represented the Osmania University at the centenary celebrations of University College, London, he acted as principal in my absence for some three months or so, and loyally carried out the policy we had adopted in the development and expansion of the University, in such a manner that in my report on my delegation, I could not help writing that on my return I found everything as precise and orderly as if I had not left Hyderabad at all.

When the principal's post was obolished and Mr. Mackenzie took over charge from me in the capacity of Pro-Vice-Chancellor I elected to retire from service

# PROF. QAZI MOHD. HUSAIN

(Obituary and reminiscences)

IT is a pretty long time since Qazi Mohd. Husain died in a Punjab hospital at a comparatively early age soon after leaving Hyderabad on a year's leave prior to retirement from service.

I know him even before his appointment first at the Osmania Translation Bureau and latter as Professor of Mathematics at the same University. His elder brother Mr. Qazi Zuhar Husain was my fellow student at the Imperial College of Science and Technology, London in 1911 to 13, and we both happened to be living as paying guests in a Turkish family at 38 Longridge Road, Earls-Court S. W.

Mr. Zuhur Husain introduced Mr. Mohd. Husain to me in 1912 when he came to England with a Government of India scholarship to read for the Mathematical Tripos, Cambridge. I found him a young scholarly man of excellent manners, responsive to friendship, modest and keen on the subject of his studies. He had a very bright career in the University of the Punjab, obtaining first class in all the examinations from Matriculation up to M. A. He had a liking for English leterature as well and was a great lover of Iqbal. He passed his Tripos examinations with credit, taking a first class in parts I and II, and joined the staff of the Osmania Board of Translation. As a translator of text books on Mathematics he did yeoman service to the University and the Urdu language in coming of technical terms. At that time I was Professor of Physics at the Nizam

The maximum speed of an ordinary plane is 550 m. p. h. but this record was broken by the jet-propelled aircraft. An English pilot flew at a speed of 640 m. p. h. in a jet-propelled aircraft. Recently this record also has been broken by an American who flew at a record speed of 662 m. p. h The speed of sound is about 760 m. p. h. It is quite possible that in future a jet-propelled plane may fly at a greater speed than sound; only if we succeed in making a fusilage enough strong to sustain the tremendous air resistance at such a high speed. For this reason many air tunnels are made in U. S. A. which provide air current at controlable speed. The air current can be had with the help of gigantic propellers which are rotated by electricity. In these tunnels it is possible to have air currents at variable speed and scientists are busy in carrying researches. These exhaustive rasearches are being made only to find out a stronger fusilage which would outstand the air resistance at the highest possible speed.

Jet-propulsion is identical to the rocket system. Hereafter the progress of rocket as well as jet propulsion will go hand in hand. The expert scientists say; it is not suggested that jet-propulsion is the last word in aviation. What today seems unconceivable, may tomorrow appear a reality. Hence a time may come in proximate future when man will be able to fly faster than sound. Who knows?

SRIPAD RAO, B. Cm.

*(Osmania)*

of fuel and air is burnt continually at the nozzle and this compressed gas is expelled directly through the jet, thus forcing the aeroplane forward.

A jet-propelled aircraft is superior to an ordinary aeroplane because the former has got much more advantages than the later one. Its superiorty is marked due to the following advantages.

It requires no high under-carriage to keep it clear off the ground. It means it diminishes the take off difficulties.

The Second advantage of jet propulsion is the elimination of the airscrew. This causes not only high speed, but also enables a plane for smooth and steady flight.

As it Again has no rotary motion of airscrew, it can be used at great heights. At great heights air is very rare and the propeller of a plane cannot rotate so fast as to create enough upward thrust for preventing the plane from stalling.

The jet-propelled plane will be able to use fuel other than petrol, tar and diesel oil can now replace the high octane spirit. The use of solid fuel is also possible.

It also provides the pilot an unrestricted field of vison.

Its efficincy is 80 per cent, that is, two and half times higher than the present type of plane. No other engine is more efficient than 40 percent except the jet propulison which is subject to the minimum loss of energy.

# JET-PROPULSION

NOWADAYS we hear a great deal about the miraculous jet-propelled aircraft. The invention of jet-propulsion is a land mark in the history of aviation. Only forty years ago Wright Brothers of America, made flight possible. During this short period, considerable progress has been made in aeronautics. Jet-propulsion has revolutionized the whole aircaft industry.

The idea of jet propultion is not a new one. According to A. M Conybeare, first jet mechanism was made by Hero of Alexandria nearly 2,000 years ago. It was used to open and close the emperors palace gates. Hero's engine consisted of two steam jets mounted on a rotating spher. Many scintists later on have made experiments with this idea. In 1941, S. Campini, an Italian scientist, suceeded in making a jet-propelled plane which flew from Milan to Rome.

The Gloster E. 28/29, was the first aeroplane in England to fly by jet propulsion with Air Commodore Whittle's engine. To understand a jet-propelled engine, some scientific knowledge is required, but its main principle is simpler than steam or diesel engine. Power for jet-propulsion is generated by air taken in compressed and then heated in a combustion chamber where paraffin or heavy oil, or even powdered coal, is burnt. This compressed gas finds only one exist and thrusts out with tremendous explosive force, generating the power which presses the air behind the aeroplain and pushes it forward. As air is not a solid substance to get a good thrust, a very fast jet is therefore needed. The mixture

Four hunired million men and women have thrown away the yoke of slavery and breathe the air of freedom. Only one man made it possible and that was Mahatma Gandhi, the Father of the Nation.

Mahatma Gaddhi is dead. He stood for an immortal cause, a cause that lights the gloony world. Long live Mahatma Gandhi.

The Editor

Gandhiji once more came forward to help his country. But the old hitch of communal representation was still there and Mr. Attlees famous declration of 1946 at last brought a ray of hope for freedom. But the Muslim League was not satisfied and a day was fixed for launching direct action. The result was a bloody chaos of murder, violence rape and arson which is perhaps unparalleded in history. It broke Gandhijs heart and we very unwillingly bowed his head to the inevitable—to the partition of India. He did it only to save the millions of suffering poor—to stop the inhuman dance of death which made brutes of men. India became independent but India was divided. The communal riots went on and only Mahatma Gandhi raised his voice above this inhuman slaughter and we all know the results brought about by his ceaseless efforts.

At last he fell, only two days ago a martyr to the cause of unity and truth. India mourns today and the whole world feels his loss.

But does it really matter? Has he not left behind him his great teachings? Has he not shown a way to the war weary world. His life was perhaps the supreme sacrifice to the great cause of unity. Mother India has taken back her weary son to her bosom. On the little platform by the banks of the Jamuna, overlooking the imperial city, his earthly body was cromated. The holy waters of the Ganges will soon wash over the whitened bones which never rested during his lifetime.

The snowy Himalayas stand unchanged; the great rivers of India flow on. The sun rises as usual in the east. They cannot change. But India has changed.

the Poona Pact was signed by all the congress and scheduled caste leaders.

In 1935 Gandhiji retired from the congress. But even in his unofficial capacity he was the most powerful man in the country. It was on his insistance that the Congress party dicided to accept office in the Government in 1935.

In spite of his crowded political life, Gandhiji never forgot the poor 'Harijans' whose cause he had espoused, and he went on working for their uplift. Temple after temple was thrown open to these depressed children of India who were the worst sufferers of all.

After 1939 events moved swiftty. In the face of the advancing Japanese aggression the congress found itself in a hopeless position. In true conscience they could not throw the country into a war which was not their own. They demanded full independance without delay. The British government under the Tory leadership refused.

We all know what followed the famous August resolution. How the premature arrest of Gandhiji and the Congress leaders resulted in unparalled violence and bloodshed.

Sir Stafford Cripps came and went back unsuccessful in 1942. It was only because Mahatma Gandhi was averse to all kinds of communal division of India.

The war ended. A Labour Government assumed control in England. Lord Linlithgow went and Lord Wavell took his place The Cabinet Mission arrived and

Lord Reading but the public was still violent and a few regrettable incidents made Gandhiji change his mind. He called off the Civil Disobedience Movement of 1920 and accepted defeat. He was arrested at Ahmednagar and after a historic trial was sentenced to six years imprisonment.

The revolution in Turkey started a new trend in Indian politics. It saw the beginning and end of the 'Khilafat' movement. Headed by C.R. Das the Congress decided to enter the Government and wreck it from inside. The Non-cooperative movement of Gandhiji had again failed. Two years later he was released from Yervada jail. There was no place for him in Indian politics. Gandhiji then took up the cause of the Harrijans and started his tour of the country. India welcomed him again as its great leader. He fasted for 21 days for the cause of unity. In 1925 he was elected the President of the Indian National Congress.

For the next four years Gandhiji refused to be drawn into the arena of politics. But again India had to seek his lead in 1930. Gandhiji was ready and he started on his famous march to Dandi to break the salt laws. He was again arrested. The Government was uneasy and Lord Irwin already depressed by the faliure of the first Round Table Conference wanted to be on better terms with the congress. The famous Gandhi-Irwin pact was the result. Gandhiji was out of jail again. He went to the second Round table conference which failed miserably.

A fight then ensued against the Communal Award of Mr. Ramsay Mac Donald. Gandhiji won again and

In the month of September in 1887, young Gandhi went to England, being an intelligent student he passed his London Matriculation and qualified for the bar.

Back again at home after years in an alien land, Gandhi found himself beleaved of his fond mother.

For a while he practised at the Bombay High Court and at Rajkot but his mind was already feeling restless. He found an outlet at last and went to Pretoria to advise Dada Abdulla and so there the youthful barrister had gone there just for an years work but he returned after twenty years. Yes, twenty long, hard years of bitter struggle aganist the rising anti Asiatic feeling of a white rule in south Africa. It was here that Gandhiji forged his mighty weapon of "satyagraha" the weapon that was to liberate a mighty nation. His success in South Africa though not very great, was enough to slow down the repressions and discriminatory measures of the South African Goverument. Gandhiji's name remains in the history of that country.

During the first world war Gandhiji returned to his native land to find Gookhale dead and Indian national politics in the hands of the fiery Tilak and Mrs. Besant. The ground here was ready for the seeds of his nonviolent philosophies which had borne fruit in Africa. Mrs, Besant and others opposed him a bit but he saw his path clearly and went forward.

Anger, frustration and discontent stirred the breast of every Indian as an aftermath of the world war. The Rowlatt act and then the detestable happening at Jalian walla Bagh fanned this hatred into flame. Gandhiji prepared his plans carefully and sent an ultimatum to

dire need is gone for over. Now only his spirit hovers over the universe, like a bright light that will always show us the right path. Bapu is dead but all that he stood for and fought for, is alive; gloriously, magnificently alive He has opened the eyes of the maddened world.

He was a true leader of the Indian people. He ruled not as a shrewd politician or a mob leader with the backing of his followers, but he ruled over the hearts of the teeming millions of this great sub-continent by love and truth and peace. He was a born fighter but his weapon was non-violence. He had matched his harmless yet infallible weapon against the demonic brutality of Europe, and had been crowned with glorious success. The freedom that India enjoys today is only due to Mahatma Gandhi. Perhaps he was born a Century before his age who knows. But this much we can say that he made a nation out of the chaos that was India, after the great revolt of 1857.

Mohandas Karamchand Gandhi was born in Porbunder, a small Kathiawar State on the 2nd October 1869. His father died when he was sixteen years old. Coming as he did from very orthodox parents, young Gandhi was from early boyhood a man of orthodox habits. When going out to play one morning with other children in the street, his mother Putlibai had commanded him not to touch those little playmates because they were untouchables That little incident had rankled in his young soul and perhaps laid the foundation of his great philosophy of equality. At the age of thirteen he was married to Kasturba who to the last day of her life remanied his true companion in all his joys and sorrows.

# MAHATMA GANDHI.

(The worlds greatest apostle of peace and non-violence)

THE explosion of the first atomic bomb at Hiroshima did not stagger the world, half so much as the news of the sudden death of Mahatma Gandhi, at the hands of a fanatic assassin on the evening of the 30th of January 1948.

Mahatma Gandhi stood for peace, for harmony, for the spiritual well being of mankind, and even after his death there should be peace.

The Mahatma is dead but he lives. He lives for ever as the light of truth to guide us on to the haven of peace. Do not think of him as one who is no more. He lives with us. His soul will never never leave the Country to strifes and communal discord.

Mahatma Gandhi has been made a martyr to the cause of peace, the cause for which Christ died on the cross and Lord Buddha gave up his life to the service of mankind.

But we are ordinary men. We cannot but mourn our greatest loss. The poor and hungry in the streets, the so-called un-touchables for whom the Mahatma fought all his life, and the rich in their mansions are all crying alike for the Father of the Nation. Hindus, Muslims, Sikhs and Christians have joined today to pay their homage to the great dead.

Never more shall we hear his beloved voice at the prayer meetings, no more will a word of care assuage our woes. The hand that used to support the nation in its

"Women shall be mans mate and peer
In all things strong and fair and good
But wearing on her brow the crown of sinless sacred
Motherhood."

When equality is claimed it cannot be only in good things. There is a world of difference between a poets, dream and reality.

Indian womanhood has suffered, and suffered terribly at the hands of the hooligans, but I am glad to say that they have weathered the storm as calmly and without murmur as Mother Earth The world should learn a lesson from them.

I have at least raised my head above the dirty waters of a hateful subject. I am hoping against hope that I have been able to explain myself. If I have failed, well, I doubt if anyone will succeed, except perhaps the hooligan himself.

Pandit Nehru suggests bombing as a remedy. I would buy or borrow two Atom bombs and drop them over maso concentrations of Hooligans. This seems to be the only solution provided that the effects of the bomb do not reach other parts of the world. The germs of hooliganism are more dangerous and contagious than the deadliest of bacilli.

Schools and Colleges owe a duty to Society to spread Knowledge and culture to root out this plague which threatens to sweep over and destroy our great country

By
A CLOSE OBSERVER OF
HOOLIGANS.

(e) Super hooligans—These are men belonging to the highest ranks of society. They take no part in practical, but theirs are the leading minds. Standing on the top of the wheel of power politics, they make crooked moves on the chess board of Indian politics. They laugh like Satan at the massacre of little children and old men. They smile to see the land going up in flames and smoke. They heartily enjoy to see Hindus and Muslims flying at the throat of each other. They are of two kinds

One is the group of the hooligan theorists. So called political leaders who instigate mass violence just to gain some minor political objective. There is no difference between Alfred Rosenberg and these men. They are beasts in human form.

(f) Hooligan capitalists—These are men who help hooligans with financial support. They pay for the Knives which are killing hundreds of innocent men in Bombay and Calcutta. They pay for the oil and petrol which burnt peaceful homes in Bengal, Bhihar and the Punab. These people deserve to be hanged but they are immune because of their money.

### Hooligans of the fair Sex:

India cannot fortunately as yet boast of this species of hooligans. But they do exist in other parts of the globe. Almost everyday we read accounts of their doings in Palestine. The constitutional history of England tells how hooligans of this gentler sex behaved when they were apsiring for the representation in the parliament,

amaged machine and drive on. Breaking the street amps is a special form of amusement to these pocket Goondas'. Most of them blossom into full-fledged ooligans of the regular type when they grow up.

Volunteer hooligans:—

These hooligans increase and diminish at regular ntervals. They upset India in 1946. This class holds n its ranks almost all types of men. Murder, loot, arson, ape are some of their achievements. They are a dark lot on Indian history.

(b) Educated hooligans -I am sorry to use the vord educated here, but I cannot help it. Some of our ducated young men are developing the tendencies of oondas. They generally start with travelling without ickets and end by landing in a jail. Many of the ducational institutes are producing this element in arger numbers. Making fun of the innocent passers by nd of their tutors and teachers is their favourite hobby.

(c) Fanatic hooligans —This class includes men of he lower middle class, men who become insane at the iame of religion though they are utterly ignorant of t. They indulge in mass violence with a demonical iatred. Abduction and forced marriages are their pecial handiworks.

(d) Amateur hooligans--Are those who are carried way by emotions. Manufacturing crude bombs and ollecting arms is their particular line of business. They are generally intelligent but reckless and as a esult of this they are mostly shot at by the police and nd their career in a jail or hospital.

(a) Cinema hooligans—You will always find them hanging around the cinemas, selling tickets at black market rates to respectable people standing at the wrong ends of mile long queues. They generally advertize their presence within the cinema hall by booing, whistling and unholy comments that would make the most seasoned actress blush. The cheapest class in the cinema is theirs by birthright.

(b) Bazar hooligans—This type of hooligans is not generally very noisy. But they are decidedly dangerous. No pocket is ever safe from them. They are a parasite, living on the fat of the shop-keepers. Nowadays they have taken to acid throwing and stabbing.

Platform hooligans also can be included in this class. Their war time hobby was ticket black marketting. Their persent occuption is murder and theft.

(c) Pocket hooligans 'child is father of the man' says a famous English poet. This honoured principle holds good even in the hooligan world. These little hooligans are everywhere in evidence. They are very much like the midget submarines and pocket battleships. Considering their size, they are very dangerous. They generally infest laues and bye-laws where they breed in thousands.

Suddenly a stone crashes through a shop window and no one knows where it came from. While taking a sharp turn on your motor bike or car a brick bat just crashes into you, but you will never be able to catch the little author of the mschief. After a hectic chase through a maze of narrow lanes, your little hooligan disappeares like the morning mist. You return to your

about microscopic size, throwing stones at people, and at electric lights.

The classification of Hooligans:—

In this age of sciconce and logic it is but natural that I too should try to introduce some analytical order into this subject. As far as my observation goes, I have been able to single out four distinct classes of hooligans and each class can be easily divided into numerous sub-classes according to their activities, behaiviour and social standing. Instead of indulging in the minute details of the sub-divisions, I shall be content only to give a broad generalization. The four classes are as follows.

I Regular hooligan ( professionals )
II Irregulars or volunteers ( Amateurs )
III Super-hooligans ( glorified professionals )
IV Hooligans of the fair sex

Regular hooligans are the back bone of the hooligan body. They form a sort of regular army, well disciplined and drilled in the various tactics of goondaism. They adorn large towns and cities. They are generally proficient stone and soda-water bottle throwers. They have raised acid throwing and stabbing to a fine art. But this class does not generally indulge in mass violence. Not because they do not like it, but because they are comparatively few and being regulars, are too well-known to the police. But they are sure to be in at the kill when big things are in progress. Hooliganism being a lifelong profession of theirs, they cannot efford to take big risks, though they relish a year or two of prison life just for a change. This class may be safely divided into the following sub-classes.

# HOOLIGANS AND HOOLIGANISM

HOLD yourself in patience, dear reader, for I am about to take a plunge into the dirty depths of a much hated; but very important subject. I am also afraid that this essay is not going to be an ornament in the putrid dust-bin of literature.

What is a Hooligan?

The word Hooligan which was formerly used to represent rowdy groups of mischievous shchool-boys, has now acquaired a very sinister meaning. The present scope of that word is very wide and consequently nebulous. In India we call a Hooligan a 'Goonda', In Bombay he is known as a 'Mowali', in Hyderabad we identify him as a 'Shohda', and so on. What a galaxy of titles to be sure!

Hooliganism:—

The field of activity of this special class of society is very vast. We have not been able to put a fence round this field. Stabbing with long Knives, throwing acids on innocent people, looting, arson, rape and a hundred other such activities are indulged in by this illustrious community. We call their activities hooliganism or goondaism This word has now achieved a prominent place in Indian politics and is very similar to the other political terms such as Nazism, Communism Fascism and Socialism. We sometimes doubt that the word 'hooliganism' may really be heir apparent to imperialism. We just wonder.

It is impossible to classify the hooligan brotherhood according to age or size. They may be tall or short; full grown or stunted. I have seen minor hooligans of

In the case of its failure the world will be left to chaos, resulting in devastating wars, which will destroy all the constructive programmes which will make the world a better place to live, in. Anyhow the failure of U N. O. will certify the saying of Bernard Shaw, that U. N. O is the declaration of love, without the promise of marriage.

All the differences and bitterness existing between Russia and U. S. A. have come to the forefront. Their growing tension forecasts a third world war, but it is the duty of the U. N. O. to restore peace and harmony and bring the varying elements in the United Nations to a common acceptable agreement.

Lastly we hope that United Nations will assert the principles of justice and fairplay and, "will bring succour to the suffering and hope to the oppressed". We must keep faith in U. N. O., according to Sir S. Radhakrishnan's point of view, "The one ray of light in this world of gloom, is the U. N. O., the great idea born of this blood-stained earth. We must see to it that the new born baby is not strangled by the cynicism of politicians."

SYED ABDUL KHADARI UNAIDI,

*B. Sc. (Final)*

earth policy, including looting, particularly of the Chinese inhabitants, were intensified between the spearheads. The Dutch decided to mop up inside the territory between their spearheads and this led to continued fighting in disregard of the 'Cease fire.'"

We do not know what the Security Council will decide on the report of the 'six-consul.' The Security Council should consider it necessary that the troops of both sides should be immediately withdrawn to the position occupied before military operations, otherwise the 'Cease fire' order cannot be carried out properly.

We hope that with the assistance of 'Three-men' Conciliation Committee', both the Indonesians and the Dutch will settle the problem.

The problem of the use of veto has become a great concern of the "Big Five" to-day. The reconsideration on the issue, has a political background behind it. M. Gromyko (Russia) has been very liberal in the use of veto, so he is called the 'Champion of veto' in some political circles. The United Nations are going to reconsider the matter, so some restrictions are to be imposed on its use.

U. N. O. is on trial to-day. If U. N. O., in handling the pressing problems, which are mentioned above, proves itself to be a place, where justice reigns supreme and not the place where the 'Big Powers' should achieve their political ends and bully small nations, then alone it can best attain its fundamental ideals and the future world will book upon it as a protector and guide.

to-day and they cannot tolerate the partition of their Holyland. What they demand is the fair play of justice.

Next in importance is the Indonesian dispute against the Dutch. The military operations in Indonesia by the Dutch is the clear negation of the U. N. O. charter. The Dutch, after the failure of the negotiations between the two governments on the issue of an interim government for Indonesia, attacked Indonesia suddenly with full preparations and with the intention of re-conquering Indonesia and to overthrow the Indonesia republic.

By adopting barbarious and inhuman methods, the Dutch have conquered a considerable part of Indonesian territory and a few important cities.

The Australian delegate presented this case before the Security Council. The Security Council ordered to 'Cease fire' in Indonesia. A "Three-men" Security Council's Conciliation Committee is appointed by the Security Council. The members of the Committee are, Australia, Belgium and America, representing Indonesia and the Netherland Government respectively.

The Six-Council' appointed by the Security Council to investigate the situation in Indonesia have submitted their preliminary report, recently, which reveals that the Cease 'fire' order has not fully been respected. The report says, "The advances by the Dutch troops between 20th July to 4th August, were in the nature of spearheads, while the main bodies of Republican troops retreated, a considerable number of their troops remains between the spearheads. The Indonesaian scorched

to go to the United Nations to justify their demands. The General Assmbly appointed a "Palestine committee" for the investigation of the situation and to recommend a solution.

This committee, which is predominantly composed of the nations that uphold the American policy, has recently made its final recommendation to the General Assembly. In the proposed partition of Palestine almost all the fertile part of the country adjoining the sea, is allotted to the jews, where as the mountainous part without sea is given to the Arabs. A 'Economic Union' is also proposed to place the Zionists in the commanding position from the economic and political stand point. Further the Committee recommends the immigration of more Jews into Palestine.

What a great injustice would it be to give all the facilities and advantages to minority in a country at the expense of the majority? These recommendations have created serious unrest in the Arab countries. The Arabs have already determined to revolt to the point of an all out *Jehad,* if the General Assembly tries to implement the proposals. The Arabs can only be satisfied with their demand of a Arab State in Palestine.

The British Government has recently announced the withdrawal of its troops from Palestine in case of the failure of U. N. O. to presenting a solution acceptable to both the Arabs and the Jews.

If U. N. O. fails to satisfy the Arabs in particular, then a war of disastrous and severe results on a world scale is inevitable, in which many Governments may be overthrown. The Arab countries have a united front

The joint resolution of France and Mexico was adopted by the Assembly. The theme of the resolution is that the General Assembly is of opinion that the treatment of Indian in South Africa "should be in conformity with international obligations, under the agreements concluded between the two governments and relevant provisions of the Charter" and the General Assembly requested the two Governments to report at the next session measures adopted to that effect.

From the statements of Dr. Malan and G. Smuts it has become clear, now, that the Union intends to torpedo the decision of the U. N. O. as the government considers it a "interference with its sovereignty." The South African government's attitude towards Indians is the clear denial of the "Fundamental rights" of U N. O. Being a signatory to the U. N. O., South Africa should not ignore decision of the U. N. O., and should establish real democracy, in which the rights of the minorities should of safeguarded. Anyhow South Africa should come out with facts and show the world virtually that she upholds the fundamental principles of the U. N. O. in action rather than in speeches. Now, when the General Assembly is holding its session, it is the duty of the United Nations to realize the seriousness of the situation and settle the problem, keeping in view the fundamental principles of the U. N. O. charter.

The other problem, that confronts U. N. O. today, and has been the matter for discussion for a long time is that of Palestine. Here the British diplomacy is in operation, owing to its hold on Palestine for over 25 years. The Arabs of Palestine, after being disappointed by the Anglo-American commission's recommendations decided

contact among nations will ensure permanent pace and by bringing various nations nearer to each other, will create mutual understanding. Thus "Unesco" is entrusted with the task of establishing a lasting peace in the world.

U.N.O. is confronted, today, with great and difficult problems, which need its immediate attention. One of these problems, is the case of India against South Africa. We cannot shut our eyes to the fact, that a great injustice is being done to 225,000 Indians in South Africa. This is not a matter, that concerns only India and South Africa but it has raised for louder murmurs of protest in other parts of the world also. Laws restricting the freedom of Indians are passed and the doors of the fundamental rights of citizenship are closed to them. Thus democracy has become a special preserve of the Europeans in South Africa.

The Indian government referred this case to the U.N.O. The success achieved at the U.N.O. is not only a triumph for the Indian cause in South Africa but also a vindication of the principle of equality of races in the eyes of the law. India's challenge to the "racial discrimination," speaks her innate sense of justice. Mrs. Vijay Lakshami Pandit in her speech at U. N. O. session last year, said "When South Africa contends that the presence of Indians in the country, constitutes a threat to the Western civilization, what is meant of course, is that it is a threat to European dominion. It is not the civilization that is threatened, but the doctrine of 'White supremacy.' Safeguarding white supremacy means, in effect, safeguarding the dominion of a particular race over all others."

To reaffirm faith in the fundamental human rights, in the dignity and worth of human person, in the equal rights of men and women and nations large and small;

To establish conditions in which justice and respect for the obligations arising from treaties and other sources of international law can be maintained,

To promote social progress and better standards of life in larger freedoms and for these ends,

To practise tolerance and live together in peace with one another as good neighbours,

To unite our strength to maintain international peace and security,

To ensure, by the acceptance of principles and institution of methods, that armed forces shall not be used, save in the common interest and,

To employ international machinery for the promotion of the economic and social advancement of all peoples,

Have resolved to combine Our efforts to accomplish These Aims"

So for as the aims and ideals are concerned, the U.N O. can best be illustrated in these words, "Peace," "Liberty" and "Fraternity."

Under the auspices of the United Nations, an organisation in the field of education, Science and culture, has been established under the name of "Unesco," whose chief aims are to establish peace and to produce cultural co-operation among nations. Cultural

## TASKS BEFORE U.N.O.

THE establishment of a world organisation marks a new era in modern history and has opened vistas of possibilities for maintaining world peace and controlling world economy. It has also fulfilled the dreams and prophecices of the inspired poets of the past. M. Smuts observes, " U.N.O has brought together a kind of Parliament of Man," where the people of all shades of opinion meet and discuss the problems of mutual interest and iternational importance.

During the last world war, the "Big Powers" declared that the war was being fought for the freedom of dependent nations and for perpetual peace, but just after the end of the war, we came to know that the declartion of the so-called "Atlantic Charter" of "Four Freedoms" was merely a deception, to throw dust in the eyes of the people and accomplish nothing. Then comes the period of general distrust and great tension among 'Big Power's on the question of the control of atomic energy. Peace of the world seems once again, to swing between life and death.

But after the failure of "Leauge of nations" for the second time in the history, of the world, a document of world importance was issued at San Francisco, on the historic date of 25th April 1945 in the name of all the peoples, saying;

> " We the people of the United Nations determined to save the succeeding generations from the scourge of war, which twice in our life-time has brought untold sorrow to mankind, and

Pakistan cannot keep out of the of world affairs currents. We will have to regard ourselves as the citizens of the world.

Our work is not over – but it is going to begin. May India and Pakistan prosper, may the democracies of both the dominions flourish. A time will surely come when this great sub-continent will lead Asia, and play its great part as a member of the U. N. O.

MARKHAND RAJ SAXENA,
*B. E. (Ist Year).*

*Engineering College*
*O U.C.*

But now as being the citizens of free dominion states, heavy responsibilities lie upon our shoulders. We have a glorious past and we cannot forget those martyrs of freedom who left no stone unturned to break the yoke of this foreign supremacy. Above all we Hindus and Muslims once the inheritors of a great and glorious culture which has developed after years of close contact, have produced great men like Kabir— a poet of Hindu Muslim unity,—a man who song of equality of human beings. Further we have the tolerant Kings of Moghul empire, like Akbar the great.

Thus, we have to hold fast in the years to come, to the principles that this great ruler taught us" We have our national poets like Iqbal and Tagore and further we feel proud when ever mention the name of Asoka the great— the King who was an enthusiastic admirer of humanity and a preacher of "Dharma".

Thus when we are free, we must make ourselves deserving of that freedom. We have to forget all our differences and think that everybody's religion is his own concern. It is sheer madness to fight with one another on behalf of religion. Though our country is divided into two dominions, yet we are all one in heart. We cannot tolerate bloodshed in any part of our country.

What is needed today is due and mature consideration. "Let the dead past be burried deep." Our greatest enemies are poverty, hunger and illiteracy. Our foremost duty is to fight against with these evils. If we are successful in this, we shall build the ideal democracies.'

The world has everything to gain by peace and we must try to establish a world government. India and

# GREETINGS TO ALL.

THE 15th August 1947. A D. has an important significance in the history of India when according to Mr. K. M. Munshi, "Freedom has come out of a voluntary act of Britain, an event unheard of in history'. Thus India's ship after facing every storm has now reached the haven of prosperity.

All of us whether Hindu or Muslim, bade a final farewel to the British Empire which had its sway over our motherland for nearly two hundred years. Thus the strongest imperialistic power surrendered as a result of the united efforts, struggles and sacrifices of all the people of this great sub-continent.'

When on the midnight of the 14th August, as the clocks struck twelve, we with great rejoicings and hopeful hearts, heard the declarations of independence by our respective leaders, and all of a sudden when the whole world was sleeping at midnights, the people of both the dominions, Hindustan and Pakistan," entered into a new era,-which brought the message of rejoicing to them and also laid heavy responsibilities upon them as being the citizens of free dominions.

Delhi, and Karachi specially were the chief centres where the whole world's attention was centered and people gathered in millions to pay their hearty congratulations and tribute full of affections to their leader who had fought for the attainment of their cherished goal of freedom.

Thought was action with him. Down he hurried to the seventh floor. The lift had failed, so he had to go down the long winding staircase. He found the dynamos and the turbines in their places quite intact. Within five minutes the Atom turbine came to life with a muffled roar. In a flash all the lamps and floodlights flared up in the observatory. It was a very strange sight indeed in the midst of that utter desolation. The flood had swallowed the whole city of ruin by then, and only the four buildings stood above the seemingly endless sheet of water. The rain had abated but the sky was dark. Occasional flaming meteors cut their blazing paths through the clouds and lightning flashed to the tune of rolling thunder The flare of the electric blue arc-lamps danced on every ripple and wavelet as if to celebrate the victory of science over the vageries of the elements. Then very suddenly a faint cheer went up from the other surviving buildings. It was a cheer of hope from the ten thousand survivors of the wrecked world. The professor stopped in his actvities for a moment and smiled. He knew that Science had survived and triumphed. He returned to the observation room. The electric heaters were all working and the room was warm and cosy. He made himself a cup of hot-tea and settled down to write. There was no trace of anxiety on his venerable face. For him the world had not changed because his beloved Science had svrvived, Science that had spanned space and almost conquered Nature. He felt that he was nearer to God and Creation. He was immensely happy.

DEB KUMAR CHATTERJI.
*B. Sc. (Osmania)*

again, slowly this time, and the professor closed the window with a sigh of releif. He knew then that it was evening, and that the Solar System still held together. The run-away planet had only brushed against the Sun and not met it in a head on crash. He took his grandson in his arms and offered his thanks to the great powers of Creation.

"Grand-pa, grand-pa where is your beard" cried little Zambuk very excitedly. The professor ran his fingers over his chin and then jumped three full feet into the air. An Atom-bomb butsting over his head could not have startled him more. The world famous Zundoppian beard had vanished. After a thorough search, the professor located its remains scattored all over the floor. With a sigh he resigned himself to the loss "It was my greatest sacrifice to the cause of science" he wrote later on his immortal book Zambuk got busy collecting the remains of his grandpa's beard by chasing it all over the place. He wanted it for his own future use.

The professor searched about in all his numerous drawers and cup-boards and got together enough food stuffs for a decent meal. After their frugal repast, little Zambuk rolled himself up in a blanket with an enormous bar of chocolate in his mouth and went to sleep. The scientist went on working till late into the night till his observatory looked almost normal again. The temperature was falling swiftly and the cold was very intense. An idea came suddenly into the professor's head "Why not have a look at my emergency turbines" he muttered aloud. "If it can be started then the heaters and most of the lights can be worked."

All this while little Zambuk had been looking on in awed silence, but now he found his tounge and began to bombard his grandfather with questions. The professor gave the boy a broken instrument to play with and stopped this flood of interrogation. He then procured a paper and pencil and began to note down his observations, seating himself on five big volumes of Astronomical science.

It was several hours now after the catastrophe. The meteors and ashes were still falling thick and fast, like torrential rain. The temperature was rising rapidly. The professor was sweeting like a soaked sponge. He wondered how much longer he could stand that heat. His pencil raced over the paper

For an hour more the ashes fell and then came a deluge of rain. Slowly, very slowly a pale grey light lit up the devastated World. The professor threw open the window and looked out. He shuddered at the desolation that he saw. All the houses of the great city lay in a contorted mass of concrete and steel in which no human being could have survived. Only four buildings stood defying the threatening elements. These were the professor's observatory, the front portion of the palace, the workshop and the great powerhouse. These had withstood the shock because, these had been constructed according to the latest atom proof design, on foundations of elecotro-steel driven half a mile deep into the living rock.

The rain fell in a solid sheet of grey water. The river was rising in floods. Soon the water was six feet deep over the shattered city. Then the darkness came

looked as if the Sun had been blown to pieces and the World was tumbling through space like a falling coconut. But a dim light came after forty eight hours. Then only did the survivors know that the Sun was hidden by a cloud of ashes. The Sun was seen again after sixty eight hours. It was a dim, orange ball and there was a huge black dent on its side.

When the great astronomer regained consciousness, he felt someone tugging at his leg. He opened his eyes thinking that ghosts and goblins were making a feast of him. Through the inky blackness someone was calling him. "Grand Pa, Grand Pa, why don't you speak". I am feeling very frightened." Each word was followed by a sharp tug at the professors leg. After a few secon is he realised that it was his grandson calling him, and not a ghost from the underworld as he had at first imagined.

" Iam,getting up boy don't be worried." he replied in a week voice. He tried to rise but something hard and heavy lay across his chest. Between them they managed to remove the thing. It was the tall observation stool.

After a few minutes the professor regained the use of his badly bruised limbs. Every inch of the observatory was familiar to him. Taking his grandson's hand he groped his way to a cup-board in the wall and produced a candle and a lighter. A light flared up and dispelled the total gloom. To the professor it looked as if the very foundations of his observatory had been shaken by a giant earthqake. Every thing except the great telescope had broken loose and lay strewn about the floor. He tried to open a window, but had to close it again as a shower of ashes began to fall into the room.

The prime-minister was uneasy. He valued his life and he had only an hour now in which to save it. He rose, abruptly, apologised and got into the space ship. The rocket soared into the sky and vanished. It was the last plane to leave.

Meanwhile Professor Zundopp stood with his eyes glued to the astronomical telescope. His indomitable grandson stood by him. The great Astromomer had declined to give up such a phenomenal observation just to save his life. He had put his grandson in a 'Nautilus' bound plane but that worthy little man had somehow slipped out and joined his Grand-Pa. Now at last moment the runaway planet showed a slight deviation in its path. The professor noted it down. "This deviation is possibly due to the negative force of the Sun" he wrote. "But is the margin wide enough for the intruding planet to miss the Sun? can the collision be avoided?

Then the collision came. The whole of space seemed to coalace into one vivid bright sheet of lightning. There was a tremendous crash, which rang through like corks on a stormy sea. The Moon was torn away from the Earth and dashed to bits against Saturn Billions of meteors shot through space in all directions. Showers of many cubic miles of ashes fell over the Earth. Half the Atlantic Oceon was sprayed into space as a great chunk of the Sun fell into it. A new continent raised its head above the seas. In a few minutes half of the world was dead, burried beneath the hot meteoric ashes. After some hours the rocking ceased. The sound of the crash grew faint as it echoed and re-echoed from the distant stars. Total darkness blotted out the Earth. It

'Nautilus'. No one knew whether he would ever reach there. No body knew anything about the condition of the un-charted space-track through which he would go. There might be burning nebulous gases, meteors, and even planets across the track.

By the morning of that fate-ful day, half the population of the Earth had left the doomed planet. Some rockets were also observed leaving Mars, but these were not many as the colonists could not afford the rich uranium needed for propelling the rockets.

By nine o-clock, that is three and a half hours before the expected collision, all the deserted poor and doomed inhabitants of the Earth stood in the streets or on the house-tops, watching through smoked glasses the invading planet. Most of the women wept and moaned and the wails from several million throats rose above the calm ether like the dying sob of the doomed planet. It was as if mother Earth was crying for her dying children. The minutes ticked by and then two solid hours. The Government was preparing to leave. The noble young King Ramon looked at the millions of weeping poor in the streets and gently shook his head.

"No Prime-minister, I cannot go" he said solemnly. "I am the King. I cannot desert my people."

A roar of applause greeted the King's words. For a minute even the weeping mob forgot its sorrows.

The king turned to the queen and said "You had better go Myra. Why should you too perish with us"

The queen smiled, "I am quite happy to be with you, and apart from that I am the queen mother."

"An un natural celestial body has made its appearance very suddenly within the Solar System. It is almost as large as the Sun and is passing at a terrific pace along an independent parabolic arc through the Solar System. It is not a comet, but a solid smouldering planet which has probably been thrown out of some distant planetary system. The passage of this celestial body is marked by a long orange tail which is the result of its shattered atoms colliding against the atoms of other. The body itself is dull red. Its spectrum gives the colours or molten uranium and several other unknown metals. It is travelling at a terrific pace towards the Sun and the two planets will collide at exactly twelve thirty five tomorrow noon. May the Infinite Powers of Creation save the Solar System from a horrible destruction"

This threw the whole civilized World into a panic that excelled even the great scare of the last Atomic War. Within a couple of hours, rocket ships could be seen leaving the Earth by the thousands all heading for the unknown void of space. Every man had but one thought, one goal, and that was to run away somewhere outside the Solar System. The famous Space Rader Surveys of the various distant stars by the late Dr Zanthus, had proved it beyond a doubt that the star 'Nautilus' was covered by a dense forest and contained living organisms Half of this star was always in darkness, while the other half was a land of perpetual sunshine. The reports were hopeful, but the distance was so great that the fastest Electron Rocket could do the journey in about four months. No Rocket had ever gone so far. But when faced by a question of life and death, every owner of a plane left for the unknown

# THE END OF THE WORLD.

LITTLE Zambuk rushed into his grandfather's study like a miniature torpedo, his large eyes round with excitement. "Grand pa Grand pa, I can see a moon in the sky. It has a long long tail. Come and have a look at it."

Professor Zundopp smiled indulgently and came down the library ladder. "What is it my, boy?" he asked. "It must be a new rocket plane that you have seen. The night is a moon-less one."

"No, no, grand pa, it was a red moon that I saw. Come and see it Grand Pa. It is wagging its tail.' Said the boy and practically dragged the venerable professor, beard, eye-glasses and all to the nearest window.

"There it is. There it is' shouted the child triumphantly, dancing round the now thoroughly excited grandfather." Look at it through my little telescope grand-dad."

Professor Zundopp looked, and then ran like a madman to his observatory. The motors controlling the multi-million power telescope hummed into life as the professor glued his eyes to the prismatic eye-piece. What the greatest astronomer of the age saw in the tailed moon of his grandson appeared in the largest of letters in all the papers of the world thus.

IS IT THE END OF THE WORLD?

A DEADLY PLANET APPEAR IN THE SKY!!!

Professor Zundopp says it may collide with the Sun.!!!

les in the air, but soon they come down like a house of cards. Happiness in this world is like the white Bird which seldom a-lights. Human life is full of vicissitudes, but the objects of Nature are eternal. I looked at the sea. It flowed towards invisible horizons: thus it flowed yesterday before we set eyes on it; thus it had flowed a thousand years ago, bringing quietude in its restless surge. But alas! what about human life? It is unstable and transitory.

The sky was dark and cloudy. From time to time lightnings tore across the limitless expanse of space. I felt depressed, sad, and even felt a little like crying. The night was growing colder and the air sang a moaning song. The buzzing of the insects began to sound like a sad music. Left alone in the somnobent rushing stillness, I shuddered with an unknown fear. A wave of melancholy swept over me and I made head long rush towards my house. The distant street lamp shimmered a rainbow coloured circle which seemed as if mokeing over the tragic lot of mankind.

HUNMAN SINGH,
*M. A. (Previous) Arts.*

heavy cloud still permeated with sunset, hung purple on the harizon. The tall palm trees rose with their feathery gracefulness, to be silhouetted against the sapphire of the sea, and the turquoise of the sky. I wanted to take out my cigarette case, but quite unintentionally, I brought out that diary. I opened it and was astounded to read the name of Dr. Harischundra upon it. It was the same Harischundra, the famous eye-specialist of Calcutta who had cured my eye-disease. I began to read the diary. He has written a short history of his early life. There was a brief description of his fame and popularity. But the last part of the diary was very sad He had written that suddenly he began to suffer from an eye-disease. He went to Vienna for adequate treatment. He spent money profusely and the expert eye specialists of Italy did their best, but his eyes could not be cured. Day by day he lost his eye-sight and finally became totally blind. He returned to Calcutta and dedicated his whole property to a missionary hospital for the treatment of the poor. He then left Calcutta as a blind beggar and as a pauper. After three years of wandering, he reached Bilaspur. Here his diary concluded To a stranger the diary was incomplete, but to me it was the whole tragic life-sketch of a young doctor.

As I finished reading tears welled down from my eyes. I ruminated over the great favour which the blind beggar had done me when he was a young doctor. I thought for the first time over the irony of fate. The young doctor commenced his career so gloriously, but how it had come to such an end. Really Hardy is right when he says that men's destinies are controlled by unseen power. Man is powerless and impotent before the wheel of fate. We, after triflying success, begin to build cast-

thoughts, I was disturbed by the voice of a young beggar. He implored charity. As soon as I saw the young beggar, my blood boiled with anger. It was because I thought beggary as a blot upon the fair name of a civilized country. In my opinion only the invalid deserve the help of the government, but these young people who had adopted beggary as a lucrative profession should be punished. I called my peon and ordered him to drive the beggar out of my compound. The peon did as he was bid. No sooner was the beggar pushed out of the gate than I heard a crashing sound. I rushed towards the gate and found the beggar lying under the front axle of the heavy Daimler car of Mr Peterfield. People rushed to the spot and the bleeding body of the beggar was dragged out. As I neared him I found him writhing in severe pain. He succumbed before any medical aid could be given. The inspector of police wrote a note on the accident and gave the decision that the accident happened due to the mistake of the deceased beggar. He was on the wrong side and intentionally rushed on the car. He handed me a diary as the only property of the beggar. I felt a little sorrow at the tragic end of the beggar.

Mr. Peterfield compelled me to accompany him to the club, but I rushed home pretending I was not well. When he left me I felt my heart heavy. I thought that due to my rudness the poor beggar had met his death. I was in a depressed mood and in order to get rid of this mental dejection, I set out for a walk. Within ten minutes I reached the sea-shore. A balmy breeze was blowing. The sun hung low on the harizon and its tired rays embraced the waves with wild ecstasy. A

## THE BLIND BEGGAR.

MY joy knew no bounds when I saw my own name among the nominated candidates for I. C S. From that very day, I set my whole heart on preparation for the competitive examination After fifteen days of toil suddenly I began to feel a sort of pain in my eyes. I took a little rest, but the pain became intolerable. My eye sight grew weak and every thing appeared to me nebulous and hazy. I went to a famous eye specialist of the metropolis. His name was Harischandra. He minutely examined my eyes and said that the disease could be cured in four weeks. As I was a poor student, the young doctor grew sympathetic towards me and agreed prepared to give me free treatment. I underwent his treatment for nearly a month and was completely releived from the eye trouble When I was discharged from his hospital, I thanked him from the bottom of my heart and tears of gratitude rolled down my cheeks.

Three years later I was the Additional Magistrate at Bilaspur. One evening, I was sitting in the front balcony of my house. I was waiting for John Peterfield, the then Collector of Bilaspur and one of my friends during the I C S. training in England. In order to avoid the monotony of waiting, I was reading '*Judge* the *Obscure*, one of Hardy's novels. Though I regarded Hardy as the greated English novelist, yet I did not like his pessimistic out-look on life. I thought life a game or an adventure, which should be played with full enthusiasm and cheerfulness. While I was lost in these

## LEAVE THIS FIDDLING

Wearied is this world with fiddling
And the rhythmic riddling, the riddling,
Of the singer and the song.

For the juggling 'modern' rhymer
Can produce no song of the cuckoo,
Or the lilt of the nightingale
On far off deserts of Arabia.

He, the votary of the Muses;
He, the Homer of all nations;
He, the Hafiz of all ages
Must be nourished in the lap of nature.
Echoing to the winds and oceans
Secrets of universal truth and love:
Towering on a hill by himself
Singing songs of peace and love
Playing on strings of sympathy:
The poet singer is harmony itself
Rise, O poet! rise and sing it,
Sing and ring it, ring the bell
Of ethereal music: of loving hands
And eager hearts of bristling hair
And throbbing pulses of all the youth of all
the nations.

SYED NEHAL AHMED RAZVI,
*B. A. (Final).*

"I shut my self in with my soul
And the shapes come eddying forth".

Yes it is a great pleasure to smoke occasionally, shut up in closed rooms blowing the rings of smoke and enjoying the houris dancing with heavenly music in their wings; Satan coming on Earth all tumbling down, and Adam and Eve settling down in Paradise on the very day of creation.......

All this I see, inspired by the hanging balloons of smoke in the air. It is in some way a self-intoxication. It is a taste of old wine, it is a drop of *amrit* to me. And one day I shall surely emulate Thomas de Quincey by producing fantastic and true confessions... ... ...Then, only then, I shall fulfil my only desire to immortalise the leading smokers of our day. Hail Churchill, hail! You are the only aristocrat who smokes with a marked individuality. If you are not remembered by coming generations for your heroic achievements, you will certainly be recalled as the greatest smoker of the modern age!

And you friends, who call it a sheer madness, are of course shut out of these luxurious smoky gardens. It is a companion for the friendless and a bubbling source for fancy and imagination, a world of wakeful dreams.

The smokers do not commit a crime, nor do they harm society. They smoke for themselves, and to plunge in the oases of blissful throughts, away from tears and sufferings of this maddening world so.

"Let the wing'd Fancy roam
...Pleasure never is at home".

YOUSUF AHMED,
*M. A. (Previous).*

chisel, still in my world of wakeful dreams I excel the classical painters and sculptors.

O, see, just see where I have reached! Leaving the corporeal body my spirit flies towards the ruins of the great empires, cities and temples........Here lies Rome, the "City of the soul" and "mother of dead empires," once a seat of art and learning, but now echoing with the ghostly voices from the broken arches and the ruined palaces. The glory is now decayed, the pomp lies buried in the dust.

"Come and see
The cypress, hear the owl, and plod your way
O'er steps of broken thrones and temples——"

but hush......do not shout here. Listen to the sombre anthems, sung by the spirits of tho ancient past........And see, see the Egyptian Deity which drags my imagination towards the roaring waves of the Nile, and I follow swiftly on the wings of the Westwind........So this is Egypt. Mysterions Egypt, flooded so many times by the wild Nile, and breathed love, luxury and passion in Cleopatra's reign, and now, now, all her crowning laurels have been snatched and are mixed unto dust The tearful murmurs of the mummies fill the air and the Mysterious Pyramids again lament and shed eternal tears for the ancient grandeur.......And here my fancy hangs in the fragrant gardens of Babylon. Along with me Semiramis of the Assyrian Empire of Nineveh enters the legendary stage of history, and my mind, like Dante's in his dream, sees her in agony of the eternal torture of Hell, crying for mercy at every lash of the whip..........Thus all in contemplation, all wrapped in smoky sheets.

Believe me; while I smoke, just a flash out of nothingness occurs to my mind and I catch in a moment some deepest thoughts from Iqbal and Ghalib which I tried so often but failed to understand—and sometimes the beautiful couplets of Omar Khayam come to my memory and I recite them with an enchanting melody. In the wreaths of smoke I imagine Venus standing, all nude, all in marble beauty surrounded by Zephyrs on wings breathing flower scented breezes. I struggle to paint to my imgination the classical pose more exquisitely than Botticelli Again my mind apprehends and switches on to the immortal paintings of "The Toilet of Venus" and "Venus and Adonis" and I, under the strong impulse and queer intuition, wish in vain to capture the masterly touches on canvas with more dexterity than Boucher and Rubens. Let me admit frankly that I never understood what really the portrait of Mona Lisa meant and how foolishly I scorned Leonarda da Vinci who painted an ordinary type of woman, and mocked at the world that praised it as a climax of the artistically creative painting. But one night, all absorbed in deep thoughts with the sparkling tip of my Wills's, I suddenly caught the glimpse of the intuition as if Leonard himself inspired me and whispered in my ears the secrets of the enigmatical beauty of Mona Lisa, an incarnation of womanhood.

In the ringlets of the smoke, in the lonely hours I sometimes carve in marble the ideal beauty of Venus and the mischief of Cupid, the frowns of Mars and the smiles of Minerva, the ecstasy of a divine dancer and the voluptuousness of Cleopatra. I never handled a brush or

we would have lost a great blessing! ...... So, I apologise on behalf of the "innocent" smokers who are very often criticised so indignantly. Johnson's definition of a smoker......was merely out of ignorance of the pleasures of smoking. If he had had any taste of smoking along with his circle of friends at the coffee-house, he would not have passed such an irresponsible verdict!

Lo, there stands Lane with a marked dignity, the first English smoker, and see there comes Sir Walter Raleigh, a distinguished smoker who took his pipe of tobacco even a little before he went to the scaffold. Do we not owe a debt of great honour to this explorer, writer and the first favourite of Queen Elizabeth?

Thus my mind is always haunted by memories of the great men to whom goes the credit of introducing smoking, and whose footprints we follow. And unconsciously I idolise them in my heart and take a cigarette out of my Wills's packet, put it in between my lips and light it in the most fashionable style. What a joy! What an ecstasy! No sooner do I inhale the smoke and blow out the fragrant incense, than the curtain of the hidden world of mystery and imagination lifts. Methinks I am after the quest of a new heaven and a new earth.

It is absurd to discuss the economics of its consumption, the ethics of its pleasures and the dangers of its effects, but how delightful it is to show my mind to you which is turned into a rendezvous of delights and an imaginary web of fantasies.

I particulary prefer to smoke in darkness when the lighted tip of the cigarette sparkles as a diamond!

## APOLOGY FOR SMOKERS

"Of pleasures, those which occur most rarely give the most delight" Epictetus

CIGARETTES, I like sometimes, but never wished to keep them always in my pocket. How strange it is that the American ancient tribal custom of smoking has been adopted as a pleasure merely out of curiosity — first a fashion in Europe, then a habit, then a necessity. The year 1558 might be rightly called auspicious for the whole world, when Francisco Fernandes brought the tobacco plant to Europe, and flattered the Medici by presenting it to him. He might have been rewarded with honours and titles by a grateful prince; but our gratitude to Fernandes who introduced smoking in the old world and thus unfolded a new world to indulge in—is, perhaps, greater and more permanent!

Smoking in a lonely hour, I ponder on how the heroes of the world achieved greatness; I sometimes attribute it to tobacco. It was rightly hailed and designated as *Sana Sancta Indorum* due to its miraculous healing powers. Spenser truly called it "Divine tobacco," and William Lilly raised it to the heights of "our holy herb nicotine." How often I imagine the first Mexican tobacco plant, imported to Europe, flourishing day by day. If Columbus had not seen the native smoking; if Philip II of Spain had not sent the courageous Fernandes to investigate the products of Mexico; if the Queen had rejected the present; and lastly, if the "patrons" had not set smoking in fashion—then, indeed,

Who, bent on their eternal quest,
Will make this world a paradise
And men divine, before they rest.

The circumstances demand the Celestial Sankaracharya who would declare with bold emphasis *Braham Satyam jagat Mithya*, and focus the attention of men on values of things eternal, thus turning them away from the ephemeral objects. Peace will be a mirage otherwise. Man's control has extended on objects external, his innerself-*the nafs-i-immara,* far from being conquered, is swelling into unprecedented dimensions being fed by his indulgences. Discrimination between the self and the non-self seems to be absolutely absent. Let us develop *Vivek Gyana* and *Vichar*. Educational institutes should set apart an hour for thinking on the Self. Unless we develop self-control, the achievements of science will betray us and we shall destroy ourselves. Let us conquer the dark forces of evil that are destroying us every moment and where we should be humble, make us proud and arrogant. The dreams of our Saviours, of Krishna of Buddha, of Mohammed the Prophet, of Christ, Zoraster and Confucius cannot be accomplished otherwise. Our political leaders would have lived in vain if they do not succeed, at this juncture, in bringing peace to a war-shattered World.

"Om, Shanti, Shanti, Shantihi".

DWARKANATH KAPUR,
L. L. B. (PREVIOUS)

bluff will be called very soon. The Security Council is seeking to implement the 'cease fire' order and it is to be hoped that very soon another independent State will be established in the East.

The pan-American treaties and the Marshall Plan of aid to Europe are group organisations by the foes of Russia. The Canberra conference is a similar affair. The Empire countries herein conspire to pledge themselves against foreign-Russian aggression. The Jap treaty and the Korean affair will be settled after some rancourous exchanges. The Soviet Union is alleged by America to have misused her place on the allied control council in Japan to further her own ideology. Russia describes the U. S offer of aid to Europe as a means to establish an economic imperialism. The United States aimed, the *Pravda* said, at securing control of the German Ruhr.

In marked contrast to these underhand and selfish pursuits of the members of the U. N. O., one can point to the various organisations that have been set up under the auspices of the U.N.O, that are pursuing beneficent activities—the F. A. O, the U. N. E. S. C O. etc. Everywhere, it has been well said, the world is organising itself and as it does so, the activities all focus in the United Nations. The faith of the future is in co-operation, in accomodation to fellowmen and in toleration. 'Live and let live' should be the motto of the world in order that violence may be eradicated Perhaps the atom bomb may intimidate the human race to set its house in order. For this, I feel there exists the necessity of a seminary of supermen,-

51 of U. N. O. charter, U. S. A will resort to direct action.

Argentina and Australia have placed the whole issue of the Veto on the General Assembly's. agenda and they are likely to win considerable support from the smaller nations. The problem is confusing since, under the charter any attempt to alter the Veto right can only be successful if it is ratified by two thirds of the total U. N. O membership, including all the Big Five, thus making the Veto issue itself subject to the Veto.

The Palestine question was referred by Britain to the U. N. O. in February 1947 There seems to be no means of bridging the gulf between the two races which inhabit the land. The recommendation by the majority report to divide Palestine has appeased the Jews and kindled fire in Arab hearts. The decision of the General Assembly is anxiously awaited.

The membership issue is linked up with the Veto issue. There is a complete deadlock in the Security Council. Russia has vetoed the entry of five Nations: Eire, Portugal Transjordan Italy and Austria. Britain, China and U S. have black-balled five—Mongolia, Albania, Bulgaria, Rumania and Hungary.

The Egyptian dispute with Britain centres on certain alleged treaty rights. The Egyptians demand that Britain should quit their homeland. Britain insists on her rights under the treaty. Her intention is to secure for herself a foothold to attack Russia when the time comes. Such baseless demands will be refuted.

The U.N.O. is handling the Indonesian problem with a certain alacrity which is because of India's keen interest in her neighbours' welfare. The Netherlands

S. W. Africa and a host of other organisational issues Even on matters on which Big power differences are not so acute the U. N. O. has not shown itself to advantage. Field Marshal Smuts, who is credited with authorship of the preamble to the charter, has, ironically enough, announced his decision to defy its mandate both as regards the future of S.W. Africa and the position of Indians in the Union. It is rightly said that "If a small power like the Union is to be allowed to ignore with impunity decisions reached at the international council table, what hope is there of the U N.O's ever intervening effectively to right a wrong perpetrated by a big State". This year's meeting of the General Assembly, faced with a series of frustrations in the Security Council is considered by many to have the last chance of restoring the prestige of the U. N. O. in the eyes of a disillusioned world opinion. The United Nations are described as being 'at the cross-roads'.

Every attempt by the Security Council to bring some order out of the chaos on Greece's northern borders has been shattered by implacable Soviet vetoes. While the General Assembly has no power to take direct action in the Balkans, the United States intends to obtain from 55 nations moral support for strong direct measures to assist Greece against what the majority of the council members considers is aggression by Yugoslavia, Bulgaria and Albania. In the most forthright and hard hitting' speech yet heard in the Security Council, the usually mild-mannered U S.A.' delegate Mr. Herschell Johnson bluntly accused the communists every where of being responsible for the great trouble He said, "We no longer have to appease the threat of Veto and the time has come to record our honest opinions.' Under Article

against the rights of free natioins is part of the international picture, we must be prepared for whatever this may finally mean to us. The General said he did not want to be understood as seeing global war as an immediate threat. General Charles de Gaulle declared that the 'iron whip' of the Soviet regime was isolating two-thirds of Europe into an enormous bloc of peoples and resources and developing 'a heavy threat to France" He desires, perhaps, at the hest of U. S. A. to organise Europe around a Solid France'.

The world seems split up and peace a dream. It is most essential to glance at the world as it is today before forming any opinion as to its future. Apparently there is fear of another conflict but on closer thinking we shall begin to think otherwise. The unsettled state of world affairs, is, as I said before, all the more uncertain because people have faith in the U. N. O and therefore desire to get their problems tackled by that Organization.

It is a picture of light and shade that has been painted by Mr. Trygve Lie in the second annual report of the working of the United Nations. The General Secretary expresses freely his disappointment at the failure of the Big Powers to draft the main Peace Treaties which, he rightly claims, are a prerequisite of a reconstructed world order. The annual report points out that the aftermath of the war could no longer be considered the cause of the many economic problems that the world faces today. They "arise, in a large measure from a basic political situation which underlines and affects all international, political, economic and social activity". The other cotlicting issues are the power of Veto, the Balkans, the control of atomic energy, Egypt, Indonesia,

should make use of it against S. Africa also, **which offers an *excellect opportunity for the demonstration of its* efficacy.**

Instruments are to be used where there are conflicts already. All the nations of the world should, in the name of humanity, pledge themselves to remain non-violent even in the gravest crises—therein alone lies the future hope of humanity. The question is how to prevent conflicts -surely by eliminating the causes of conflicts! But, what are these causes? Let us analyse the present state of affairs that seems or is at least supposed to be threatening the world with another global war, more destructive than ever before.

The world today is a paradox. It is in a state of war throughout and it is also functioning in its various organisations, as if peace was already there. There is war in Indonesia, Indo-China, Burma, India, Palestine, China, Greece, S. Africa and Egypt. The world's economic position is worse than it ever was after any war. England, France and Germany are in a state of economic collapse Russia and America are diametrically opposed to each other and threaten to involve the world in another war. General Eisenhover recently declared that the world is already in two great camps and he has warned the U S. A. to be prepared for a possible trial of strength with Russia. He said, "We must face the hard fact that during the two years since hostilities ended, the co-operative spirit has lost ground". The world is now grouped on one side around dictatorships which subject the individual to absolute control, and on the other democracy which provides him with a free and unlimited horizon. As long as deliberate aggression

imperishable foundation of enduring world peace. Scrutinising the causes of war and trying to eliminate their recurrence, would, of course, go a long way. Apart from economic causes, it is argued that might is right— what a challenge to civilisation that man should still be regarded a brute! No, it is not so Where formerly it used to be demonstrated that individuals could be unselfish, self-denying and sacrificing, it is being demonstrated today that nations have also acquired similar good qualities. The grand, self abnegating gesture of Britain to India, Burma and Ceylon, of France to Indo-China and of America to the Phillipines, goes to demonstrate that mighty nations have become scrupulous enough to respect the rights of smaller nations and colonial peoples.

Mahatma Gandhi's experiment with Ahimsa or Non-Violence is the only substitute for war. Nations should of their own accord, negotiate to disarm themselves. Mankind has yet to learn to settle disputes by peaceful negotiations or if necessary by a non violent struggle. Of course this system of "fighting" has yet to be developed. It is just born and India is there as an equal among equals in the comity of nations to nourish and strengthen this new-born babe. In fact we are sceptical about the success of the Instrument of Non-Violence in the world. We half believe in its ability to stand in good stead in this barbarous world because our civilisation is just an affair of external pomp. Our hearts and minds are as yet raw, uncivilised and even barbarous. But then, there is faith, a strong and healthy faith strengthened by the presence in the world of the author of this instrument. He has achieved success in India by Non-Violence and is strongly of the opinion that we

with the passage of every second, every tissue of our being is changing, in other words, when life is dynamic, the world and the universe is also dynamic. We may strive till eternity and may never reach a point when we shall be able to say, we have nothing else to do on earth. Can we, in our effort to establish world peace, ever reach a point when we shall be able to rest assured that our task is done? Yes! Individuals may perish in their task, but, Humanity will have to confront daily new problems. If civilisation is to survive, mere division of the globe into undisputed national soverignties, will not put an end to war and destruction, as is being thought today. The Jews by establishing a Zionist homeland in Palestine, the Hindus and Muslims by establishing their individual states of India and Pakistan, the Indonesians by succeeding merely in their object of securing an Independent Republic and similarly other suppressed nations by becoming free, wouldnot, however, succeed in establishing perpetual peace in the world. In fact, as, ill luck would have it, the free and most prosperous nations of the world alone were the cause of the last two world wars And if today, there is any suspicion of another camouflage and unstability in the world order, the suspects are Russia and the U. S. A. Indeed, it would be a tragedy unprecedented if the world were to be set ablaze by another Global war. The monuments of civilisation would be beyond resurrection and the terror would sink the world into barbarism once again

How then, are we to save ourselves from the scourge and deadly sin of war? What can be the fundamental principle on which we can lay the sure and

# THE PROBLEMS OF WORLD PEACE.

THE world today seems as full of strife as it ever was in the most chaotic times. Everywhere there is dissatisfaction and threat of war. There are heard from all sides, deafening roars, and heart-rending cries of demands for rights, promises and unfulfilled pledges. The air is heavy with them, but, Mother Earth patiently broods over them. The weeping and the gnashing of teeth, this time, is not in vain. It is an appeal to resurgent humanity to put matters right and as good luck would have it, humanity now seems to be in right earnest to overcome all obstacles. It seems prepared to put down wrongs and to promote the right. It has pledged itself to stake its all for perfect justice to all. The way in which the Big Powers express their opinion, unreservedly, truly and honestly, on matters in which they hold conflicting views, is an indication of this sincere desire to settle their differences. The many discords that seem to perturb us should not make us think that the world is plunging headlong towards a third world war. I believe it is, in fact, a clear sign of the faith inspired by the U. N. O. in the hearts of nations, that there is such a thing as justice that there is a tumult around us. It is a healthly sign of man's resurgent faith in himself to solve his problems justly and amicably. It augurs well for the future peace of the world.

Differences, there are bound to exist. We do not want a stereo-typed humanity. Variety is the spice of life. We do not want the peace of the Desert either. When

value for the simple reason they are antiquated and out of tune with modern times. To stand still is unhealthy and provokes contempt. To hunt for change lends freshness of glory to life. Mummies can be preserved but alas! they are without life. So it is with everything that lives beyond its time. Death is the obvious road that leads to life.

NEELKANT KALYANJI,
*B. Sc. (Final.)*

# LIFE.

IT is an old adage that familiarity breeds contempt. Everyone of us is familiar with life and yet very few realise the fundamental meaning of the term 'LIFE'. How few of us really live! Most of us confuse life with existence; others confuse it with movement.

To learn the meaning of life, let us go to Nature, which is ever full of it. Take the freshness of the water of the river. It is lucid and clear due to the everchanging waters. Without change, life is insipid. Every minute the river is different from what it was the minute before. Change is the essence of life. Without change life is unattractive and monotonous But change of what? Not the spirit but the form. The river continues in the fashion; lends its charms because of its everchanging form to conform to the level of the ground. It 'lives' by sacrificing the non-essentials.

Change is the core of life. The Soul is immortal but form is mortal. Our human bodies are changing every second; and once in seven years we change completely. As with man so with the institution. Institutions are but forms to express the spirit. To be alive, they must ever be changing with the times. Hoary age is not a sign of wisdom; else mountains will be wiser than we. Tradition has no wisdom if it is in contravention of the obvious facts of life. Old-fashioned books lose their

The only serious difficulty in the systemic use of penicillin is the fact that it is rapidly excreted in the urine, so that large quantities have to be administered if an antibacterial level is to be maintained in the blood for more than short periods.

A time will surely come when the scientists of today will discover more and more anti-bacterial agents. These micro-organisms, though small in size, take thousands of lives every year.

We are highly indebted to the efforts of Dr. A. Fleming who, by the discovery of penicillin, has opened a field for further investigations upon the basis of the methods used in this research.

K. RAJ SUKSENA,
*B.Sc. (Osmania).*

penicillin. Before this, many lives were lost due to the sudden and speedy inflammation of the membrane that envelopes the brain and spiral cord. But now by a constant course of penicillin the particular species of bacteria "Neisseria Gonorrhœa" can easily be destroyed. Thus the physicians also are getting satisfactory results in the wounds involving the brain and brain abcess (in this case the pus collects around the brain tissues and bacteria by multiplication destroy the living cells, causing poisonous effects).

It is also effective in the infections of the respiratory system and also of throat infections and "acute tonsilitis" = (inflammation of the tonsils, small almond-shaped masses situated in the folds of membrane that form pillar-like structure on either side of the arched passage between the mouth and the pharynx).

Penicillin is also preferable to and more effective than sulphamide and at times it is effective when sulphamide is ineffective. In short, penicillin is a good anti-bacterial agent. It is specially remarkable for its lack of toxicity. Slight irritations occur due to the intra-muscular injections but we can alleviate this discomfort by applying an ice-bag at the site of injection. Gonorrhœa, a venereal disease is now being cured by penicillin. One short course or seldom, more than two short courses from 1,000,00 to 2,000,00 Oxford units of penicillin have been quite effective in curing the complaint. But it is still ineffective in the treatment of syphilis which is a contagious venereal disease due to the infection by a form called "spirochæta pallida". So are the results where the treatment of T.B. is concerned.

tioned investigators in 1941. In the same year Dawson and his colleagues of Columbia University (U. S. A.) too were successful in producing a complete report on the isolation of Penicillin. The next report was that of Heilman, and Herrell in December 1941.

The final reports in medical literature were published in 1942-1943 by Herrell and his colleagues

Dr. Fleming's early experiments were upon rats. First he injected pathogenic bacteria in their body, later he injected penicillin. The rats were free from the disease.

Now he had to experiment it upon man. So the first experiment was made upon a policeman who had blood-poisoning. An intramuscular injection of Penicillin was given to him. For the time being his condition was rather good but later on he expired. But experiments were carried on and it was known that Penicillin:

(i) Can be injected into the body and can exhibit good anti-bacterial action and can produce antitoxic bodies which kill bacteria and also prevent them from multiplying.

Penicillin is specially more effective in Pneumonia, Meningitis, Gonorrhœa etc. It has its large application as the best anti-bacterial agent for the cure of various diseases such as infections of the blood stream and heart. Further miraculous results have been obtained in connection with the infections of the central nervous system.

Meningitis, the disease of the central nervous system can now easily be cured by giving a constant course of

ance present in the broth in which the mould had grown, was named as "Penicillin."

*Penicillium notatum is* a mould which belongs to the class Fungi where reproduction or propagation takes place by means of *conidia*,

FIG.

THE MOULD "PENICILLIUM NOTATUM," AS SEEN UNDER THE MISCROSCOPE.

which are like spores of other Fungi and are attached at the apex of each conidiophore. This fungus grows abundantly on the decaying substances and also on the wet-bread which is kept for a few days in any corner of the house.

It is an interesting thing to note that penicillin in liquid form is obtained from such a cheap mould. After this, Fleming performed different experiments in the selective anti-bacterial action of penicillin. He was, for the time being unsuccessful in separating the substance in fairly purified form. Later on, the isolation of it was made first in the year 1940, by H. W. Florey of Oxford University and his colleagues. And the first report about its clinical uses was published by the above men-

the past two decades a number of anti-bacterial agents have been identified which have been introduced in the serum-therapy.

The most important of these are Tyrothricin formerly known as "Gramicidin" and "Penicillin", which were discovered with their complete clinical applications in the year 1946.

The discovery, the development and the clinical uses of penicillin are due to the efforts of Dr. Alexander Fleming, M. B. B. S., F. R. C. S., F. R S., of St. Mary's Hospital, London, in 1929.

Penicillin can be said to be a chance discovery. Dr. A. Fleming, Professor of Bacteriology used to prepare "bacterial-cultures." It was here during his experiments upon bacterial culture, that he observed that a particular mould (which too belongs to the class of Fungi,) destroyed the whole culture of Staphylococci, a particular species of bacteria which are responsible for the disease of Osteomyelitis, ("a disease in which the inflammation of the bone-marrow and bone surrounding it occurs. The disease is attended by fever, severe pain, tenderness and swelling in the affected region".) Boils, carbuncles etc. Alexander Fleming preserved the plate which was destroyed by this mould.

It was a historic occasion in the world of medicine when Dr. Fleming thought that this mould could be used as an anti-bacterial agent. Now the problem was how to separate this mould in a purified form. Anyhow Dr. Fleming preserved the mould and cultivated it.

It was later known to him that this mould belongs to the genus "penicillium" and the anti-bacterial subst-

# "PENICILLIN"

THE discovery of penicillin is a miracle in the field of modern medical science and when compared with the devastating atomic bomb which threatens to extinguish humanity, Penicillin is a heaven-sent boon. The use of penicillin is becoming more and more common in combating various diseases like Pneumonia, Meningitis and Gonorrhœa.

These diseases are induced by bacterial action Bacteria are minute microscopic organisms which cannot be seen with the naked eye. These are unicellular plant organisms, belonging to the class of "Fungi" known as the "Schizomycetes" or the "Fission Fungi". These microbes are devoid of chlorophy or the green matter of the plants.

The physiology of these "germs" is rather complex. They get energy by "Chemosynthes is" whichis a sort of chemical reaction, in which complex organic substances are broken up into simple ones.

When the bacteria attack the human system, poisonous "toxins" are liberated in the body and get mixed with the blood.

The long history of the development of bacteriological science has resulted in the discoveries of anti-toxic vaccines and modern serum-therapy depends on this fact.

Men like *Pasteur* and *Joubert* spent their lives in their laboratories studying anti-bacterial agents. During

In this connection I cannot forget Allama Hazrat Maher-ul-Qadri. He is a poet, essayist. story-writer, novelist, dramatist, film critic and God knows whatelse. In truth he is the General Merchant of Urdu Literature. He should change this policy of being a General Merchant and become wholesale dealer of poetry,—for he is a born poet and his talents can express themselves best in verse, not in prose.

Lastly, I should say that men of genius should always be in advance of their age, not only of their own age, but of every age; every possible future should be behind them.

There still remains a host of writers of the modern Urdu school. Madhusudan, Balwant Sing, Qudija Mastur, Hajira Masroor, Prithvinath Sarma, Sher Mohammed Akhtar, Mukhtar Siddiqi and many others.

SYED MASOOD BAHRI,
*III year (Arts)*

Krishen Chander is a striking figure in the History of progressive Literature. When you read his works, it is as if you are climbing a high mountain in merry company, to see the sunrise. At times you are enveloped in mist—the morning wind sweeps by you—you hear the far off muttering thunders. Wide before you spreads the landscape—fiel, meadow, town and winding river. The ringing of distant bells reaches you; then arises the sweet and manifold fragrance of flowers—up comes the glorious sun—and all in a delirious dream of soul and sense—when suddenly at your elbow, your wife laughs aloud and offers you love. As in real life, so in his writings—the serious and the comic—the sublime and the grotesque, the pathetic and ludicrous are mingled together. He is sententious, energetic, simple, then again, obscure and diffuse. At times glad, beautiful images, airy forms move by you-graceful, harmonious; at times the glaring, wild fancies high and low, go sweeping down the dusty pages Unfortunately he has little power over language. Urdu, I think, is not his mother-tongue, so often it seems that while writing, when the flow of thoughts is rapid his pen stops, at that moment he becomes direct and this completes his sense. Anyhow he has a deep insight, so, imagination and observation go side by side.

Much has been written on Ismath Choghatai. She is a well-known story-writer. She writes only on sex giving birth to Lihaf, Jal and many other such stories. She wants that her stories should be drowned in the dark sea of oblivion. She is a comet among the shining stars of Urdu literature, causing disaster to literature. She is a bird of Bad Omen.

playfulness are most prominent characteristics of his figures and illustrations which are scattered every where with a reckless prodigality ; multitudinous like the blossoms of early summer and as fragrant as beautiful. He is difficult to understand,—intricate, strange.—drawing his illustrations from every corner of life, science, art and nature. In a true account, he is Urdu literature's Hoffman. If he tries to make a slight change in his style and policy so as. stories like "Kali Shilwar," "Boo" and "Phaha" may not come again to life, it would be better for him and for literature. If this is marked by him, his stories would be soon classics. If this is not done, this much licence should be granted to him in view of his ability, mastery over language and his extra- ordinary genius.

Nature's error in the 20th Century produced Ibrahim Jalis in the Deccan. Deccan is a press-ridden and not priest-ridden country—Priests of literature, the critics. They never allow anybody to succeed and shine due to jealousy. Jalis writes on behalf of clerks—the backbone of the administration. He can rightly be called the best of the modern school of Urdu writers. At present his motto—"Better an outlaw, than not free,"—is not affectation in him; it is Ibrahim Jalis. The figures and ornaments of his style are wild, fantastic and often startling. All he does, is done with a kind of serious playfulness, He is a sea-monster, disporting himself on the broad ocean; his very sport is earnest; there is something majestic and serious about him. In everything there is strength, a rough good nature, all sunshine over head and underneath the heavy moaning of the sea. Well may he be called Ibrahim Jalis, the only one".

The character of Nadeem Qasmi is too marked to be misunderstood. Its prominent traits are tenderness and manliness--qualities which are seldom found united in so high a degree as in him. Over all he sees, over all he writes, are spread the sunbeams of a cheerful spirit- the light of inexhaustible human love. Every sound of human joy, and of human sorrow, finds a deep resounding echo in his bosom. In every man he loves his humanity only, not his superiority. The avowed object of all his literary labours is to raise the standard of life of the poor and of the peasants among whom he moves freely. I never read a page of his writings without hearing his voice and seeing his form before me. In this revolutionary age, he tries to warm our human sympathies, which have now grown cold. And not less boundless is his love for nature—for this outward beautiful world. He embraces it all in his arms.

Minto is a bird of different colour. He is a gentleman only in a midnight society. He has his sharp nails hidden as a tiger which comes out only in presence of foes. The spirit of love in him is not weakness but strength. It is united in him with great manliness. The sword of his spirit has been forged and beaten by poverty. Its temper has been tried by a more than thirty years war. It is not broken and blunted, but rather strengthened and sharpened by the blows it gave and received. And possessing this noble spirit of humanity, endurance and self-denial, he has made literature his profession, as if he has been divinely commissioned to write. He seems to have cared for nothing else, to have thought of nothing else, than living quietly and making books. He looks on life's face and marks its deformities. His wild imagination and

unfavourable influence and plays havoc on the moral character.

## Progressive Writers :—

It is worth a student's while to observe calmly how tobacco. wine and midnight society are doing their evil work on the delicate physique of some of our writers and no less thoroughly upon their delicate minds. He who drinks beer, thinks beer ; he who moves in midnight societies, thinks midnight societies, they are men of rare intellect. They are endowed with humour, wit and imagination. But the fire of their genius is not burning peacefully and with a steady flame. It is glaring with irregular flame; for the branches that they are feeding it with, are not the branches from the Tree of Life, but from another tree from Paradise. They are wet with unhealthy dews of night, and more unhealthy wine. Thus amid smoke and ashes, the fire burns fitfully and goes out with a glare, leaving the beholder blind. The lives and writings of such men interest us in a high degree. Sometimes we may learn more from a man's errors than from his virtues. Moreover from the common sympathies of our nature; souls that are struggling and suffering are dearer to us. Willingly we recognise our brotherhood with them. Scars upon their foreheads do not so deform them that they cease to interest. They are always signs of struggle; though, alas! too often likewise, of defeat. From the lives of such men only we learn that mere pleasant sensation is not happiness; that sensual pleasures are to be drunk sparingly, and, as it were, from the palm of hand; and that these who bow down upon their knees to drink of those bright streams that water life, are not chosen of God either to overthrow or to overcome.

the representations spoken of, might excercise a very favourable influence upon an enlightened mind, at the same time a very unfavourable influence upon an unenlightened and superstitious one. And the reason is obvious. An enlightened mind beholds all things in their just proportion, and receives from them the true impressions they are calculated to convey. It is not hood-winked-it is not shut up in a gloomy prison till it thinks the walls of its dungeon the limits of the universe, and the reach of its own chain, the outer verge of all intelligence, but it walks abroad; the sunshine and the air pour in to enlighten and expand it; the various works of nature are its ministering angels; the glad recipient of light and wisdom, it develops new powers and acquires increased capacities, and thus rendering itself less subject to error, assumes a nearer similitude to the Eternal mind. But not so the case with the dark and superstitious mind. It is filled with its own antique and mouldy furniture. The straggling sunbeam from without streams through the stained window, and as it enters it assumes the colcurs of painted glass, while the half extinguished fire within, now smouldering in its ashes and now sending forth a quivering flame, casts fantastic shadows through the chambers of the soul—such is the contrast between a free and a superstitious mind. Upon the latter, which has little power over its ideas; to generalise them, to place them in proper light and position, to reason upon, to judge them in detail and thus to arrive at just conclusions; but on the contrary, receives every crude and inadequate impression as it first represents itself and treasures it up as an ultimate fact,—upon such a mind, the representation of life in its naked forms exercises an

# OUR PEN-SKATERS

*( Bird's eye view of the Modern School of Urdu Writers )*

IT is far from my intention to utter any sweeping denunciation against progressive literature though it cannot equal the highest conceptions of the great classics of all time. Yet, whenever the hand of a master is visible-when the characters almost move before you, and the words start into life on the pages-the effect on an enlightened mind will generally be to quicken its sensibilities by carrying the thoughts beyond the representations of bodily suffering, to the contemplation of the intenser mental agony. The impressions produced, however, will not be the same in all minds; they will necessarily vary according to the prevailing temper and complexion of the mind which receives them. As there is no sound where there is no ear to receive the impulses and vibrations of the air, so there is no moral impression-no voice of instruction from all the works of nature, and all the imitations of art, unless there be, within the soul of the reader himself a capacity for hearing the voice and receiving the moral impulse. The cause exists eternally and universally, but the effect is produced only when and where the cause has room to act andjust in proportion as it has room to act. Hence the various moral impressions and the several degrees of the same moral impression which an essay or a story may produce in different minds. These impressions will vary- in kind and in degree according to the acuteness and the cultivation of the moral sense. And thus



AMIT KUMAR CHATTERJEE

*M.A. (Previous).*

Ex-Librarian Student's Union, Editor English Section.

# BAPU

We were stunned and perplexed to hear the news of the sudden death of Mahatma Gandhi, the most towering personality of the twentieth century. In this hour of trial, the death of Bapu, is an irreparable loss to us. In him the Hindus and Muslims lost a great Friend, the U. N. O. a great supporter, and humanity one of its greatest spiritual leaders. In Lord Mountbatten's words his death is not only a natinal disaster but also an internatinal tragedy. All of us irrespective of religion or creed, express our deep sorrow and horror at the deed that brought to an end so noble a life,

Physically Bapu has departed from us, but his spirit can never die. His ideal of non-violence, his profound faith in truth and his philosophy of love are eternal. They are like a beacon fire which will guide humanity on the right path through the prevailing gloom of power-politics and conflicts of ideologies. The life and death of Gandhiji remind us, above the noise of machines and confusion of the age, that a pure spirit, without armies or machainsed power, is mighty enough to found a great nation and to give people all over the world, in the hour of his heroic death, a sense of brotherhood that knows no race or religion. His spirit has joined the universal sainthood of ages.

*The Editor.*

The sudden and untimely death of Dr. Abdul Haq is an irrepairable loss to the Osmania University. In him we have lost an accomplished scholar, a versatile genius and a man of indefatigable energy. Always a champion of the student's interests, he endeared himself to them as few have done. As a professor, member of the senate, and as Provost of the Arts college, he rendered invaluable services to the University. We convey our heartfelt sympathy to the members of his family and pray that his soul may rest in peace.

Lastly we will be failing in our duty if we do not thank sincerely Professor Doraiswami, Head of the English Department, who in spite of heavy work, is always eager to help the students in their literary activities. If it were not for his help and co-operation, we would have met with little success in our literary pursuits. We also thank from the bottom of our hearts the contributors to this issue. In conclusion, let us remind the lady students that their non-cooperation is dis-appointing. We do not intend here to probe into the mystery of their hostility. Be it modesty or pride, be it the result of some psychological antipathy, we sincerely hope that the pages of our magazine will in future be proud to publish their literary and scientific works.

Wishing all health, happiness, and success in th curerent year, we now draw to a close.

AMIT KUMAR CHATTERJEE

*B. A. (Osmania)*

It would not be out of place to mention here some problems concerning the students. Nowadays the life of the University students has become dull and irregular. It is deplorable that lack of unity and able guidance has made us inert. It is difficult to differenciate between the junior and senior students. The junior students do not respect the seniors, nor do the senior students have any brotherly love for the juniors. By expressing such ideas it is not my intention to criticise anybody. It is futile to criticise one another when all of us are to be equally blamed. These defects have crept in among us only because our Union has ceased to exist. We have no common platform from where we may plead our cause, we rarely meet together to exchange our views on our difficulties; there are no opportunities of stengthening our unity. Due to the unholy intrigues of a few, the fresh election of our Union is in the state of uncertainty. It is, therefore, our first and foremost task to forget our mutual differences and ask the authorities for the immediate holding of the cabinet election. We all know well that there is strength in union and co-operation. The present circumstances have put before us the choice between a world of co-operation and an atmosphere of uncoordinated opportunism, strife and confusion. If we succeed in reviving our Union, we shall be able to strengthen our own cause. Our predecessors have left no stone unturned to make the Union a success. It is our common heritage embodying honourable traditions and we all must try to conduct its activities with the same efficiency and enthusiasm as our predecessors.

threaten our country. If the writer happens to be a student of politics, for him there are many interesting political problems that directly or indirectly attract our attention. The scope for the history student is also unlimited. Is not our country rich beyond all measure in memorials of the past? Could he not recall the grandeur of the Moghul Emperors by throwing light on the Taj? Is it not possible for him to reveal India's great past by writing articles on the pointings of Ajanta? Is he a poet? Then let him take a walk all over the fourteen hundred acres of open University area. Let him take solitary walks in the moonlit night. Does not the superb building of the Arts College and the stately hostels plead silently to our aesthetic sense? Let him at first behold the inspiring environment of our Alma Mater and then write down his feelings.

We cannot proceed further without saying something about the articles published in this issue. Penicillin is a miraculous discovery in the world of medical science; and considering its multifarious uses, every educated person is expected to know something about it. It is a valuable cotribution to our magazine. "The End of The World" possesses all the charecteristics of a good short story. In the problem of World Peace, a systematic sketch of the present day power-politics has been given. By the time the article is printed, many changes will have taken place, yet the article analyses some of the fundamental causes of the prevailing global unrest. The poems "Leave the Fiddling" and "Desire and Greed" are quite good and will be read with interset by lovers of the young Muse. "Liberty at Last" and "Greetings to All" fully represent the feelings of every Indian heart irrespective of creed or religion.

implicitly in progress Peace and prosperity and these we shall have.

It is our opinion that the University magazine should solely be the property of the students. It should represent only the students who have taken shelter under the wings of our Alma Mater. It is often whispered that the standard of the Osmania Magazine is inferior to many of the other literary journals, but before raising such objections, one should bear in mind that our magazine does not publish writings of seasoned and professional writers. On the other hand, it provides a field of practice for the students whose juvenilia are put into print. Most of the articles may be insignificant to some of the readers, but to us they are of great value, for they are the product of the students' efforts. If today we fail to write like veteran writers, tomorrow it is quite possible for us to shine on the horizon of literature as full-fledged authors. Some students do show a promise of future brilliance and we wish them every success in their future efforts. The magazine will stand or fall by the efforts of the students, who alone can make it a success.

We wish that a better selection of subjects might be made by the various contributors. Abstract essays on philosophical or literary subjects do not appeal to us; we get enough of them from the philosopher as well as the lecturers in our class rooms. Most of our brothers seem to be very fond of writing romantic short stories, but in these hard days when the entire world is on the threshold of a great revolution, nobody will find anything useful in romance. Why should be then any hesitation in the choice of a theme? If the writer is a student of economics he can easily write on any of the innumerable grave economic problems that

# Editorial

THIS issue of the Osmania Magazine has a special significance because it is being published at a time when 400 millon inhabitants of this sub-continent have been freed from the foreign yoke. The British, being forced by circumstances, have laid down the "White man's burden" which was getting rather too heavy for them. With the lapse of the British supremacy two mighty dominions have come into existence. There may be stray clouds across but still the rising moon, on the horizon is a thing of beauty; there may be clouds of division hiding the fulness, still the independence of this sub-continent is a thing of pride. The 15th of August is a land-mark in the limitless expanse of time. It saw the freedom of a great and ancient land, it also holds out a promise of peace for the East. We all are sure that the two dominions will weather every storm and steer a noble future.

Brighter perhaps than all these is the glorious future of our state. Against the turbulent back ground of communal strifes, barbarism and mass evacuation in the Dominions, Hyderabad remains calm and unaffected. Hindus, Muslims, Christians and Sikhs live in peace and amity like one happy family. It is a reflection of the great attributer of our ruler and his people.

The road of progress lies before us. It is a long and a tiring road, but we have begun the march and we will end it with our colours flying. Independent Hyderabad will play an inportant role in the future of young India. We believe

## Contents

# THE OSMANIA MAGAZINE

Vol. XX 1948 No. 1 & 2



ANNUAL SUBSCRIPTION.

| | | |
|---|---|---|
| 1. | Present students, Osmania University ... | Rs. 4 |
| 2. | Old Boys, Members of the Teaching Staff | ,, 5 |
| 3. | General Subscribers .... ... | ,, 6 |
| 4. | Single Copy .... .... .... | ,, 2 |

*Can be had of:*

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

*Osmania University*

Hyderabad-Deccan

THE

# Osmania Magazine

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

## The Osmania University,

HYDERABAD-DECCAN.

*Managing Editor & Editor Urdu Section*

MOHAMMED MUSLEHUDDIN SIDDIQI
M.A. (Final).

*Editor English Section:*

A. K. Chatterjee M. A. (Previous)

*Asst. Editor English Section:*

M. IFTIQAR AHMED SIDDIQI, B Sc., (Final)

Vol. XX No. 1 & 2

# Osmania

# MAGAZINE

*MANAGING EDITOR,*

**M. Muslehuddin Siddiqi. M. A. (Final).**

*Editor,*

K. Chatterjee,

*M. A.*

*Joint Editor,*

M. Iftiqar Ahmed Siddiqi,

*Bsc. (Final).*